جنسیاتی مطالعے

علی عباس جلالپوری

فہرست

پیش لفظ

ایک مستقل شعبۂ علم کی حیثیت سے جنسیات[1] کی تدوین ۱۹ویں صدی میں عمل میں آئی تھی لیکن اس کے اصول و مبادی کا کھوج قدیم تمدنوں میں بھی ملتا ہے۔ فراعینِ مصر کے مقبروں کی کھدائی سے ایسی تحریریں دستیاب ہوئی ہیں جنہیں آج کل کی زبان میں فحش کا نام دیا جاتا ہے اور جو عالمِ عقبیٰ میں فراعین کا جی بہلانے کے لئے اُن کی ممیوں کے ساتھ دفن کی جاتی تھیں چینیوں، یونانیوں، رومیوں، ہندیوں اور عربوں نے جنسی موضوعات پر مستقل کتابیں تالیف کیں اور اِس علم کے بارے میں ایسے ایسے انکشافات کئے کہ بعض پہلوؤں سے آج بھی اُن پر چنداں اضافہ نہیں کیا جا سکا۔ اِس ضمن میں افلاطون کے ایک شاگرد میر لقلیدیز یونانی کی کتاب جنسی حظ[2]، اووِڈ کی "فنِ عشقبازی" اور جوینال، مارشل اور ہورِیس کی نظمیں قابلِ ذکر ہیں۔ اووِڈ قیصر آگسٹس سیزر کے عہد کا مشہور شاعر تھا جس کا معاشقہ قیصر کی نواسی جولیا سے ہوا اور راز فاش ہونے پر دونوں کو جلاوطن کر دیا گیا۔ فنِ عشقبازی' اووِڈ کے ذاتی مشاہدات اور واردات کا آئینہ ہے۔ وہ نسوانی فطرت کا بہت بڑا مبصّر ہے۔ اُس نے مزاحیہ پیرائے میں عورتوں کو ورغلانے کے گُر بتائے ہیں اور دوسری طرف عورتوں کو ہدایات دی ہیں کہ وہ کِس طرح اپنے عشّاق پر قابو پا سکتی ہیں۔ اووِڈ، جوینال اور ہورِیس کی نظموں میں معاصر رومی معاشرے کی جنسی زندگی کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں اور جنسیات کے بارے میں رموز و نکات ملتے ہیں۔ افلاطون کے مکالمے 'سمپوزیم' اور 'فیدو' میں اور سیفو کی نظموں میں ہم جنسی عشق کا ذکر والہانہ شیفتگی سے کیا گیا ہے جس سے معلوم

---

[1] SEXOLOGY

[2] جنسی حظ کے مسلک کو یونانی زبان میں HEDONE کہتے تھے۔ اخلاقیات میں HEDONISM کا مکتب اِس سے یادگار ہے۔

ہوتا ہے کہ ہم جنسیت قدیم یونانی معاشرے کا تعلیمی ادارہ بن گئی تھی۔ قدیم چینی ادبیات میں دو کتابیں 'سنہرا کنول' اور 'چینگ پنگ می' قابلِ ذکر ہیں۔ 'سنہرا کنول' میں تاؤ مت کے پیرووں کے لئے اعادۂ شباب اور جنسی حظ کے حصول کے طریقے درج کیے گئے ہیں اور جنسی ترغیبات سے بحث کی گئی ہے۔ 'چینگ پنگ می' میں ایک شخص سیمسی من کی عشقیہ مہمات بیان کی گئی ہیں۔
ہندوستان میں وتسیاین کی کتاب "کام شاستر" مستند مانی گئی ہے۔ واتسیاین کا اصل نام ملی ناگا تھا۔ وہ سنیاس کی حالت میں بنارس میں مقیم تھا جب اس نے یہ کتاب لکھی تھی۔ اس کا زمانہ پہلی اور چوتھی صدی بعد از مسیح کے درمیان کا بتایا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں لنگ شیو دیوتا کی اور یونی شکتی دیوی کی علامتیں ہیں۔ وہ لنگ یونی کے اتصال کو پرش پرکرتی کے وصال کے مماثل خیال کرتے ہیں جس سے یہ کائنات بنی تھی۔ ان کے ہاں مقاربت کی از خود رفتگی اور تکتی علتی جلتی کیفیات ہیں۔ وتسیاین نے 'کام شاستر' میں اس خیال کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس نے عورت کی قسموں، مقاربت کے آسنوں اور جنسی کجرویوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ 'کام شاستر' کا ترجمہ مغرب کی بڑی بڑی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ 'کلوکا شاستر' (کوک شاستر)، دمودر گپت کی 'ننٹنی متم'[1] اور کلیان مل کی "اننگ رنگ" میں (لغوی معنی ہے بے رنگ (کام دیو) کے رنگ) جو لاڈا خاں لودھی کی فرمائش پر لکھی گئی تھی 'کام شاستر' ہی سے اخذ و استفادہ کیا گیا ہے۔ دتا کا نے پاٹلی پتر کی کسبیوں کی فرمائش پر ایک رسالہ لکھا تھا جو دست بُرد زمانہ کا شکار ہو گیا۔ اس کے اقتباسات البتہ کہیں کہیں ملتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں ملک راج آنند نے اپنی کتاب 'کام کلا' میں قدمائے ہند کے جنسی نظریات کو جدید انداز میں پیش کیا ہے۔
عربی زبان میں جاحظ کی کتاب "العرس والعرائس"، الثعلبی کی "کتاب الباہ"، ابن حاجب النعمان کی "کتاب الفتیان"، جلال الدین سیوطی کی کتاب "الالنیاح فی علم النکاح"، الف لیلہ و لیلہ اور شیخ نفزاوی کی "الروضتہ العاطر فی نزھتہ الخاطر" میں جنسی مباحث ملتے

---

[1] رچرڈ برٹن نے اسے "کٹنی متم" لکھا ہے۔ میرا جی نے اس کا خوبصورت ترجمہ کیا ہے۔

ہیں۔ شیخ نفزاوی تیونس کا رہنے والا تھا۔ یہ کتاب اُس نے ۱۰ ویں صدی میں ایک وزیر کی فرمائش پر لکھی تھی۔ رچرڈ برٹن نے روضۃ العاطر کا نہایت دلآویز ترجمہ انگریزی میں کیا اور اِس پر سیر حاصل حواشی لکھے۔ بعد میں اِس کے ترجمے دنیا بھر کی زبانوں میں شائع ہوئے۔ جدید دَور کے عُلمائے جِنسیات ہیویلاک ایلس اور کِنسے نے بھی اِس سے استفادہ کیا ہے اور اپنی کتابوں میں جابجا اس سے اقتباسات دیئے ہیں۔ شیخ نفزاوی نے مرد عورت کی جِنسی موافقت، رجولیّت، ملاعبت اور آسنوں کے بارے میں شرح و بسط سے بحث کی ہے اور اپنے مطالب کی وضاحت کے لئے جابجا دلچسپ کہانیاں بھی لکھی ہیں البتہ اِن میں کہیں کہیں مبالغہ بے جا سے بھی کام لیا ہے۔ شیخ نفزاوی مقاربت کو محض بچے پیدا کرنے کا وسیلہ ہی نہیں سمجھتا بلکہ اِسے صحت مند تفریح کا ذریعہ بھی مانتا ہے۔ رچرڈ برٹن نے "الف لیلہ ولیلہ" کا معرکہ آراء ترجمہ انگریزی میں کیا اور اِس پر بیش قیمت حواشی لکھے۔ اِس ترجمے کا تتمہ[1] نہایت معلومات افزا ہے۔ اِس میں ہم جِنسیّت کا اختصاصی مطالعہ کیا گیا ہے۔ جِنسیات میں بین التہذیبی[2] مطالعے کی اولیت بلاشبہ رچرڈ برٹن کو حاصل ہے۔

قدماء جِنسی ملاپ کو ایک فطری عمل سمجھتے تھے اور اِس سے بلا تکلّف حظ اندوز ہوتے تھے۔ عیسائیوں نے جِنسی ملاپ کے ساتھ جرم و گناہ کے جو مریضانہ احساسات وابستہ کئے ہندیوں، یونانیوں، عربوں اور چینیوں میں اُن کا نام و نشان نہیں ملتا۔ کلیسیائے روم کے آباء کلیمنٹ، آگسٹائن وغیرہ نے یہ کہہ کر کہ آدم اور حوّا کو مقاربت کے جُرم میں جنّت سے نکالا گیا تھا اور اُن کا یہ جُرم ہر بچے کو ورثے میں ملتا ہے، جنس کے ساتھ ازلی گناہ اور فحاشی کے تصوّرات وابستہ کر دیئے جو مرورِ زمانہ سے عیسائی اقوام کے ذہن و قلب میں اُلجھنیں بن کر راسخ ہو گئے۔ یہیں سے اہل مغرب کی عورت دشمنی کا آغاز بھی ہوا اور عورت کو شیطان کا آلۂ کار کہہ کر اُسے مردودِ ازلی قرار دیا گیا چنانچہ تاریک صدیوں میں ہزاروں عورتوں کو اِس الزام میں

---

[1] TERMINAL ESSAY [2] CROSS CULTURAL

آگ میں جھونک دیا گیا کہ وہ جادوگرنیاں ہیں اور شیطان کے پاس خلوت میں جاتی ہیں نشاۃ الثانیہ کے دوران میں یونانی اور رومی علوم و فنون کے ساتھ قدماء کے طرز حیات اور اخلاقی قدروں کا احیاء بھی ہوا اور شاعروں، فن کاروں اور تمثیل نگاروں نے کھل کر حسن و عشق کی ترجمانی کا حق ادا کیا۔ بوکاچیو اور شہزادی مارگریٹ کی کہانیوں، پٹرارکا کے سانیٹوں، ولاں کی نظموں، بے بیلے کے قصوں، چاسر کی شاعری، شیکسپیئر اور مولیئر کی تمثیلوں، ڈاونچی، مائیکل انجلو اور رافیل کی تصویروں میں نئے جمالیاتی احساس کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اٹھارویں صدی کو یورپ میں جنسی بے راہ روی کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ یہ بے راہ روی اُس ردِّعمل کی انتہائی صورت تھی جو ازمنۂ وسطیٰ اور تحریکِ اصلاحِ کلیسا کی رہبانیت کے خلاف ہوا تھا۔ دساد کے ناولوں "جسٹن" اور "جولیت" اور کلیوی لینڈ کے قصے "فینی ہل" میں اِس دور کی جنسی زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اُنیسویں صدی میں وکٹوریہ کے عہد کی اخلاقی بندشیں عائد کردی گئیں لیکن یہ محض دکھاوا تھا۔ ظاہری پاکبازی اور شائستگی کے پردے میں جنسی بے راہ روی کا بازار بدستور گرم رہا جیسا کہ "میری مخفی زندگی" کے گمنام مصنف نے پوست کندہ بیان کیا ہے۔ اسی زمانے میں فحش نگاری کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ادب میں یہ روایت بڑی حد تک اُنیسویں صدی سے یادگار ہے۔ اسی صدی میں سائنس کی ایجادات کے طفیل صنعتی انقلاب برپا ہوا اور اہلِ مغرب نے ایشیا، افریقہ اور امریکہ کے بیشتر ممالک پر جارحانہ تاخت کر کے اُنہیں اپنی مصنوعات کی کھپت کے لیے وسیع منڈیوں میں بدل دیا۔ سامراج کے دوش بدوش عصمت فروشی کے کاروبار کو بھی وسعت ہوئی۔ ایشیا، افریقہ اور امریکہ کے شہروں میں بڑے بڑے قحبہ خانے کھولے گئے جہاں ہزاروں سفید فام کسبیوں کو بھی دوسری مصنوعات اور اجناس کی طرح برآمد کیا گیا اور سفید غلامی منظم تجارت کی صورت اختیار کر گئی۔ فی زمانہ سنگاپور، ہانگ کانگ اور بیروت سفید غلامی کے بڑے مرکز ہیں۔

سائنس کی ترقی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ علم الانسان، عمرانیات، حیاتیات، نفسیات اور

طب میں حیرت انگیز انکشافات کیے گئے جن کے نتیجے میں علم جنسیات کو بھی وسعت ہوئی۔ علم الانسان اور تاریخ تمدن کی تحقیقات نے عصمت فروشی، بلوغت اور شادی کی رسوم اور ہم جنسیت کے مسائل پر نئے انداز میں روشنی ڈالی۔ مارگن، رابرٹسن سمتھ، ٹائلر، فریزر وغیرہ نے سوچ کی نئی راہیں دکھائیں۔ رابرٹ بریفالٹ، ایڈورڈ ولیسٹر مارک اور رچرڈ لیون سومن نے بیش قیمت معلومات بہم پہنچائیں۔ اُن کی کتابوں کے مطالعے سے مفہوم ہوتا ہے کہ مختلف اقوام میں بلوغت اور شادی کی رسوم کیا تھیں اور جغرافیائی، معاشی اور تمدنی تقاضوں کے تحت جنسی معمولات کس طرح مختلف اقوام میں مختلف صورتیں اختیار کرتے رہے نیز اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ اوائل تمدن میں صدیوں تک مادری نظام معاشرہ قائم رہا جس میں بکارت کو غیر ضروری بلکہ مذموم سمجھا جاتا تھا۔ لنگ اور یونی کو بار آوری اور زرخیزی کے علامتی مظاہر سمجھ کر اُن کی پوجا بڑے ذوق و شوق سے کی جاتی تھی، عورت کو مرد پر سیادت حاصل تھی اور املاک کی وارث عورت ہی تھی زرعی انقلاب کے بعد صورتِ حالات بدل گئی اور عورت مرد کی ذاتی املاک بن کر رہ گئی۔ چنانچہ ضابطۂ حموارابی اور عہد نامۂ قدیم کے احکامِ عشرہ میں بیل گائے، بھیڑ بکری کی طرح عورت کو بھی مرد کی ذاتی املاک میں شمار کیا گیا ہے۔ زرعی معاشرے میں بکارت کو عورت کی سب سے بڑی خوبی قرار دیا گیا کیونکہ مرد اپنی املاک اپنے ہی صلبی فرزندوں کو ورثے میں چھوڑنا چاہتا تھا۔ عمرانیات کے طلبہ نے تاریخی شواہد سے ثابت کیا کہ عصمت فروشی کو ابتدائے تمدن میں ایک مقدس مذہبی لوازے کی حیثیت دی گئی تھی، بعد میں اسے عام کاروبار کی صورت میں منظم کیا گیا۔ ہرشس فیلڈ، پولی ایڈلر، فرینڈ ہوبزیک وغیرہ نے عصمت فروشی کے موضوع پر عضویاتی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے قلم اٹھایا اور جنسیات کی دُنیا میں یہ نزاع شروع ہوئی کہ کوئی عورت خلقی اور عضویاتی لحاظ سے کسبی ہوتی ہے یا ماحول اور سماج کے غلط اثرات اُس کی گمراہی کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ بحث آج بھی جاری ہے۔ کارل ہائنرخ الرخس نے یہ سوال اٹھایا کہ ہم جنسیت ایک خلقی میلان ہے جسے کجروی سے تعبیر کرنا تعصب بے جا ہے اور جو لوگ خلقی طور پر ہم جنسی ہوں انہیں

مردود و نابکار کہنا قرینِ انصاف نہیں ہے نفسیات اور جنسیات کے عالم میں دوسری بڑی نزاع ہے۔ جنسی نفسیات میں فرائڈ، ہیولاک ایلس، ہرش فیلڈ، کرافٹ ایبنگ، ڈاکٹر مال، سیزر لومبروسو اور پاولو مانٹاگیزا نے اہم انکشافات کئے اور ایذا کوشی، ایذا پسندی، نفسیاتِ طفلی، جنسی ترغیب، اوائلِ شباب کے آشوب، نرگسیت، خود لذتی، شادی وغیرہ کے موضوعات پر خیال افروز بحثیں کی ہیں۔ ہمارے زمانے میں جج لینڈسے اور برٹرنڈ رسل نے ماقبل نکاح کے جنسی تعلق کے حق میں دلائل دیئے ہیں اور کہا ہے کہ نکاح سے پہلے دلہا اور دلہن سال دو سال کے لئے آزمائشی طور پر میاں بیوی بن کے رہیں تو ان کی شادی زیادہ خوشگوار ثابت ہوگی۔ یہ نظریہ اس عظیم جنسی انقلاب کی پیش قیاسی کرتا ہے جو امریکہ اور یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔ صنعتی انقلاب کے شیوع کے ساتھ ساتھ جہاں زرعی معاشرے کے معاشی، سیاسی اور تہذیبی نصب العین بدلتے جا رہے ہیں وہاں اس کے جنسی اخلاق کی پرانی قدریں بھی دم توڑ رہی ہیں۔ نئے دور میں عصمت و عفت اور نسوانی حیا کے معروف روایتی تصورات بھی بہت کچھ بدل گئے ہیں۔ میری سٹوپس، پروست، جیمز جائس، برٹرنڈ رسل، ڈی ایچ لارنس، ہنری ملر، سارتر، سیمون دلوا، ماسٹرز جانسن وغیرہ کے خیالات کی اشاعت کے ساتھ مغرب میں نئے نئے جنسی رویے صورت پذیر ہو رہے ہیں اور قدیم بت پرست اقوام کی جنسی روایات کا احیاء عمل میں آ رہا ہے۔ ہماری صدی معاشی، سیاسی، عمرانی اور جنسی پہلوؤں سے عبوری دور کی حیثیت رکھتی ہے کیوں کہ اس میں زرعی معاشرے کی پرانی اور صنعتی معاشرے کی نئی قدروں کے مابین شدید کشمکش جاری ہے۔ آنے والی صدیاں ہی بتا سکیں گی کہ نئے معاشرے میں کس نوع کا جنسی طرزِ عمل صورت پذیر ہوگا البتہ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ زرعی معاشرے کی اخلاق اور جنسی قدریں جدید صنعتی معاشرے میں اپنی موجودہ شکل و صورت میں باقی و برقرار نہیں رہ سکیں گی۔ ان تبدیلیوں کے آثار سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام معاشرہ میں ابھی سے نمایاں ہونے لگے ہیں۔

جنوری ۱۹۷۵ء لاہور

علی عباس جلالپوری

بلوغت اور اوائلِ شباب

بلوغت[1] کا انحصار بڑی حد تک آب و ہوا پر ہے۔ گرم ممالک میں بالعموم بارہ تیرہ برس کی عمر کا لڑکا لڑکی بالغ ہو جاتے ہیں جب کہ سرد ممالک میں بلوغت کا آغاز پندرہ سولہ برس کی عمر میں ہوتا ہے۔ افریقہ اور عرب کے بعض حصوں میں نو دس برس کی لڑکیاں بالغ ہو جاتی ہیں۔

فرائڈ نے جنسی جبلت کے ارتقاء کے تین مراحل گنائے ہیں۔ ـــــ (۱) طفلی کی جنسیت، ـــــ (۲) خفتگی[2]، ـــــ (۳) بلوغت

طفلی کی جنسیت: فرائڈ کے خیال میں شیر خوار بچے میں بھی جنسی خواہش موجود ہوتی ہے۔ اُس کے ہونٹوں میں کھانے کی جبلت اور جنسی حظ جمع ہو جاتے ہیں چنانچہ وہ ماں کے پستان سے دودھ پیتے وقت بھوک اور جنسی خواہش دونوں کی تشفی بہ یک وقت کر لیتا ہے۔ بچہ اپنے اعضائے نہانی کے لمس سے بھی اِک گونہ لذت محسوس کرتا ہے، اُنہیں ٹٹولتا ہے اور اُن سے کھیلتا ہے۔ ماں اور آیا اُس کی اِن حرکتوں کو نفرت اور تشویش کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور ڈانٹ ڈپٹ کر اُسے اِن سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہیں جس سے بچے کے ذہن میں جنس کے ساتھ جُرم اور گناہ کے احساسات وابستہ ہو جاتے ہیں جو اُس کے سرچشمۂ حیات کو مُکدّر کر دیتے ہیں۔ بلوغت کے دوَر کی جنسی کجرویوں کی بُنیاد بھی ماں باپ کے غلط رویّے کے باعث اِسی دوَر میں پڑتی ہے۔ بعض اوقات ماں باپ بچے کو اپنا عضوِ خاص ٹٹولتے دیکھ کر اُسے قطع کر دینے کی دھمکی دیتے ہیں جس سے بچہ 'ختنہ کی اُلجھن' میں مُبتلا ہو جاتا ہے اور ختنے کا خوف بعد میں ضمیر کا خوف بن کر نمودار ہوتا ہے۔ یہی اُلجھن بلوغت کے بعد بچے کو خود کاری کی طرف مائل کرتی ہے۔ ننھی لڑکیاں اپنے بھائیو

[1] PUBERTY جس کا لغوی معنی ہے بال اُگنے کی عمر۔

[2] QUIESCENT

کے عضوِ خاص کو دیکھ کر اس وہم میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ اُن کی امّی نے اُن کا عضوِ خاص قطع کر دیا ہے اور وہ ساری عمر ماں کا یہ قصور معاف نہیں کرتیں۔ نسوانی شرم و حیا اِسی نقص کو چھپانے کی کوشش کا نام ہے۔ فرائڈ کے اِن خیالات سے بعض علمائے نفسیات نے اختلاف کیا ہے لیکن فرائڈ کے اس اِدعا کو عام طور سے تسلیم کر لیا گیا ہے کہ بچّے کی جنسی زندگی کا آغاز پیدائش کے وقت ہو جاتا ہے۔ فرائڈ کے بعض پیرو جنین میں بھی جنسی خواہش کے وجود کو مانتے ہیں[1]۔

خفتگی : دوسرا مرحلہ خفتگی کا ہے جو بچے کی شیر خوارگی کے خاتمے سے شروع ہو کر بلوغت کے طلوع تک رہتا ہے۔ اِن سالوں میں جنسی خواہش پس منظر میں چلی جاتی ہے لیکن اس کا اظہار بالواسطہ لڑکوں اور لڑکیوں کے کھیلوں میں ہوتا رہتا ہے۔ لڑکے لڑکیاں بسا اوقات دُلہا دلہن یا ڈاکٹر مریض کی اداکاری کرتے ہیں۔ لڑکیاں گڈے گڑیا کا ناٹک رچاتی رہتی ہیں۔

بلوغت : بارہ تیرہ برس کی عمر میں لڑکے لڑکی کے جنسی غدود ہارمون پیدا کرنے لگتے ہیں، قد بڑھ جاتا ہے، لڑکے کی آواز بھاری ہو جاتی ہے۔ لڑکی کے سینے پر اُبھار آنے لگتا ہے اور اعضائے نہانی پر بال اُگ آتے ہیں۔ بعض خوبصورت گول مٹول لڑکے بدوضع لم ڈھینگ بن جاتے ہیں، بعض بے ڈول کم رُو لڑکیاں دیکھتے دیکھتے جادو نگاہ حسیناؤں کا روپ دھار لیتی ہیں گویا انہوں نے کینچلی بدل لی ہے۔ لڑکوں کو پورا جوان بننے کے لئے کئی سال درکار ہوتے ہیں جب کہ لڑکیاں چند ماہ میں پوری عورتیں بن جاتی ہیں۔ اِن جسمانی تبدیلیوں کے ساتھ ایک نامعلوم اضطراری کیفیت اُنہیں اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ ہم جولیوں اور اپنی سے بڑی عمر کے لڑکوں لڑکیوں کی باتیں بڑی دلچسپی سے سُنی جاتی ہیں جن میں اشاروں کنایوں میں بچّے کی پیدائش کے عمل سے بحث کی جاتی ہے اور اعضائے نہانی کے بارے میں قیاس آرائیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ لڑکوں کی بہ نسبت لڑکیاں زیادہ متجسس ہوتی ہیں۔ وہ بلوغت کے لئے سخت بے چین ہوتی ہیں اور ایام کا بڑی بے صبری سے انتظار کرتی ہیں اگرچہ پہلی بار خونِ حیض جاری ہونے پر دہشت زدہ بھی ہو جاتی ہیں۔ جب ایام شروع

---

[1] اِسے EMBRYONIC SEXUALITY کہتے ہیں۔

ہو جائیں تو وہ ایک دوسری کو فخریہ بتاتی ہیں کہ میں جوان ہو گئی ہوں۔ لڑکی کی بلوغت کی علامت ایام کا آنا ہے، لڑکوں میں احتلام بلوغت کی نشاندھی کرتا ہے۔ بعض لڑکے لڑکیاں جو بلوغت کے حقائق سے بے خبر ہوتے ہیں ایام کے آنے پر یا احتلام ہونے پر سخت فکرمند ہو جاتے ہیں کہ شاید انہیں کوئی مرض لگ گیا ہے۔ بلوغت کا ذکر کرتے ہوئے سیمون دلوا لکھتی ہیں [1]

"اوائل شباب میں جذبات میں ہیجان اور انتشار پیدا ہو جاتا ہے، خواہشات میں ابتری اور تضاد نمایاں ہو جاتا ہے، خیالات پریشان ہو جاتے ہیں، لڑکیاں رومانی ناول بڑے ذوق سے پڑھتی ہیں، عشقیہ فلمیں دیکھتی ہیں اور اپنے محبوب اداکاروں سے پیار کرنے لگتی ہیں۔ وہ اپنے ملنے والے نوجوانوں میں محبوب اداکاروں کے خدوخال تلاش کرتی ہیں۔ وہ اپنی شکل وصورت اور لباس کے بارے میں حساس ہوتی ہیں اور معمولی سی نکتہ چینی بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔ بات بات پر ٹھنکنے اور الجھنے لگتی ہیں۔ ماں باپ ان کی کسی حرکت پر گرفت کریں تو خودکشی پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ وہ بسا اوقات ایک دوسری کی محبت میں یا اپنی استانیوں کے پیار میں مبتلا ہو جاتی ہیں اور ہر ممکن طریقے سے لڑکوں کی توجہ جذب کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ جب کوئی لڑکا ان میں دلچسپی کا اظہار کرے تو وہ اپنی سہیلیوں کو فخریہ اپنی فتح کا حال سناتی ہیں کہ اس نے مجھی کو منتخب کیا ہے۔ اس سے ان کا اعتماد اپنے حسن اور کشش پر بحال ہو جاتا ہے۔ خوبصورت لڑکیاں لڑکوں کو تگنی کا ناچ نچا کر بڑی خوش ہوتی ہیں۔ ہر لڑکی کی دلی تمنا ہوتی ہے کہ اس کے حسن وجمال، لباس کی تراش خراش اور ذوق زیبائش وآرائش پر داد دی جائے۔ اس کے بالوں آنکھوں یا بدن کے تناسب کی تعریف کی جائے تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتیں۔"

عمر کے اس نازک دور میں نوخیز اپنی شکل وصورت کے بارے میں بڑے حساس ہوتے ہیں۔ لڑکیاں

---

[1] THE SECOND SEX.

اپنی سے زیادہ خوبصورت سہیلیوں کو دیکھ دیکھ کر رشک اور حسد کی آگ میں جلتی ہیں۔ لیوٹالسٹائے اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ وہ اپنے بھائیوں میں سب سے زیادہ بدصورت تھا۔ اپنی بدصورتی کا یہ تلخ احساس اُسے عمر بھر ستاتا رہا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑا اپنے گنواروں کے جیسے کلّے بھدّے بھونڈی ناک اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو دیکھ کر کڑھتا رہتا تھا۔ لکھتا ہے۔[1]

"میرے خیال میں کسی شخص کی زندگی پر سب سے زیادہ فیصلہ کن اثر اُس کی خوبصورتی یا بدصورتی کا ہوتا ہے اور اِس سے بھی زیادہ اثر اِس بات کا ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو پرکشش خیال کرتا ہے کہ بدشکل سمجھتا ہے۔"

اوائل شباب کے جذباتی فشار کا ذکر کرتے ہوئے برٹرنڈرسل لکھتے ہیں[2]

"میں چاندنی راتوں کو پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر گھوما کرتا تھا۔ اِس کا سبب شدید جنسی خواہش تھی لیکن اُس زمانے میں مجھے اِس بات کا علم نہیں تھا۔"

نوخیزوں کے جذبات میں ہر وقت ہیجان بپا رہتا ہے۔ وہ چھوٹی سی بات پر خوشی سے اُچھلنے لگتے ہیں اور معمولی بنا پر مُنہ بسورنے لگتے ہیں۔ یہ رقیق جذباتیت اُنہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ نوخیز لڑکیاں چاہتی ہیں کہ اُن کی جلد از جلد شادی ہو جائے تاکہ وہ خود مختار ہو جائیں اور ماں کی ہر وقت کی نکتہ چینی اور دانتا کلکل سے نجات پالیں۔ بعض لڑکیاں ماں کے درشت رویّے سے تنگ آ کر گھر سے بھاگ جاتی ہیں۔ وہ پیار کے لئے ترستی رہتی ہیں اِس لئے جب کوئی نوجوان اُن سے اظہارِ محبت کرتا ہے تو وہ دل و جان سے اُس پر فدا ہو جاتی ہیں۔ بعض لڑکیاں اپنی بکارت کھو کر ماں کے خلاف بغاوت کا اظہار کرتی ہیں۔ جی، بی شا نے کہا ہے کہ ایک انگریز لڑکی سب سے زیادہ اپنی ماں سے نفرت کرتی ہے لیکن اِس کے ساتھ وہ ماں کی شفقت اور پیار کی آرزومند بھی ہوتی ہے جو اُسے شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔ نوخیز لڑکیوں کو سب سے بڑا صدمہ اُس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی لڑکے کو رجھانے میں ناکام رہتی ہیں۔ ایک لڑکی نے جھلّا کر کہا تھا "کاش وہ میری جانب مائل ہو جاتا اور میں

---

[1] CHILDHOOD, BOYHOOD & YOUTH [2] AUTOBIOGRAPHY

اسے رد کر سکتی ہے، جنسی مواصلت کے بارے میں سخت متجسّس ہونے کے باوجود وہ اُس سے متنفّر بھی ہوتی ہیں۔ ایک لڑکی کا پہلی بار بوسہ لیا گیا تو اُسے سخت کراہت محسوس ہوئی اور اُس نے غسل خانے میں جا کر اپنے دانت برش سے صاف کئے۔ ایک اور لڑکی نے پہلی بار کے جنسی ملاپ کے بعد خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔ بہار اور خزاں کے موسموں میں نوخیزوں کا جنسی جذبہ غیر معمولی تندی سے بھڑک اٹھتا ہے۔ ان موسموں میں طوفان آتے ہیں، آندھیاں چلتی ہیں اسی طرح انسان کے اندرون میں بھی ہلچل مچ جاتی ہے۔ بہار کے ساتھ عشقیہ شاعری کا تعلق ظاہر ہے۔ بہار کا بخار، نوجوان لڑکے لڑکیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے تو وہ روز خوابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اُن کے رگ و پے میں نفس پرورخستگی کی کیفیت نفوذ کر جاتی ہے قدیم زمانے میں موسمی اور فصلی تہواروں اور میلوں پر جنسی مواصلت کی آزادی دی جاتی تھی جس سے 'بہار کا بخار' اُتر جایا کرتا تھا۔

وحشی قبائل آغازِ تاریخ سے بلوغت کی رسوم[1] ادا کرتے رہے ہیں۔ افریقہ، آسٹریلیا اور جزائر غرب الہند کے وحشی قبائل میں یہ رسمیں آج بھی باقی ہیں۔ وہ اُنہیں صحت مندجنسی زندگی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ ختنہ کرنے یا بظر قطع کرنے کی رسمیں آج بھی ادا کی جاتی ہیں۔ ان کی ادائیگی کے بعد لڑکے اور لڑکی کو بالغ مرد اور عورت تسلیم کر لیا جاتا ہے اور انہیں قبیلے کی ذمّے داریاں سونپ دی جاتی ہیں۔ لڑکوں کو خاص طور سے کڑی آزمائش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات اُن کے اگلے دانت توڑ دیئے جاتے ہیں، انہیں کانٹوں کے بستر پر لٹایا جاتا ہے یا اُن کا بدن آگ میں تپائے ہوئے لوہے سے داغا جاتا ہے۔ اس کے دوران میں کوئی لڑکا چیخ مار دے یا رو دے تو اُسے بالغ تسلیم نہیں کیا جاتا اور کوئی لڑکی اُس سے بیاہ کرنے پر رضامند نہیں ہوتی۔ ان عذاب ناک آزمائشوں میں پورا اُترنے کے بعد اُسے ہتھیار دیئے جاتے ہیں، شکار میں شریک کیا جاتا ہے اور اُسے عورتوں سے تمتّع کی اجازت مل جاتی ہے۔ وحشی خونِ حیض سے سخت خوفزدہ ہو جاتے ہیں چنانچہ ایام کے دوران میں لڑکیوں کو بستی سے دور علیحدہ جھونپڑے میں رکھا جاتا ہے۔ اُن کے خیال

---

[1] INITIATION CEREMONIES

میں حائضہ خطرناک اور ناپاک ہوتی ہے۔ اُس میں ایک قسم کی طلسماتی قوت پیدا ہو جاتی ہے جس سے بچنا لازم ہے۔ حائضہ کا یہ طوبعض مہذب اقوام میں آج بھی برقرار ہے۔ جیمز فریزر کہتا ہے کہ بعض قبائل میں بلوغت کے وقت لڑکی کو سورج کی شعاعوں سے اوجھل رکھتے تھے مبادا وہ سورج کی روشنی کو آلودہ نہ کر دے یا اُس کی شعاعوں سے حاملہ ہو جائے۔

بلوغت کے وقت قدرتاً جنسی خواہش بھڑک اُٹھتی ہے۔ چودہ اور سترہ برس کی عمر کے درمیان نوخیز جنسی ملاپ کے بارے میں سخت متجسس ہوتے ہیں۔ سٹیکل کے خیال میں انہی سالوں میں اکثر و بیشتر لڑکیاں اپنی بکارت کھو بیٹھتی ہیں۔ اُنیس برس کی عمر کے بعد البتہ جنسی خواہش میں اعتدال آجاتا ہے۔ جوان لڑکیاں اپنے ہم عمر لڑکوں کو بچے سمجھ کر اُنہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور اپنی عمر سے بڑے نوجوانوں میں دلچسپی لیتی ہیں۔ پندرہ اور اٹھارہ برس کی عمر کے درمیان لڑکیاں اپنے تخیل میں مثالی مرد کا تصور بسا لیتی ہیں جو اکثر اوقات کوئی مشہور ایکٹر ہوتا ہے۔ فرائڈ کے خیال میں بلوغت کے بعد جنسی خواہش خود لذتی اور ہم جنسیت کے مراحل سے گذر کر بالآخر صنف مخالف سے وابستہ ہو جاتی ہے لیکن یہ ارتقاء مشکلات سے خالی نہیں ہوتا۔ ہم ان مراحل کا ذکر قدرے تفصیل سے کریں گے۔

خود لذتی[1] کی ترکیب ہیولاک ایلس نے وضع کی تھی۔ یہ خود کاری[2] سے وسیع تر مفہوم رکھتی ہے۔ خود کاری کا مطلب ہے اپنے اعضائے نہانی کو مختلف طریقوں سے چھیڑ کر منزل ہونے کی کوشش کرنا۔ خود لذتی میں بغیر کسی خارجی وجود کے توسط کے اپنے ہی جسم سے حظ اندوز ہونے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خود لذتی اور نرگسیت لازم ملزوم ہیں۔ نرگسیت انا کا جنسی پہلو ہے اس کا مطلب ہے اپنی ذات سے محبت کرنا۔ لڑکوں کی بہ نسبت لڑکیوں میں نرگسیت کی جانب زیادہ میلان پایا جاتا ہے۔ لڑکوں میں یہ میلان زنانہ مزاجی کی علامت ہے۔ نوجوان لڑکیاں قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے جسم کے دلآویز زاویوں کو مختلف پہلوؤں سے دیکھ دیکھ کر

---

[1] AUTO-EROTICISM

[2] SELF-MANIPULATION

محظوظ ہوتی ہیں اور بعض اوقات بے اختیار پکار اٹھتی ہیں "اُف! میں کس قدر حسین ہوں!" سیمون دبوا لکھتی ہیں۔

"نوجوان دوشیزہ اپنے بدن سے نفس پرور محبت کرتی ہے، اپنے آپ سے پیار کرتی ہے، اپنے بوسے لیتی ہے، اپنے برہنہ کندھوں اور بازوؤں کو چومتی ہے، اپنی ٹانگوں اور چھاتیوں کو گھورتی ہے۔ آغازِ شباب ہی سے اُس کے دل و دماغ میں اپنی ذات کی محبت اور مرد کی طرف راغب ہونے کی تمنا میں کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ نرگسیت جنسی پختگی آنے پر رفع ہو جاتی ہے...... نوخیز دوشیزہ عالمِ حقائق سے منہ موڑ کر اپنے ہی حسین بدن کے جادو پر عقیدہ رکھتی ہے۔ جادو جو مردوں کو اُس کا مطیع کر دے گا۔ بعض لڑکیاں اپنے برہنہ اعضاء ایک دوسری کو دکھاتی ہیں، آپس میں چھاتیوں کا مقابلہ کرتی ہیں اور عام دخاص بوسوں کا تبادلہ کرتی ہیں۔"

بسا اوقات نوجوان نفسانی ہیجان کے ریلے میں بے اختیار بہہ جاتے ہیں، اپنے جذبات کی شورش پر قابو نہیں پا سکتے اور خود کاری کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ عام حالات میں اُن سے بڑی عمر کے لڑکے لڑکیاں اُنہیں گمراہ کرتی ہیں لیکن بعض دفعہ نفسانی ہیجان بھی اُنہیں خود کاری کے طریقے سکھا دیتا ہے اور وہ کسی نہ کسی طرح جنسی خواہش کے جوش و خروش کو رفع کر لیتے ہیں۔ برٹرنڈ رسل لکھتے ہیں[1]

"پندرہ برس کی عمر میں ڈیسک کے ساتھ لگ کر بیٹھے ہوئے مجھے سخت خیزش ہوتی اور میں جلق لگانے لگتا البتہ اِس میں میں نے کثرت کبھی نہیں کی۔ میں اِس پر شرمسار ہوتا اور اسے ترک کرنے کی کوشش کرتا تاہم میں بیس برس کی عمر تک جلق لگاتا رہا تا آنکہ عشق میں مبتلا ہوا اور میں نے یہ عادت ترک کر دی...... جنسی

[1] AUTOBIOGRAPHY

جذبے کے اِس اُبال کے ساتھ میری شالیت پسندی کے احساسات وابستہ تھے جن
کے بارے میں ہنوز مجھے علم نہیں تھا کہ یہ جنسی خواہش پر مبنی ہیں۔ مجھے بادلوں اور
شفق، بہار اور خزاں کے درختوں کے حُسن میں بے حد دلچسپی محسوس ہونے لگی لیکن یہ
دلچسپی جذباتی نوع کی تھی اور جنس کے لاشعوری ارتفاع کی ایک صورت تھی میں
اِس میں فرار تلاش کیا کرتا تھا۔"

مصر میں سلاطین اور اُمراء کے بعض گھرانوں میں نوخیز لڑکوں کو جلق سے بچانے کے لئے اُنہیں بالغ
ہونے پر لونڈیاں دی جاتی تھیں۔ مہدی جوان ہوا تو اُس کے باپ منصور نے اُسے ایک کنیز محیاۃ
عطا کی تھی۔ لیوٹالسٹائے لکھتا ہے کہ اُس کا بھائی نکولس سولہ برس کا ہوا تو اُس کے باپ نے نکولس
کو ایک لونڈی دی تھی تاکہ وہ بے راہ روی سے محفوظ رہے۔ اِس لونڈی کے بطن سے نکولس کا ایک بیٹا
بھی پیدا ہوا تھا۔ جدید تمدن میں جنسی خواہش کو بھڑکانے کے سامان تو بہت ہیں لیکن اس کی آسودگی
کے وسائل کم ہیں۔ نوخیز عامیانہ گیت سُن سُن کر اور ہوس پرور فلمیں دیکھ دیکھ کر از خود رفتہ ہو جاتے
ہیں اور نفسانی ہیجان سے نجات پانے کے لئے خود کاری سے رجوع لاتے ہیں۔ کنسے کی رپورٹ کے
مطابق امریکہ میں ۹۳ فی صد لڑکیاں پندرہ برس کی عمر میں خود کاری کرتی ہیں البتہ جنسی مواصلت
میسّر آنے پر اسے ترک کر دیتی ہیں۔ کلاسنر کی تحقیق یہ ہے کہ ناروے سویڈن میں دو تہائی لڑکیاں
سولہ برس کی عمر میں خود کاری کرتی ہیں اور اکثر و بیشتر لڑکے جلق لگاتے ہیں۔

جلق کے اثرات کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ رینے دگورموں اور اُس کے ہم خیال
کہتے ہیں کہ جلق لگانا عین فطری ہے۔ نوخیزی کے نازک مرحلے پر کبھی کبھار جلق لگانے یا خود کاری کرنے
سے لڑکے اور لڑکیوں کو اعصابی آسودگی اور جنسی تسکین میسّر آتی ہے۔ ہیولاک ایلس کے خیال میں
جلق لگانے سے جسم کی بہ نسبت ذہن زیادہ ماؤف ہوتا ہے کیوں کہ اس سے نوخیز احساسِ جرم میں
مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جرم یا گناہ کا یہ تلخ احساس نہ ہو تو جلق چنداں ضرر رساں نہیں ہوتی۔
فرائڈ کہتا ہے کہ جلق سے جو ذہنی کرب اور احساسِ جرم کی اذیت محسوس ہوتی ہے وہ جسمانی ضرر سے

کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے ۔ اِس کے خیال میں ہر نوخیز کو خود لذتی کے مرحلے سے گذرنا پڑتا ہے
جلق اور خودکاری نُوخیزوں کے نفسانی ہیجان کی تسکین کا باعث ہوتی ہے ۔ شیر خوار بچے بھی خودکاری
سے محظوظ ہوتے ہیں اور نُوخیزی میں اِسی میلان کا اِحیاء ہوتا ہے ۔ اکثر ڈاکٹروں اور تحلیل نفسی کے
طلبہ کے خیال میں کبھی کبھار کی خودکاری یا جلق ضرر رساں نہیں ہوتی البتہ اس کی کثرت و مداومت
جسمانی و نفسیاتی صحت کو تباہ کر دیتی ہے ۔ اِس سے لڑکوں کو زیادہ نقصان پہنچتا ہے کیوں کہ مادّہ
منویّہ کا بکثرت اِخراج اُن کے اعصاب کو مُضمحل اور توانائی کو ختم کر دیتا ہے ۔ فرائڈ کہتا ہے ۔

"ڈاکٹر جلق کے مُضر اثرات کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے جب کہ مریض کہتے ہیں کہ اُن کے
جُملہ عوارض کا اصل سبب جلق ہی ہے ۔ میرے خیال میں مریض ٹھیک ہی کہتے ہیں ۔"

ڈاکٹر میری سٹوپس لکھتی ہیں [1]

"مردانہ کمزوری ، سُرعتِ انزال وغیرہ کا ایک اہم سبب جلق ہے ۔ اکثر نوخیز لڑکے
لڑکیاں جلق لگاتے ہیں ۔ مذی کے اخراج سے مرد کا عضوِ خاص دخول میں کوئی دِقت
محسوس نہیں کرتا لیکن ہاتھ یا کسی دوسری شے کی رگڑ سے خُشنفے اور عضوِ مخصوص کی رگوں
کو نقصان پہنچتا ہے اور وہ پوری طرح نشو و نما نہیں پا سکتا جس سے آدمی مقاربت
کے قابل نہیں رہتا ۔ کبھی کبھار جلق لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن نوخیزی کے
دوران میں کثرت و تواتر سے جلق لگانا تباہ کُن ہے ۔ جلق کے ساتھ گناہ کی اُلجھن
وابستہ ہو جاتی ہے جو اکثر اوقات سُرعتِ انزال کا باعث ہوتی ہے ۔ مجلوق کو احساسِ
گناہ سے نجات دِلانا ضروری ہے ۔ جو لوگ کبھی کبھار جلق لگاتے ہیں اُن کی صحت پر
کوئی ناخوشگوار اثر نہیں پڑتا ۔"

عام حالات میں نوخیز کبھی کبھار جلق لگا کر جنسی تسکین حاصل کر لیتے ہیں لیکن بعض نوخیز لاشعوری جبر کے
تحت جلق لگاتے ہیں یا خودکاری سے رجوع لاتے ہیں ۔ ان کی اکثریت ایسے نوخیزوں پر مشتمل ہوتی ہے

---

[1] THE ENDURING PASSION.

جو ماں باپ کی محبت سے محروم ہوتے ہیں یا اپنی بدصورتی کے باعث جذب توجہ سے قاصر رہتے ہیں۔ اِس محرومی کے باعث وہ روز خوابی کی حالت میں تخیلاتی معاشقے کرتے ہیں۔ اِن کے لیے جلق یا خودکاری ایک جبری فعل کی صُورت اختیار کر جاتی ہے۔ یہی وہ نوخیز ہیں جن کے لیے جلق یا خودکاری نہایت ضرر رساں ہوتی ہے۔

کثرتِ جلق بلاشبہ ایک نوخیز کے جسم اور ذہن کے اکثر عوارض کا سبب بن جاتی ہے۔ بارہ، تیرہ برس کی عمر میں کثرت و تواتر سے جلق لگائی جائے تو اعضائے تناسل کی نشو و نما رُک جاتی ہے۔ کوتاہی، لاغری اور کجی کے باعث مجلوق مقاربت کے قابل نہیں رہتا، اُس کا نظامِ عصبی ماؤف ہو جاتا ہے اور ذکاوتِ حس کے باعث سُرعتِ انزال میں مُبتلا ہو جاتا ہے۔ اُس کا بدن کمزور اور ناتواں ہوتا ہے، آنکھیں اندر دھنس جاتی ہیں، اُن کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہو جاتے ہیں، آنکھوں کی پُتلیاں بے رونق اور بے نُور ہو جاتی ہیں، چہرے کا رنگ مٹیالا ہو جاتا ہے، چہرے پر پھنسیاں نکل آتی ہیں، ہاتھ بھیگے بھیگے اور سرد رہتے ہیں، حافظہ کمزور ہو جاتا ہے، بات کرتے وقت وہ مخاطب سے آنکھ نہیں ملا سکتا نہ کسی مسئلے پر غور و فکر کر سکتا ہے، اُس کا اعتمادِ نفس مجروح ہو جاتا ہے، مزاج ہموار نہیں رہتا، عزم و حوصلہ سے عاری ہو جاتا ہے، متلوّن مزاج اور چڑچڑا ہو جاتا ہے اور ٹوٹے پھوٹے جملوں میں بات کرتا ہے، دوسرے ہم سِنوں کی صحبت سے گریز کرتا ہے اور کھیلوں میں حصّہ نہیں لیتا، یکہ و تنہا اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا ہے، لباس کے معاملے میں بے پروا ہوتا ہے، بدن کی صفائی کا خیال نہیں رکھتا، شادی کے نام سے گھبراتا ہے، جوان عورت سے بات کرتے ہوئے اُس کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں اور دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔ وہ عصبی المزاجی اور تشویش کی اُلجھن میں مُبتلا ہو جاتا ہے۔ بس میں سفر کر رہا ہو تو ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں اُس کی ٹکر نہ ہو جائے، سینما ہال میں بیٹھا ہو تو اُوپر دیکھتا ہے کہ کہیں چھت نہ گر پڑے۔ اُس کی اِقدام اور پیش رفت کی قوت سلب ہو جاتی ہے اور اُس میں مریضانہ جھجک پیدا ہو جاتی ہے۔ نفسیاتی رکاوٹ کے باعث وہ معمولی سا کام بھی سلیقے سے نہیں کر سکتا مثلاً کسی

لے NEURASTHENIA ANXIETY NEUROSIS INHIBITION

والے کو آواز دیتے وقت، کھڑکی سے ٹکٹ خریدتے وقت، ریل میں سوار ہوتے ہوئے، پبلک بیت الخلا کو استعمال کرنے وقت گھبرا جاتا ہے۔ وہ نہ کسی کے مذاق پر کھل کر ہنس سکتا ہے اور نہ کسی کی مصیبت میں کسی سے اظہارِ ہمدردی کر سکتا ہے۔ اُس کی خاموشی اور لب بستگی کے باعث لوگ اُسے مُتکبّر سمجھنے لگتے ہیں کیوں کہ وہ اُس کے عجیب و غریب طرزِ عمل کے اصل سبب سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اُسے اپنی المناک حالت کا احساس ہوتا ہے اور وہ چوری چھپے اپنا علاج بھی کراتا ہے لیکن مُستند معالج کے پاس جا کر صاف صاف اپنا حال نہیں بتا سکتا۔ اِشتہاری عطائیوں سے دوائیں منگوا کر کھاتا رہتا ہے جس سے اُس کی رہی سہی صحت بھی جواب دے جاتی ہے۔ وہ زندگی کے حقائق سے گُریز کر کے بڑے بڑے بلند نصب العین اپنا لیتا ہے اور ہیرو بننے کے خواب دیکھنے لگتا ہے، ادبی ذوق سے بہرہ ور ہو تو معیار سے گرا ہوا ادب تخلیق کرتا ہے۔ اُس کے اِحساس میں جو ذکاوت اور تخیُل میں جو خواب ناکی سی آجاتی ہے وہ اُس کے شعروں اور قصّوں میں بھی رقیق جذباتیت اور المناک افسردگی کا رنگ بھرتی رہتی ہے۔

نوخیزوں کو کثرتِ جلق سے علّت سے بچانے کی ذمّے داری باپ پر عائد ہوتی ہے کیوں کہ نوخیزی کے مرحلے پر لڑکے سے توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ مناسب جنسی معلومات سے بہرہ مند ہو گا اور کثرتِ جلق کے اثرات و نتائج کا وقوف رکھے گا۔ لڑکا بارہ تیرہ برس کا ہو جائے تو باپ پر لازم ہے کہ وہ اُس پر نگاہ رکھے۔ لڑکے کو علٰحدہ کمرے میں سونے کا موقع نہ دے بلکہ رات کو اُس کی چارپائی اپنے پاس بچھوائے، اُسے ٹھنڈے پانی سے غُسل کرنے کی ترغیب دلائے، اُس کے چھوٹے موٹے عُقدے سُلجھانے کی کوشش کرے اور اُسے جا بجا سرزنش نہ کرے۔ ایک نوخیز کے لئے بیکار بیٹھنا زہر ہے۔ اُس کے اوقاتِ عمل ایسے مُعیّن کئے جائیں کہ وہ ہر وقت مطالعے یا صحت مند قسم کے کھیل تفریح میں مصروف رہے۔ میں یہاں ایک لڑکے کی مثال دوں گا۔

حمید ــــ یہ نام فرضی ہے ــــ میری جماعت میں پڑھتا تھا۔ وہ اکثر جماعت سے غیر حاضر رہتا یا چُپ چاپ اپنی نشست پر بیٹھا رہتا۔ وہ آنکھوں پر گہرا سیاہ چشمہ لگاتا تھا اور جماعت کی کسی

بحث میں حصہ نہیں لیتا تھا۔ جب کبھی اُس سے کوئی سوال پوچھا جاتا تو وہ سر نیہوڑائے چُپ چاپ اپنی جگہ کھڑا ہو جاتا اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑانے لگتا جس پر دوسرے لڑکے ہنسنے لگتے۔ کالج میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد ایک دن حمید جھجکتا، سمٹتا ہوا میرے پاس آیا اور دیر تک بیٹھا اِدھر اُدھر کی بے تکی باتیں کرتا رہا۔ اُس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور آنکھوں میں شکار کیے جانے والے جانور کی کرب ناک وحشت تھی۔ آخر ایسی آواز میں جو معمولی آواز سے چڑھی ہوئی تھی اور جس میں ایک دبی دبی سی چیخ محسوس ہوتی تھی یکبارگی وہ اپنا دکھڑا رونے لگا۔ اُس نے ٹوٹتے پھوٹتے الفاظ میں کم اِشاروں کنایوں میں زیادہ مجھے اپنی بپتا سُنائی پھر گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور اجازت طلب کی۔ جاتے وقت وہ اپنی نوٹ بُکیں میرے پاس چھوڑ گیا اور کہنے لگا کہ جو کچھ میں زبانی نہیں بتا سکا وہ اِن میں پڑھ لیجیے گا پھر باچشمِ نم بولا آپ میرے مشفق اُستاد ہیں میں آپ سے امداد کا طالب ہوں خدارا میری مدد کیجیے آپ میرا آخری سہارا ہیں۔ اِس کے بعد وہ پورا ایک سال ہفتے میں ایک بار میرے پاس آتا رہا اور جو باتیں میرے سامنے نہ کہہ سکا وہ اپنے خطوط میں لکھ کر بھیجتا رہا۔ اُس کے خطوط میرے پاس موجود ہیں۔ اِن میں سے کچھ اقتباسات درج ذیل ہیں۔

"____ اِس وقت میرے چاروں طرف تفکرات، مایوسیوں، درد و کرب، اُلجھنوں، پریشانیوں، غمزدگیوں کے بادل چھا گئے ہیں اور میں تھکی ہوئی نڈھال آنکھوں سے اُنہیں دیکھ رہا ہوں۔ میں اُن کا مقابلہ کرتے کرتے اب تھک گیا ہوں۔ میں اب اِس بوجھ کو مزید اپنے کمزور و ناتواں کندھوں پر ڈال کر چند قدم بھی نہیں چل سکتا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے اندر اب موت کی خواہش پیدا ہو رہی ہے۔"

"____ آج آپ جس شخص کو سامنے بیٹھا ہوا دیکھ رہے تھے اُس کی اِن آنکھوں کی اوٹ میں زبردست طوفانی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ میں نے کئی مرتبہ کوشش کی لیکن میں اپنے اِس رُوحانی و دلی کرب و اذیّت، تکلیف، زخموں کو مناسب و موثر طریقے سے آپ کو دکھا نہیں سکا۔ میں اِس درد و کرب کو ذہنی عیاشی کا ذریعہ بنا سکتا ہوں مگر روحانی عیاشی کا نہیں اِس لیے کہ رُوح کو خوشی سے واسطہ ہے نہ کہ عیش سے۔ جب سے میں نے فلم 'زندگی یا طوفان' دیکھی ہے میں اتنا پریشان، غمزدہ، درد و کرب میں

مبتلا ہوں کہ میں دُنیا بھر کے الفاظ استعمال کرنے کے بعد بھی اس کو درست طریقے پر بیان نہیں کر سکتا۔ میں ایک زندہ لاش ہوں جو اِدھر اُدھر رینگ رہی ہو اِس احساس کے ساتھ کہ آج میں واقعی مُردہ ہو گیا میں اب مرجانا چاہتا ہوں۔ کاش مجھ میں مرنے کی ہمت ہو جائے۔ اب میری پُرانی لاٹھیاں[1] ٹوٹ رہی ہیں۔ اب مجھ کو اگر کوئی مناسب سہارا نہ ملا تو میں کمرِ خمیدہ کے ساتھ نیچے گر پڑوں گا اور پھر کبھی آپ کے پاس نہیں آؤں گا۔"

"ــــــ میں اپنا دُبلا پتلا جسم دیکھ کر شدید خود ترسی میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ میرے اندر یہ خیال اُبھرتا ہے کہ مجھے ٹی بی ہو جائے گی اور اب میں مرجاؤں گا لیکن میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔ میں اِس طرح گھُٹ گھُٹ کر جہنّمی عذاب کے ساتھ ہرگز مرنے کے لئے تیار نہیں ہوں، میں خودکشی کو ترجیح دوں گا لیکن میں زندگی موت کی اِس جدوجہد کے دوران ایک داؤ، آخری داؤ ضرور لگانا چاہتا ہوں میں اب موہوم اُمیدوں کے سہارے زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ کاش کہ آپ اس وقت میرے دل میں جھانک سکتے۔ میں یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ میری از حد نمناک، افسردہ آنکھوں میں جھانک کر میری رُوح کی شدید سسکیوں کو سُن سکتے کہ میں کس طرح اِن انگاروں پر لوٹ رہا ہوں.... میرے اندر کیسی کیسی عجیب اُمیدیں ہوتی ہیں جو اپنی حسرتوں کے مزار پر دیئے بھی جلاتی ہیں اور زندگی کے نئے سُورج کی طرف بھی حسرت ناک نگاہوں سے دیکھتی ہیں۔ مجھ سے بڑھ کر مصیبت زدہ شاید ہی کوئی ہو۔ اگر میں اپنے آپ کو بدنصیب کہوں تو وہ اپنے جرائم، پرغلطیوں کی پردہ پوشی کے مترادف ہو گا البتّہ بدبخت کہنے میں مجھے کوئی عار نہیں۔ اِس مرحلے پر پہنچ کر اَب میرے اندر جینے کی تمنّا مفقود ہو رہی ہے۔"

"ــــــ میری آنکھوں میں عجیب سی مدہوشی، مُردگی کا پتہ چلتا ہے، دماغ پتھّر کی طرح بے حس اور ٹھس ہے..... میری حالت کتنی تکلیف دہ ہے مگر اس کے باوجود میں ایک عجیب سی بے ہوشی کے عالم میں وہی حرکتیں دُہراتا رہتا ہوں ..... میرے دِل و دماغ پر مبہم سی کیفیات طاری ہیں: اُداسی، عجیب سی خلش، بے نام سی بے کیفی، افسوس و رنج۔"

---

[1] بیساکھیاں

خود ترسی ، رحم طلبی ، موت کی آرزو ، تشویش اور جُرم کی اُلجھن کثرت جلق اور خود کاری میں مبتلا نوجوانوں کے احساس و فکر کی عکاسی کرتی ہیں۔ طوالت کے خوف سے راقم التحریر حمید کے تجزیۂ نفس کی تفصیلات ، اُس کی رہنمائی اور خود کاری کے جبر کو توڑنے کے سلسلے میں اپنی کوششوں کا ذکر نہیں کرے گا۔ شاید اِس ذکر کا یہ محل بھی نہیں ہے۔ مختصراً یہ کہ حمید بارہ تیرہ برس کی عُمر ہی میں خود کاری کرنے لگا۔ وہ ایک امیر باپ کا بیٹا تھا۔ اُس کا باپ ابتدائے عُمر میں ایک کم مایہ درزی تھا جس نے سسرال والوں کی مدد سے کاروبار شروع کیا چند ہی سالوں میں لکھ پتی بن گیا۔ دوسرے نو دولتیوں کی طرح وہ نہایت خود غرض ، قابو چی ، خسیس اور شیخی خورا تھا اور اپنے بیٹوں کو ایک ایک پائی کا محتاج رکھ کر منفی قسم کی خوشی محسوس کیا کرتا تھا۔ بظاہر وہ بڑا متدیّن تھا لیکن زُہد و ورع کے پردے میں ذاتی مفاد کی پرورش کرتا تھا۔ یہ سب باتیں اُس کے بیٹے نے مجھے بتائیں۔ حمید اُس کا چوتھا بیٹا تھا اور ایسا بچہ تھا جس کی ذات میں باپ نے کبھی بھی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ لڑکپن میں باپ کی شفقت کے لیے ترستا رہا۔ اُس کا باپ اپنے کاروبار میں اس قدر مصروف تھا کہ ہفتوں تک گھر میں اُس کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا اور جب کبھی اتفاق سے وہ سامنے آ بھی جاتا تو حمید کو ڈانٹ ڈپٹ کے سوا کچھ نہ ملتا۔ باپ کے اِس تغافل نے حمید کو لڑکپن ہی میں اِک گونہ تشویش اور وحشت میں مبتلا کر دیا۔ اُس کی ماں کو بھی گھر کے کام کاج سے فرصت نہیں ملتی تھی ، بڑے بھائی اپنے اپنے چکروں میں پڑے تھے۔ ناچار جی بہلانے کے لئے نوکروں کے پاس بیٹھنے لگا۔ ایک دن ایک نوکر سے حمید نے پوچھا کہ یہ پریاں کیا ہوتی ہیں جن کا ذکر قصّوں میں آتا ہے۔ نوکر نے کہا میں تمہیں پرستان کی سیر کراؤں گا اور اِس عنوان سے حمید کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ اوائل شباب ہی سے حمید کثرت سے فلمیں دیکھنے لگا۔ اِس طرح گھر کے ماحول سے اُسے فرار کا ایک راستہ مِل گیا۔ فلموں میں بوس و کنار کے مناظر دیکھ دیکھ کر اور عشقیہ گانے سُن سُن کر اُس کی جنسی خواہش میں اُبال آ گیا اور اُس نے خود کاری کرنا شروع کی جو شُدہ شُدہ جبر کی صورت اختیار کر گئی اور اُس کے لئے تفریح کا ایک وسیلہ بن گئی۔ اِن دنوں وہ اپنے آپ کو ہیرو سمجھتا تھا۔ وہ فلموں کے مکالمے یاد کر کے تنہائی میں بولا کرتا

اور اُن کے گانے گنگنایا کرتا۔ اِس کے ساتھ اُس نے ابنِ صفی وغیرہ کے عامیانہ ناول پڑھنے شروع کیئے۔ ایک دن گلی کی لائبریری سے اُسے وہی وہانوی کا ایک ناول پڑھنے کو مِلا جس کی فیس دس رُپے وصول کی گئی۔ اِن مشاغل کے لیئے رُوپے کی ضرورت تھی چنانچہ حمید گھر میں چوری کرنے لگا۔ اُس نے انگریزی رسالوں سے عورتوں کی نیم عُریاں تصویریں کاٹ کاٹ کر ایک البم بنا لیا۔ جہاں کہیں اُسے کوئی نیم عُریاں تصویر دکھائی دیتی وہ اُسے حاصل کر کے دم لیتا تھا۔ خُود کاری کے وقت وہ اِس البم کی تصویریں سامنے رکھ لیتا اور تخیّل میں فرض کر لیتا کہ یہ اُس کی حسین محبوبہ ہے جو اُسے ملنے کے لیئے آئی ہے۔ وہ اُس سے باتیں کرتا، پُرجوش الفاظ میں اُس سے اظہارِ عشق کرتا اور اُسے محبت بھرے فلمی گیت سُنایا کرتا۔ اپنے "حرم" کی ہر عورت سے اُسے عشق تھا۔ اِس لڑکے کو گدبدی عورتوں کے بوجھل کُولہوں اور بھری بھری رانوں کا خبط تھا۔ راستہ چلتے ہوئے اُس کی مُڈبھیڑ کسی ایسی عورت سے ہو جاتی جس کے کولہے بھاری بھرکم ہوتے تو وہ اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیتا اور اُس کے مٹکتے ہوئے کُولہوں پر نظریں گاڑے خاصی دور تک اُس کا پیچھا کیا کرتا۔ بقول اُس کے وہ کسی ایسی عورت کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا دُنیا کے آخری سِرے تک جا سکتا تھا۔ شبانہ روز کی خُود کاری سے اُس کا جسم سُوکھ کر کانٹا ہو گیا اور چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔ وہ اکثر اوقات اپنے کمرے میں گھُسا رہتا اور خیالات کی دُنیا بسائے رکھتا۔ وہ اپنے تصور میں کسی فلم ایکٹرلیس یا انگریزی رسالے کی کسی نیم عُریاں عورت کو بسا لیتا اور پھر ابتدائے عشق سے لے کر انتہائے وصال تک کے مراحل خیال ہی خیال میں طے کیا کرتا اِسی زمانے میں اُس نے فحش نگاری شروع کی۔ اُس کی نوٹ بکوں میں نہایت فحش افسانے میری نظروں سے گُذرے۔ فحاشی کے باوجود مجھے بعض مقامات پر اُس کی فن کارانہ بصیرت اور لطافتِ بیان کا احساس بھی ہوا۔ ظاہراً اپنے تخیلات کی عملی ترجمانی کے لیئے اُس نے فحش نگاری کا سہارا لیا تھا۔ اُس کی فحش تحریریں دیکھ کر میرا یہ عقیدہ راسخ ہو گیا کہ فحش نویس پورے مرد نہیں ہوتے اور فحاشی سے اپنی کوتاہ ہمتی کی تلافی کرتے رہتے ہیں۔

مشورے کے دوران میں ایک دن حمید نے بڑی عاجزی سے مجھ سے قرضِ حسنہ مانگا اور

وعدہ کیا کہ ایک ماہ تک رقم واپس کر دے گا۔ میں نے ٹال مٹول سے کام لیا کیوں کہ ایک تو مجھے اس بات کا یقین تھا کہ یہ رقم فحش کتابوں اور فلموں پر صرف ہو گی اور دوسرے میں جانتا تھا کہ وہ یہ قرضِ حسنہ واپس نہیں کر سکے گا، دوسرے مقروضوں کی طرح بھاگ جائے گا اور مشورہ ادھورا رہ جائے گا۔ بہرصورت ایک برس کے بعد وہ اچانک غائب ہو گیا۔ اُس کا آخری خط جو مجھے ملا اُس میں حمید نے بڑی گرم جوشی سے میرا شکریہ ادا کیا تھا۔ کچھ مدت کے بعد مجھے بتایا گیا کہ اُس کی صحت پہلے سے بہتر ہے اور اُس کے باپ نے ایک معقول کاروبار بھی اُس کے سپرد کر دیا ہے۔

نوخیزوں کی ہم جنسی محبت اگرچہ شعوری اور واضح طور پر جنسی نہیں ہوتی تاہم اُس کی تہ میں نیا نیا بیدار شدہ جنسی اُبال ضرور کارفرما ہوتا ہے۔ اس نوع کی محبت کی مثالیں ہر سکول اور کالج میں بالعموم اور طلبہ و طالبات کی اقامت گاہوں میں بالخصوص ملتی ہیں۔ ایک ہی جماعت یا مدرسے میں پڑھنے والے لڑکے بعض اوقات ایک دوسرے سے پُرخلوص محبت کرنے لگتے ہیں خوبصورت اور خوش پوش لڑکے اپنے ساتھیوں کی توجہ کے مرکز بن جاتے ہیں۔ لڑکے اُن کی تالیفِ قلب میں کوشاں رہتے ہیں اور اُن سے باتیں کرنے اور مِل کر کھیلنے کے عنوان تلاش کر لیتے ہیں۔ بعض اوقات وہ حسد اور رقابت کے مارے لڑائی جھگڑے پر بھی اُتر آتے ہیں۔ ایرانی ذوق رکھنے والے بعض اُستاد بھی خوبصورت لڑکوں کے دیدار سے آنکھیں سینکتے ہیں۔ ؎

به مکتب آمد آں طفلِ پریزاد   مبارک باد مرگِ نو به اُستاد

اُستادوں اور چاہنے والے طلبہ میں رقابت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ سطور قلم بند کرتے ہوئے راقم التحریر کو دو واقعات یاد آ رہے ہیں۔ پہلا واقعہ لاہور کے ایک مشہور سکول سے متعلق ہے۔ کئی برس ہونے کو آئے اِس سکول کے ایک ماسٹر صاحب ایک خوبرو لڑکے پر فریفتہ ہو گئے۔ وہ چھٹی کے بعد اِس طالبِ علم کو اپنے کمرے میں بُلا لیتے اور اُس سے محبت بھری باتیں کیا کرتے۔ ماسٹر صاحب کے رقیب طلبہ بھی تاک میں تھے۔ ایک دن اِن لڑکوں نے ماسٹر صاحب کو عینِ حالتِ دگرگوں میں پکڑ لیا اور شور مچا دیا۔ بات دور تک پہنچی لیکن سکول کے وقار کے نام پر اِسے دبا دیا گیا۔

اور ماسٹر صاحب کا چپکے سے تبادلہ کرا دیا گیا ۔ اُستادوں اور طلبہ کی رقابت کا دوسرا واقعہ لاہور کے ایک معروف کالج سے تعلق رکھتا ہے جہاں مخلوط تعلیم رائج ہے اور جہاں نوجوان اُستادوں اور طلبہ میں رقابت کے عنوان اکثر پیدا ہوتے رہتے ہیں ۔ ایک نوجوان لیکچرار اپنی ایک حسین طالبہ سے پیار کرتے تھے اور اُسے اپنی جانب ملتفت کرنے کے لئے ناکام کوششیں کیا کرتے تھے کیوں کہ اُن کی محبوبہ اپنے ایک ہم جماعت لڑکے سے محبت کرتی تھی ۔ ایک دن لیکچرر صاحب کالج کے باہر گھاس کے میدان میں کھڑے چند لڑکوں اور لڑکیوں سے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ وہ لڑکی بھی موجود تھی ۔ اچانک وہی لڑکا کار میں آیا تو لیکچرر صاحب کی محبوبہ لپک کر اُس کے پاس بیٹھ گئی اور ہنسی ٹھٹھا ہونے لگا ۔ لیکچرر صاحب تاؤ کھا گئے ۔ جوشِ غضب سے کانپتے ہوئے پرنسپل کے پاس گئے اور لڑکے کی شکایت کرتے ہوئے اُنہیں بتلایا کہ وہ فلاں لڑکی سے کھلم کھلا معاشقہ کر رہا ہے اور کالج کی اخلاقی فضا کو خراب کر رہا ہے ۔ پرنسپل صاحب چپ چاپ بیٹھے لیکچرر کی تلخ و تیز باتیں سُنتے رہے ۔ لیکچرر نے بات ختم کی تو پرنسپل نے مسکراتے ہوئے کہا " پروفیسر صاحب ! اس میں قصور لڑکے یا لڑکی کا نہیں ہے ۔ یہاں GLANDS کا قصور ہے ۔" لیکچرر صاحب خفیف ہو کر کمرے سے باہر نکل گئے کیوں کہ اُن کے اندرون میں بھی تو GLANDS ہی نے گڑبڑ مچا رکھی تھی ۔

اکثر والدین اپنے بچوں کو سکول میں داخلہ دلا کر اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں اور اِس بات کی پروا نہیں کرتے کہ اُن کے بچے کے ہم جولی کون ہیں اور کیسے ہیں ۔ باپ کا فرض ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو بدقماش نوجوانوں کی صحبت سے بچائے ۔ بُری صحبت میں بچوں کا اخلاق تباہ ہو جاتا ہے اور وہ چھوٹی عمر ہی میں بُری عادتوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں ۔

نوخیزوں میں ہم جنسی محبت کا میلان تیرہ برس کی عمر سے سولہ برس کی عمر تک رہتا ہے ۔ اس کے بعد وہ صنفِ مخالف میں دلچسپی لینا شروع کر دیتے ہیں ۔ سیمون دبوا لڑکیوں کی ہم جنسی محبت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں

"کم و بیش تمام نوخیز لڑکیوں میں ہم جنسی رجحان پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سکولوں، کالجوں اور نگار خانوں میں لڑکیاں ایک دوسری کے دامِ محبت میں گرفتار ہو جاتی ہیں، ایک دوسری کو اپنی ہمراز بنا لیتی ہیں، اپنی محبت کا ثبوت دینے کے لئے اپنے اعضا کو داغنے سے بھی گریز نہیں کرتیں، ایک دوسری کو پیارے پیارے ناموں سے بُلاتی ہیں اور محبت بھرے خطوط لکھتی ہیں[1]۔"

سمون دلوا نے اِس نوع کے چند خطوط اپنی کتاب میں درج کئے ہیں۔ اِن میں سے کچھ اقتباسات درجِ ذیل ہیں[2]

"——— میں وہاں کھڑی تھی، میری کمر کو وہ چھوٹا سا سفید ہاتھ دبا رہا تھا، میرا ہاتھ اُس کے گول شانے پر تھا، میرا بازو اُس کے برہنہ گرم گرم گلے پر تھا، میں اُس کی گداز چھاتیوں کے ساتھ لگی کھڑی تھی، میرے سامنے اُس کا خوبصورت چہرہ تھا، ..... ہونٹ کُھلے تھے۔ میں کانپنے لگی اور مجھے محسوس ہوا جیسے میرا چہرہ شرم سے لال بھبوکا ہو گیا ہے۔"

"——— میری دل و جان سے پیاری محبوبہ! میری حسین پری! آہ! کہو ناں کہ تم مجھ سے پیار کرتی ہو، کہو ناں! کہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہاری پیاری سہیلی ہوں میں اُداس ہوں میری پیاری! مجھے تم سے کس قدر محبت ہے۔ میرے پاس الفاظ کہاں کہ اپنے پیار کا اظہار کر سکوں۔ اپنے پیار کے اظہار سے مجھے کبھی سیری نہیں ہوتی۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں تمہیں پُوجتی ہوں تو اِس سے بھی میرے احساس کی ترجمانی نہیں ہو سکے گی۔ بعض اوقات یُوں لگتا ہے جیسے میرا دل پھٹ جائے گا۔ اِس سے زیادہ حسین تصوّر اور کیا ہو گا کہ تم مجھ سے پیار کرو۔ مجھے اِس بات کا یقین نہیں آتا۔ میری جان! مجھے بتاؤ کہ تم ہمیشہ ہمیشہ مجھ سے پیار کرتی رہو گی۔"

---

[1],[2] THE SECOND SEX.

لڑکوں اور اُستادوں کی طرح لڑکیوں اور اُستانیوں میں بھی معاشقے ہو جاتے ہیں۔ بعض کنواری اُستانیاں اور لیکچرارز خوبصورت لڑکیوں سے پیار کرنے لگتی ہیں اور اس طرح اپنے دبائے ہوئے جنسی جذبے کی بالواسطہ تسکین کر لیتی ہیں۔ بعض لڑکیاں اپنی خوبرو، خوش پوش، ہنس مکھ نوجوان اُستانیوں پر دل وجان سے فدا ہوتی ہیں۔ اُنہیں اپنی جانب ملتفت کرنے کے لئے عجیب و غریب طریقے اختیار کرتی ہیں۔ وہ اُنہیں روز خوابی اور خیال آرائی میں بسا لیتی ہیں، اُن جیسے بال بناتی ہیں، اُن کی پسند کے رنگوں کے کپڑے پہنتی ہیں، اُن کے باتیں کرنے اور مسکرانے کے انداز کی نقالی کرتی ہیں۔ ایک ہی اُستانی یا لیکچرر سے پیار کرنے والی لڑکیاں آپس میں رقیب بن بیٹھتی ہیں اور ایک دوسری کو اپنی محبوبہ کی نظروں سے گرانے کے لئے طفلانہ سازشیں کرتی رہتی ہیں۔ لڑکیوں کی اقامت گاہوں میں ہم جنسی معاشقے خوب پنپتے ہیں۔ اِن کی جھلک عصمت چغتائی کے ناول ٹیڑھی لکیر میں دکھائی دیتی ہے۔

عام حالات میں نوخیز خود لذتی اور ہم جنسیت کے مراحل سے گذر کر فطری تقاضوں کے تحت صنفِ نازک کی جانب مائل ہو جاتے ہیں۔ اوائل شباب میں لڑکیاں اپنے ہم سن لڑکوں سے زیادہ ذہین اور پختہ مزاج ہوتی ہیں اور اپنی عمر سے بڑے نوجوانوں کو ملتفت کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ نوخیز لڑکے رومان کی تلاش میں گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ کوئی لڑکی اُچٹتی ہوئی نظر سے اُنہیں دیکھ پائے تو اُنہیں وہم ہو جاتا ہے کہ وہ ان پر فریفتہ ہو گئی ہے۔ پھر بڑے اہتمام سے بال سنوار کر اپنا بہترین لباس زیب تن کئے لڑکی کے گھر کے باہر چکر لگانا شروع کر دیتے ہیں یا اُسی گلی میں کرکٹ کھیلنے لگتے ہیں۔ اس عمر میں وہ ایسے جذباتی خلفشار میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ ہمہ تن شوق ہونے کے باوجود لڑکی کے قریب جانے یا اُس سے بات کرنے کی جرات نہیں کرتے۔ اُن کے اِس طرزِ عمل سے لڑکیاں جھلا جاتی ہیں اور اُنہیں بچے سمجھ کر اُن سے صرفِ نظر کر لیتی ہیں۔ ٹالسٹائے اپنے اوائل شباب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے [2]

"ـــــ ایک دفعہ مجھے ایک فربہ اندام عورت سے عشق ہو گیا جو گھوڑے پر سوار مرنے تاک کے سواری سکھلانے

---

[1] اس نوع کی محبت کو اصطلاح میں CRUSH کہتے ہیں۔

[2] CHILDHOOD, BOYHOOD & YOUTH.

والے سکول میں آیا کرتی تھی۔ میں بھی ہر منگل اور جمعہ کے دن وہاں جانے لگا کہ انہی ایام میں وہ سواری کیا کرتی تھی۔ میں اُسے گھورنے جایا کرتا تھا لیکن اِس ڈر سے کہ کہیں وہ مجھے دیکھ نہ لے دور دور رہتا تھا۔ جب کبھی میں یہ محسوس کرتا کہ وہ میری جانب سے گذرے گی تو میں بھاگ نکلتا تھا۔ جب کبھی وہ میری طرف دیکھتی میں لاپرواہی سے دوسری طرف دیکھنے لگتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں اُس کا چہرہ بھی اچھی طرح نہ دیکھ سکا اور آج تک مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ عورت خوبصورت بھی تھی کہ نہیں؟

نوخیز اِس نوع کے بادِ ہوائی رومانوں کو اہم سمجھتے ہیں۔ وہ کسی درخت کے نیچے لیٹ کر روز خوابی کے عالم میں اپنی خیالی محبوبہ سے باتیں کیا کرتے ہیں لیکن عملی اقدام سے عاجز رہتے ہیں۔ ایک نوخیز کسی خوبصورت لڑکی کو ایک نظر دیکھنے کے لئے پہروں ایک جگہ کھڑا رہے گا لیکن جب وہ دور سے نمودار ہو گی اور اُس کی جانب قدم بڑھائے گی تو وہ گھبرا کر سٹک جائے گا۔ وہ سائیکل پر سوار کسی تانگے کے پیچھے آئے گا جس میں کوئی لڑکی بیٹھی ہو گی لیکن قریب آکر جھپاک سے دوسری طرف نکل جائے گا۔

نوخیز لڑکیوں کا محبوب مشغلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لڑکوں کو اپنی جانب مائل کر کے بھاگ جاتی ہیں، اگرچہ بقول ہیولاک ایلس ہرنی کی طرح دائرے میں بھاگتی ہیں، نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتیں۔ آنکھ مچولی کا یہ کھیل بعض اوقات سنجیدہ صُورت اختیار کر لیتا ہے اور جنسی کشش عشق کی آگ بن کر بھڑک اُٹھتی ہے۔ لڑکا لڑکی ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کا ہو جانے کے خواب دیکھتے ہیں۔ اِس مرحلے پر فلموں کے عشقیہ گیت اُن کے آڑے آتے ہیں، خطوط کا تبادلہ ہوتا ہے جن میں ازلی ابدی پیار کے قول ہارے جاتے ہیں اور تن من نثار کرنے کے عہد کئے جاتے ہیں محبت کی اِس منزل میں لڑکوں اور لڑکیوں کی اختراعی صلاحیتیں پورے عروج پر ہوتی ہیں اور لاکھ پابندیوں کے باوجود وہ ایک دوسرے سے ملنے کی سبیل نکال ہی لیتے ہیں۔ سہیلیاں اپنے معاشقوں میں ایک دوسری کی ہمراز بن جاتی ہیں اور اپنے عُشاق کی مُلاقات کے لئے ایک دوسری کی امداد کرتی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بوڑھی قطامہ بھی اُن کی ملاقات کے لئے راہ ہموار کر دیتی ہے۔ اِس زمرے میں نچلے اور اعلیٰ دونوں طبقوں کی عورتیں شامل ہوتی ہیں۔

البتہ اعلیٰ طبقے کی عورتیں نقد معاوضہ لینے کی بجائے نوجوان عشاق سے تمتع کرتی ہیں۔

ایک نوخیز دوشیزہ جنسی ملاپ کے تصوّر سے خائف ہوتی ہے۔ بیاہتا عورتوں سے شب عروسی کی واردات سن سن کر جہاں اُس کے ذوقِ وصال کو تحریک ہوتی ہے وہاں ڈر بھی لگتا ہے لیکن دلالہ سہیلیوں اور بوڑھی قطاماؤں کی میٹھی میٹھی باتیں بالآخر اُسے رام کر لیتی ہیں۔ فطرت کے تقاضے پورے ہوتے ہیں اور عشق و محبت کے چکر میں آکر وہ اپنی بکارت کھو بیٹھتی ہے۔ پہلے جنسی تجربے کے بعد اکثر لڑکیاں ندامت اور جرم کے شدید احساس میں مبتلا ہو جاتی ہیں اور سمجھنے لگتی ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی کی عزیز ترین متاع لُٹا دی ہے۔ بعض لڑکیاں اس لئے بھی سپردگی پر آمادہ ہو جاتی ہیں کہ وہ اپنے چاہنے والے کی خواہش پر اپنی دوشیزگی کی بھینٹ چڑھا کر اپنے سچے پیار کا ثبوت دینا چاہتی ہیں۔ انہیں یہ اندیشہ بھی لاحق ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے اپنے چاہنے والے کا مطالبہ پورا نہ کیا تو وہ انہیں چھوڑ کر کسی دوسری لڑکی سے پیار کرنے لگے گا۔ ایسے معاشقوں کا انجام اکثر لڑکیوں کے لئے المناک ہوتے ہیں۔ یہ بات مرد کی سرشت میں ہے کہ وہ ایک عورت سے فیضیاب ہونے کے بعد بھونرے کی طرح دوسری کلی کا طواف شروع کر دیتا ہے۔ بعض عیّار نوجوان شادی کا جُھانسہ دے کر لڑکیوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ جب اپنی مراد پا لیتے ہیں تو طرح طرح کے حیلے بہانوں سے اپنا پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کی بے راہ روی کی ذمّے داری بدرجۂ اولےٰ اُس کی ماں پر عائد ہوتی ہے۔ ماں اپنی لڑکی پر نظر رکھے تو وہ کبھی بھٹک نہیں سکتی۔ ماں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی نوخیز بیٹی کو غلط قسم کی پڑوسنوں اور سہیلیوں کی صحبت سے محفوظ رکھے اور جب کسی تقریب میں شرکت کرنا ہو تو بیٹی کے ساتھ جائے اور اپنے ساتھ اُسے واپس لائے۔ شادی بیاہ، عُرس، میلوں ٹھیلوں پر لڑکیوں کو بہکانے کے سامان کئے جاتے ہیں۔ یہ مشورہ متوسط گھرانوں کے لئے ہے۔ سب سے اونچے اور سب سے نچلے طبقات کی نگرانی ماؤں سے ممکن نہیں ہو سکتی۔ بعض مائیں اپنی جوان بیٹیوں کے ساتھ نہایت بے رحمی اور درشتی کا برتاؤ کرتی ہیں۔ اُن کے ہر کام میں کیڑے نکالتی ہیں، بات بات پر سرزنش کرتی ہیں، کبھی بھولے سے بھی پیار کا ایک لفظ منہ سے نہیں نکالتیں۔ ایسی ماؤں کی

بیٹیاں پیار کے لئے ترستی رہتی ہیں اور جب کوئی نوجوان اُن سے پُرجوش محبت کا اظہار کرتا ہے تو وہ بے اختیار سپردگی پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ بعض لڑکیاں جن کے والدین قیمتی ملبوسات اور پُرتکلف کھانوں کی فراہمی کی استطاعت نہیں رکھتے، روپے پیسے کے لالچ میں گمراہ ہو جاتی ہیں۔ "میری بھٹکی زندگی" کا مصنف لکھتا ہے کہ ایک دن اُس نے ایک ایسی ہی لڑکی سے پوچھا کہ تم غیر مردوں کے پاس کیوں جاتی ہو۔ لڑکی نے جواب دیا میری ماں بہت غریب ہے اور مجھے کیک خرید کر نہیں دے سکتی۔ مجھے کیک کھانے کا شوق ہے جسے پورا کرنے کے لئے میں مردوں کے پاس جاتی ہوں۔

شباب کی سرحد میں قدم رکھتے ہی لڑکی کو دو پریشانیاں لاحق ہو جاتی ہیں، رُومان کی تلاش اور شادی کی تمنّا۔ وہ کسی قسم کے تعلّق کا رُومانی عنصر کے بغیر تصوّر ہی نہیں کر سکتی۔ اُس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ جو نوجوان اُس سے پیار کرتا ہے وہ ہمیشہ کے لئے اُس کا ہو جائے۔ ایک نوجوان لڑکی کا واحد نصب العین کسی خوبصورت، متموّل پیار کرنے والے نوجوان سے بیاہ کرنا ہوتا ہے۔ جس لڑکی کی منگنی نہ ہو پائے وہ اپنے آپ کو 'بے روزگار' محسوس کرنے لگتی ہے اور بے روزگاروں ہی کی طرح ذہنی پریشانی اور جذباتی خلفشار میں مُبتلا ہو جاتی ہے۔ پیام آنے میں دیر ہو جائے تو وہ خود عشق و محبت کے توسّط سے اپنی شادی کا اہتمام کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ کسی نوجوان سے محبت کر کے وہ اپنی سہیلیوں پر یہ واضح کر دینا چاہتی ہے کہ میں بھی کسی سے ہیٹی نہیں ہوں مجھ پر بھی کوئی مرتا ہے۔ اِس نوع کے معاشقے بسا اوقات سنگین صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ یہاں میں اپنے مشاہدے سے ایک مثال دوں گا۔

سلیم —— نام فرضی ہے —— میرے ایک دوست کا چھوٹا بھائی تھا اور ایک خوشحال مُعزز گھرانے کا فرد تھا۔ وہ میری جماعت میں داخل ہوا تو اُس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ گٹھا ہوا مضبوط جسم، چہرے پر شباب کی سُرخی، آنکھوں میں اعتمادِ نفس کی جھلک تھی۔ خاندانی روایات کے مطابق اُس نے اپنی مونچھیں بڑھالی تھیں جس سے اُس کے چہرے پر مردانگی کے آثار دکھائی دیتے تھے۔ ایک دو ماہ تو وہ باقاعدگی سے کالج آتا رہا اور کام کرتا رہا اس کے بعد غائب ہو گیا۔ ایک دن میں نے اُس کے بڑے بھائی سے اُس کی طویل غیرحاضری کا سبب پوچھا تو اُس نے بیزاری سے اپنے کندھے جھٹکائے

اور موضوعِ گفتگو بدل دیا۔ مجھے اُس کی یہ حرکت ناگوار گذری کہ یہ کیسا بھائی ہے جسے اپنے چھوٹے بھائی کا ذکر تک گوارا نہیں ہے۔ کم و بیش ایک برس کے بعد ایک دن اچانک سلیم کا بڑا بھائی میرے آیا۔ رہ سخن: بگڑا یا ہوا تھا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے مجھے جو قصہ سُنایا وہ مختصراً درج ذیل ہے۔

دو سال گذرے سلیم کے پڑوس میں ایک کھاتا پیتا گھرانا آکر ٹھہرا جس کی ایک لڑکی بڑی خوبرو اور شوخ و شنگ تھی۔ لڑکی کے مکان کی ایک کھڑکی گلی میں کُھلتی تھی جس پہ پردہ پڑا رہتا تھا۔ سلیم گلی میں سے گذرتا تو یہ پردہ ہلنے لگتا۔ چند روز کے بعد یہ پردہ ہلتے ہلتے اُٹھنے لگا اور لڑکی سامنے کھڑی ہونے لگی۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ سلیم کے چکروں میں اضافہ ہوگیا، آنکھوں ہی آنکھوں میں اظہارِ شوق ہُوا، لبوں پر مسکراہٹیں کھیلنے لگیں، اشارے ہوئے، سلام ہوئے اور پھر رقعوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ ایک رات کو سلیم لڑکی کی دعوت پر کھڑکی کے اندر کود گیا اور یہ رومان اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا ــــ یہ ساری باتیں افشائے راز اور فضیحتے کے بعد سلیم نے اپنے بھائیوں کو بتلائی تھیں ــــ اس دوران میں لڑکی نے سلیم سے کہا کہ کیوں نہ ہم عُمر بھر کے لیے ایک ہو جائیں۔ اُس نے یہ بھی بتلایا کہ اُس کی امّی سب کچھ جانتی ہے اور کہتی ہے کہ تم دونوں کا آپس میں بیاہ نہ ہوا تو بڑی رُسوائی ہوگی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ لڑکی کی ماں نے لڑکی کی ہمت افزائی کی تھی تاکہ عشق و محبت کے عنوان سے اُس کا رشتہ سلیم سے طے پا جائے۔ سلیم نے جواب میں کہا میں بے بس ہوں، شادی کے بارے میں فیصلہ امّی جان اور بڑے بھائی کریں گے۔ یاد رہے کہ سلیم کا باپ فوت ہو چکا تھا۔ اِس نوع کے معاشقے طشت اَز بام ہو ہی جایا کرتے ہیں چنانچہ محلّے میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک دن لڑکی کی ماں سلیم کی امّی کے پاس گئی اور اُسے سارا کچا چٹھا کہہ سُنایا اور کہا کہ اگر سلیم کی شادی اُس کی بیٹی سے نہ ہوئی تو وہ کہیں کے نہ رہیں گے۔ یہ سُن کر سلیم کی امّی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُس نے کہا تم اپنی بیٹی کو سنبھال کر رکھو ہم کسی دباؤ میں آکر رشتہ نہیں کریں گے اور پھر ہمارا ارادہ سلیم کو اپنے ہی عزیزوں میں بیاہنے کا ہے۔ اِس پر اِن میں تکرار ہوگئی جیسی کہ صرف عورتوں ہی میں ہو سکتی ہے اور اُن کی چیخیں گھر کے باہر گلی میں بھی سُنائی دینے لگیں۔ لڑکی کی ماں

کہتی تھی کہ تمہارا بیٹا بدمعاش ہے، آوارہ ہے جس نے میری بیٹی کو ورغلا کر غارت کیا ہے۔ سلیم کی امی نے کہا تم اور تمہاری بیٹی دونوں چھنال ہو اور تم نے میرے بیٹے کو پھانسنے کے لیے یہ ڈھونگ رچایا ہے۔ لڑکی کی ماں لڑ بھڑ کر اپنے گھر چلی گئی۔ اب بات زیادہ بڑھ چکی تھی اور اس پر پردہ ڈالنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اُسے یہ خوف ستانے لگا کہ اگر لڑکی کے ابا نے کہیں باہر سے یہ بات سُن پائی تو وہ پنجے جھاڑ کر اُس کے پیچھے پڑ جائے گا کہ تم نے جانتے بوجھتے ہوئے مجھے خبر کیوں نہ کی چنانچہ اپنے بچاؤ کے لئے اُس نے رو رو کر اپنے شوہر کو ساری رام کہانی کہہ سُنائی۔ اُس کا شوہر غضبناک ہو گیا۔ اُس نے اپنی بیٹی کی خوب دھنائی کی، اُسے ایک کمرے میں بند کر دیا اور دو ایک لاتیں بیوی کو بھی رسید کر دیں۔ اُس کا پولیس میں رسوخ تھا۔ اُس نے پولیس والوں سے مل کر منصوبہ بنایا کہ سلیم کو کسی چکر میں لا کر اُسے اُس کی نابکاری کی عبرت ناک سزا دلائی جائے۔ ایک دن جب کہ سلیم کے بھائی کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور سلیم بھی گھر میں نہیں تھا لڑکی کے باپ نے محلے کی خاکروبہ کو کچھ دے دلا کر سلیم کے گھر میں اپنا ایک قیمتی ریڈیو سیٹ رکھوا دیا اور پولیس میں سرقے کی رپورٹ درج کرا دی۔ پولیس نے چھاپہ مار کر "مسروقہ مال" برآمد کر لیا اور سلیم کو گرفتار کر لیا۔ حوالات میں سلیم کو اس بے دردی سے زد و کوب کیا گیا کہ وہ چند روز کے لئے چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گیا۔ اس پٹائی کے ہفتہ عشرہ بعد میں نے اُسے دیکھا تو بہ مشکل اُسے پہچان سکا۔ مقدمہ کا چالان عدالت میں پیش ہوا تو سلیم کا بڑا بھائی ہانپتا کانپتا ہوا میرے پاس آیا۔ ساری روئداد کہہ سُنائی اور مجھ سے استمداد کی کیوں کہ اُن دنوں میرا ایک عزیز اُس شہر میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ میں اسے ساتھ لے گیا اور عزیز موصوف کو سارا قصّہ کہہ سُنایا۔ اتنے میں سلیم کے دوسرے بھائی اُسے ضمانت پر رہا کرانے کے لئے دوڑ دھوپ کرنے لگے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ سلیم کو لڑکی سے معاشقہ کرنے کی سزا دی گئی ہے۔ سلیم کے بھائیوں نے لڑکی کے رُقعے میرے عزیز کو دکھائے جو اُس نے وقتاً فوقتاً سلیم کو لکھے تھے اور اُس کے بکس میں پائے گئے تھے۔ ان میں کچھ میرے پاس محفوظ ہیں۔ حکام متعلقہ نے لڑکی کے باپ سے کہلوایا کہ مقدمہ جاری رہا تو اخباروں میں اِس کی

کاروائی چھپنے لگے گی اور جس نے نہیں سُنا اُسے بھی علم ہو جائے گا۔ لڑکی کے رُقعے عدالت میں پیش کئے جائیں گے اور آپ کی بیوی اور بیٹی کو بھی وکیلوں کی جرح کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان حالات میں بہتر ہوگا کہ آپ صلح کر لیں، سلیم کو اپنے کئے کی سزا کافی مِل چکی ہے۔ لڑکی کا باپ مان گیا اور فریقین کی صلح پر اِس قضیئے کا خاتمہ ہو گیا۔

اِس واقعے میں باقی باتیں تو وہی ہیں جو اِس نوع کے معاشقوں میں عام طور سے پیش آتی ہیں۔ ایک بات غور طلب یہ ہے کہ لڑکی کی ماں بھی اِس میں ملوّث تھی۔ اِس سے راقم الحروف کے اِس خیال کو تقویت ہوئی کہ کوئی لڑکی اپنی ماں سے چھپاکر معاشقہ نہیں کر سکتی۔ بعض مائیں مصلحتاً خاموش رہتی ہیں کہ لڑکی کو سرزنش کی تو وہ بھاگ جائے گی یا خودکشی کرلے گی اور بعض شوہروں کے ڈر سے چپ رہتی ہیں۔ بہرحال مائیں دانا و بینا ہوں تو اُن کی بیٹیاں بڑی حد تک اِس نوع کی رسوائی سے محفوظ رہتی ہیں۔

نوخیز عشق و محبت کے عالم میں کیا کچھ محسوس کرتے ہیں اس کا اندازہ اِس لڑکی کے رُقعوں سے لگایا جاسکتا ہے جن سے چند اقتباسات ذیل میں دیئے جاتے ہیں۔

"—— میرے محبوب شہزادے! سدا کامیابی آپ کے قدم چومے آمین! ہم تم سے جُدا ہو کر مر جائیں گے رو رو کر..... بدنصیبی۔ سلام حسرت سے

میری تمنّائیں مرگئیں میرے محبوب   رگوں میں زہریلی بوندیں اُتر گئیں میرے محبوب[1]

افسوس..... میری اُمیدوں کے چمن..... کیا اب یہ چمن اُجڑ جائے گا..... آپ چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ مجھے اچھا نہیں سمجھتے۔ پھر آپ سوچنے لگیں گے کہ یہ اس نے کیوں لکھا۔ وہ مسئلہ میں حل کئے دیتی ہوں سُنیئے! آرزوں کا مرکز! بدنصیبی، ناکامی، بے عزتی، رسوائی، بے مروّتی، نفرت۔ اب لکھتی ہوں میرے محبوب! آپ نے آج تک میری کوئی بات نہیں ٹھکرائی تھی مگر افسوس کہ کل کا دن میری آرزوؤں

---

[1] یہ نوخیزوں کی آدھ کچری شاعری کا نمونہ ہے۔

کے خون کا دن تھا۔ اِس کے بعد کوئی آرزو نہیں ہو گی۔ کبھی نہیں.... کبھی نہیں ..... ہو گی۔ کل میں نے آپ کو جو چیز بھی دینی چاہی آپ نے ٹھکرا دی۔ آپ نے میری چیز کو نہیں ٹھکرایا بلکہ مجھے ٹھکرا دیا ہے۔ جس وقت آپ نے کہا تھا کہ میں نہیں لوں گا اُس وقت ہی میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ کوئی کیا سمجھے کہ پھر کتنا روئی مگر کسی کو کیا پروا؟ کوئی روئے مرے یا غرق ہو جائے میری آج تک خوش قسمتی تھی۔ آپ نے آج تک میری کوئی بات نہیں ٹھکرائی تھی مگر اب آپ نے وہ سہانی اُمید مجھ سے چھین لی ہے۔ آپ کی مرضی۔ میں خُود جل رہی ہوں، میرا دل رو رہا ہے آپ کی بے اعتنائی پر اور پھر جس بے نیازی سے آپ گلی سے واپس گئے تھے وہ بھی میں جانتی ہوں۔ میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں آپ کی عادات کو۔

جانِ تمنّا! آپ جب بھی آئیں میری نظریں ہمیشہ آپ کے چہرے پر ہوتی ہیں۔ جب آپ پہلی بار آئے تھے جب کہ میں نے پہلا خط دیا تھا اُس وقت آپ کے تاثرات اور تھے مگر جب آپ نے انکار کیا اُس وقت مختلف تھے۔ جانِ من! چہرہ دل کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ میں تو چہرہ دیکھ کر ہی سب کچھ سمجھ لیتی ہوں۔ میں جانتی ہوں دُنیا میں بہت زیادہ حسین لڑکیاں ہیں اور دولت مند بھی مگر میرے محبوب! آپ کو دولت بھی مِل جائے گی اُن سے اور خوبصورتی بھی مگر حقیقی خلوص نہیں مِلے گا۔ میں خوبصورت نہیں ہوں امیر بھی نہیں ہوں مگر میرے پاس خلوص ضرور ہے مگر اِس کی آپ کو ضرورت نہیں۔ آپ کے اِس رویّے نے میرا دل توڑ کر رکھ دیا ہے۔ آپ نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ آپ کی تحریر سے کچھ ظاہر ہوتا ہے اور آپ کے رویّے سے کچھ اور ظاہر ہوتا ہے۔ مجھے آج تک فخر تھا آپ پر کہ آپ نے میری بات نہیں ٹھکرائی جس کسی کو پتہ تھا ہمیشہ اسے یہی کہا کرتی تھی کہ میرا محبوب اتنا اچھا ہے کہ آج تک اُس نے میری کوئی بات نہیں ٹھکرائی۔ اگر میں کہتی ہوں کہ

دن ہے تو وہ کہتا ہے کہ دن ہے اگر میں کہتی ہوں رات ہے تو وہ کہتا ہے رات

ہے مگر کل وہ فخر خاک میں مل گیا۔ اب کیا ہو سکتا ہے وقت گذر گیا دل ٹوٹ گیا مگر زخم

جو لگ گیا ہے وہ ہمیشہ تازہ رہے گا وہ کبھی نہیں مٹ سکے گا ؎

اپنا دکھ ہے جیون بھر کا پل دو پل کی بات نہیں۔ روٹھنے سے جو کٹ جائے گی ایسی تو یہ رات نہیں

بلکہ تمام زندگی کا رونا ہے۔ میرے محبوب کر لو ذلیل ٹھکرا لو کہ پھر شائد وقت کبھی ہاتھ نہ

نہ آئے۔ مجھے ہر روز اپنی سہاؤنی شکل ضرور دکھایا کرو۔ میرے دیکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ

دنیا میں بہت زیادہ حسین لڑکیاں ہیں ؎

جب ہوا چلتی ہے پتّے ٹوٹ جاتے ہیں جب نئے ساتھ ملتے ہیں پرانے چھوٹ جاتے ہیں۔"

" ——— میرے سویٹ شہزادے سدا مسکراؤ ؎

تمہارا نام ہے عنواں میرے فسانے کا تمہارے نام سے پہلے کسی کا نام نہیں

سلام پرخلوص! سنائیے جناب کل کہاں سارا دن غائب رہے گو کہ مجھے خود بڑی سر دی

لگ گئی تھی کچھ نہ پوچھئے مگر پھر بھی میں نے شام کے قریب کھڑکی سے دیکھا تھا مگر آپ

مجھے کہیں نظر نہیں آئے۔ کیا وجہ تھی جان تمنا! کچھ سوچا بھی ہے کہ نہیں، کیوں آپ

اتنی بے نیازی سے کام لے رہے ہیں۔ مجھے آپ کی باتوں کی کچھ سمجھ نہیں آتی جناب کا

خود میرے ساتھ شادی کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ اگر ارادہ ہو تو پھر آپ کچھ کام نہ کریں!

آپ تو ہر روز یونہی وقت ضائع کر دیتے ہیں۔ کسی کے مستقبل کا فیصلہ ہے مگر آپ نے

شائد مذاق سمجھ رکھا ہے۔

نوٹ:۔ میں رومال دے رہی ہوں استعمال کیجیے رکھنے کے لئے نہیں آپکو میری قسم استعمال کیجیے ؎

چُن لیا میں نے تمہیں سارا جہاں رہنے دیا

جانِ آرزو! اب بتائیں کب آنا ہے۔ اگر بارش نہ ہوئی تو پھر آج رات ضرور تشریف

لائیں میں انتظار کروں گی۔ ۱ بجے ہی آنا ہو گا۔ مجھے آپ پر اعتماد ہے کہیں میرے اعتماد

کو ٹھیس نہ پہنچائیں۔ اب اجازت دیجیے خدا حافظ! میرے محبوب!"

"______ میرے دلربا شہزادے! سدا مسکراؤ —

یہ ہماری بدنصیبی جو نہیں تو اَور کیا ہے   ہم اُس کے ہو گئے جو نہ ہو سکا ہمارا

سلام انتظار! اگر ہم عرض کریں گے تو شکایت ہو گی۔ ہاں جی یہ سُن لیجیے کہ آج رات کو اُسی وقت اُسی راستے آنا ہو گا کیوں کہ میرے ابا جان باہر گئے ہوئے ہیں اور کل آئیں گے۔ یہ اتنا حسین موقع نہ کھو دینا..... آپ میری ہر بات کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ پہلے جیسی آپ کے دل میں میری قدر نہیں رہی۔ یہ آپ کا حق ہے کہ آپ مجھے مٹی میں بھی ملا دیں۔ پہلے میری بات پوری کی جاتی تھی اب دس خط لکھوں تو ایک کا جواب۔ شکوہ کرنا بیکار ہے۔ یہ آپ صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ میرا دل نہیں چاہتا اب تمہارے ساتھ بولنے کو۔"

اوائلِ شباب میں بعض لڑکے اپنی عمر سے کہیں بڑی عورتوں سے محبت کرنے لگتے ہیں اور بعض لڑکیاں اُدھیڑ عمر کے مردوں سے پیار کرنے لگتی ہیں[1]۔ علمائے نفسیات کہتے ہیں کہ ایسا لڑکا اپنی محبوبہ میں بہ یک وقت اپنی ماں اور محبوبہ کی جستجو کرتا ہے اور لڑکی اپنے محبوب میں باپ کو تلاش کرتی ہے۔ اس کی معروف مثال میرین کا گوئٹے سے عشق ہے۔ میرین نوعمر دوشیزہ تھی جب کہ گوئٹے اِس وقت ساٹھ برس سے متجاوز تھا۔ میرین نے اپنی نظموں میں بڑے پُرجوش انداز میں گوئٹے سے اظہارِ محبت کیا ہے۔ میں ایک نوجوان کو جانتا ہوں جو اپنی عمر سے کہیں بڑی ایک بیاہتا عورت کے عشقِ جنوں پرور میں مبتلا ہو گیا۔ اِس عورت کا شوہر اعلےٰ عہدے پر فائز تھا۔ اُسے اپنے گھر میں ہر قسم کی آسائش میسّر تھی اور اُس کے بچے سکول جانے کی عمر کے تھے۔ وہ اِس نوجوان کے ساتھ ہوٹلوں میں جایا کرتی لیکن اُس کا رویّہ عجیب و غریب تھا۔ وہ اُس نوجوان کی ہزار کوششوں کے باوجود سپردگی پر آمادہ نہیں ہوتی تھی اور کہا کرتی تھی کہ میں اپنے شوہر کی امانت میں خیانت نہیں کروں گی۔ جب وہ نوجوان پوچھتا کہ تم میرے

---

[1] اصطلاح میں اِسے CALF-LOVE کہتے ہیں۔

ساتھ ہوٹلوں میں جاتی ہو، باغوں میں گھومتی پھرتی ہو، مجھے گلے لگ کر ملتی ہو، مجھے بوسے دیتی ہو، کیا اس طرح امانت میں خیانت نہیں ہوتی تو وہ مسکرا دیا کرتی تھی۔ اس نوجوان کی شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ اُس پر دن رات مدہوشی کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ وہ اُسے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا اور ہجر و وصال کے آشوب میں پڑا جلتا تھا۔ ایک دن مشورے کے دوران میں وہ اپنی محبوبہ کو میرے پاس لے آیا۔ وہ ایک خوش پوش، گول مٹول، خوبصورت عورت تھی جس کے جسم کے زاویوں کا تناسب ابھی باقی و بحال تھا۔ وہ بہانے سے اُٹھ کر چلا گیا تو میں نے اُس عورت سے پوچھا "کیا آپ کو اِس نوجوان سے کچھ بھی ہمدردی اور اُنس نہیں ہے؟" وہ بولی "ہے تو" میں نے کہا "تو آپ اِس سے ملنا ترک کر دیں۔ اِس سے بڑا احسان آپ اِس پر اور کوئی نہیں کر سکیں"۔ وہ خفیف سی ہو کر میری باتیں سُنتی رہی اور گومگو کے عالم میں اُٹھ کر چلی گئی۔ اس کے بعد بھی وہ اُس بے چارے سے بلّی چوہے کا کھیل کھیلتی رہی۔ معلوم ہوا کہ اِس عورت کا شوہر ایک بدصورت ٹھنگنا سا آدمی تھا جب کہ اُس کا چاہنے والا خوش رو کشیدہ قامت جوانِ رعنا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنی جنسی تشفّی اپنے شوہر سے کرتی ہے اور ذوقی تسکین کے لئے اِس نوجوان کے پاس آتی ہے۔ اس عشق کا انجام ناکامی اور نامُرادی پر ہوا۔ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ اگر یہ عورت سپردگی پر آمادہ ہو جاتی تو وہ نوجوان کبھی کا اُسے چھوڑ کر کنارہ کشی کر لیتا۔ وہ ایک کائیاں عورت تھی اور یہ بات جانتی تھی اِسی لئے رُومان کو طُول دے رہی تھی۔ نوجوان نے ایک دن مجھے بتایا کہ وہ اُدھیڑ عُمر کی گول مٹول عورتوں میں بے پناہ کشش محسوس کرتا ہے۔ ایک دن وہ کہنے لگا کہ اِس عورت سے متعارف ہونے سے قبل وہ ایک عورت سے غائبانہ پیار کرتا رہا جو اپنے بچوں کو سیر کرانے کے لئے روزانہ مال روڈ پہ آیا کرتی تھی۔ باتوں ہی باتوں میں اُس نے بتایا کہ اُس کی ماں نے اس سے کبھی بھی پیار نہیں کیا جس کے لئے وہ بچپن میں ترستا رہا تھا۔ اِس انکشاف سے بات کُھل کر سامنے آگئی۔ وہ ادھیڑ عمر عورتوں میں محبت اور مامتا دونوں کی تلاش کیا کرتا تھا۔

نوخیزوں کو بڑے بڑے کٹھن مسائل اور اُلجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مساعد حالات میں بھی وہ بلاغت کے آشوب سے محفوظ نہیں رہ سکتے اور حالات نامساعد ہوں تو بعض اوقات اُنہیں ایسے

کرب ناک اور رُوح فرسا تجربات ہوتے ہیں کہ جن کے اثرات اُن کی ساری زندگی کو مسموم کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر مَیں یہاں ایک لڑکی کی سرگذشت مختصراً بیان کروں گا جس نے سال ہی میں مجھ سے مشورہ لیا تھا۔ زرینہ ـــــ یہ نام فرضی ہے ـــــ ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئی۔ وہ سُرخ اور سفید خوب رُو لڑکی تھی اور کئی بھائیوں کی ایک بہن تھی۔ وہ دس برس ہی کی عمر میں بالغ ہو گئی۔ لکھتی ہے۔

"ـــــ میں دس برس کی عمر ہی میں جوان ہو گئی۔ اُن دنوں امیّ سخت بیمار تھیں اور میری خالہ جو مجھ سے چند سال بڑی ہی آئی ہوئی تھیں۔ اُنہوں نے مجھے سمجھایا۔ چند بڑی عمر کی لڑکیوں نے بتایا تھا۔ میں نے امیّ سے چھپایا مگر اُنہیں پتہ چل گیا۔ وہ بہت روئیں، یقین نہ آیا اور مجھے ایک ماہر انگریز لیڈی کے پاس لے گئیں، معائنہ کرایا۔ وہ بھی حیران رہ گئی۔"

زرینہ کے مصائب کا آغاز اِسی وقت سے ہوا۔ ایک دفعہ اس کی امیّ کو کسی کام کے لئے کسی دوسرے شہر کو جانا پڑا۔ زرینہ گھر میں اکیلی رہ گئی۔ انہی ایام میں اس کے سگے ماموں نے اس بھولی بھالی لڑکی کو بہلا پھسلا کر اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ جب اس کے بڑے بھائی کو اِس بات کا علم ہوا تو وہ بھی اپنی بہن کی آبرو ریزی پر کمربستہ ہو گیا اور یہ سلسلہ دور تک چلا گیا۔

"ـــــ میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ درندوں اور لٹیروں کا ماحول تھا۔ میں کس جگہ سے بتاؤں کہ میرا سگا بھائی، سگا ماموں، سگا چچا مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بناتے رہے۔ میں کچھ نہیں جانتی کہ یہ حادثہ کب اور کس طرح پیش آیا اور نہ ہی اِن حادثات کی تعداد کا اندازہ ہے۔ میں آپ کو ان دنوں کی ذہنی کیفیت رتی رتی بتا سکتی ہوں۔ ان باتوں کو اتنی کم عمری میں کیونکر سمجھتی تھی کہ یہ بُری اور گناہ ہیں۔ پھر بھی کسی کو بتا نہیں سکتی تھی۔ ہاں چند ہم جولیاں اور ایسی لڑکیاں جو خود ان باتوں سے دو چار تھیں، واقف تھیں میری مصیبتوں سے۔ مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان کے ذہن پر تو میری طرح بوجھ نہ رہتا تھا۔ وہ تو میری طرح پریشان ہو کر خود کو بچانے کے ایسے جتن نہ کرتی تھیں جب کہ ماضی کے یہ روپ سامنے آتے ہیں تو جنس سے نفرت ہو جاتی ہے۔ یقین کیجئے کہ میں نے

ایسے ہوسناک بھیانک چہرے دیکھے ہیں کہ میں آج بھی کانپ اُٹھتی ہوں۔"

زرینہ کی ماں گھر لوٹی تو زرینہ کے ماموں نے زرینہ کے بھائی کی شکایت کی اور اپنی بہن کو بیٹے کے خلاف خوب بھڑکایا۔ زرینہ کی ماں نے بیٹی سے پوچھ گچھ کی کہ تمہارا ماموں یہ کہتا ہے۔ زرینہ نے رو رو کر کہا کہ وہ خود بھی تو ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔ یہ سُن کر زرینہ کی ماں بیٹی کو گلے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مشورے کی ابتدا میں مجھے شک تھا کہ زرینہ جنس زدہ[1] ہے اور جو بھی مرد اس سے مخاطب ہوتا ہے وہ اس کے بارے میں خیال ہی خیال میں فرض کر لیتی ہے کہ میرا اس سے جنسی تعلق ہے لیکن بعد میں مجھے یقین آ گیا کہ جو کچھ اس نے لکھا ہے حرف بہ حرف صحیح ہے۔

سکول اور کالج میں زرینہ بڑی ذہین اور قابل سمجھی جاتی تھی اور ادبی ذوق سے بہرہ وافر رکھتی تھی۔ اُس کے افسانے شائع بھی ہوئے ہیں۔ کالج جا کر اُسے جنسیات کے بارے میں کتابیں پڑھنے کا شوق بھی پیدا ہو گیا۔ اُس نے تحلیل نفسی میں بھی کچھ شُدبُد پیدا کر لی۔ اس زمانے میں اُسے خود کاری اور ہم جنسی اختلاط کے تجربات بھی ہوئے۔ اوائل شباب کے تلخ واردات کے باعث جنس کے بارے میں اُس کا نقطۂ نظر مریضانہ ہو گیا۔ احساس جرم کی تلخی اور ذہنی کرب ناکی سے نجات پانے کے لئے اُس نے ایک نام نہاد "ماہر نفسیات" سے رجوع کیا جو اخباروں اور رسالوں میں جنسی مسائل پر مشورے دیتا ہے۔ جب زرینہ نے اپنی روداد اس عطائی کو لکھ کر بھیجی تو وہ نفسیاتی مشورے کے پردے میں خود اُس سے اظہار عشق کرنے لگا۔ اُس نے زرینہ کو بار بار لکھا کہ جنسی خواہش کی تندی و تیزی سے نجات پانے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ فوری طور پر اُس کی آسودگی کی جائے۔ اُس نے زرینہ کو خود کاری اور فرزجہ کرنے کے طریقے بھی بتائے اور اُن پر عمل کرنے کی تلقین کی۔ زرینہ کہتی ہے کہ کچھ عرصے کے بعد یہ حضرت اُس کے شہر میں آئے، ایک ہوٹل میں ٹھہرے اور اُسے بُلا بھیجا۔ زرینہ اُس سے ملنے کے لئے چلی گئی۔ 'ماہر نفسیات' کو زرینہ کے ماضی کا علم تو تھا ہی اُس نے کسی جھجک کے بغیر اُس سے اظہار مدعا کیا اور چند فحش تصویریں دکھا کر اُسے سپردگی پر آمادہ کر لیا۔

---

[1] EROTOMANIAC

ستم ظریفی یہ ہوئی کہ جنابِ ماہرِ نفسیات، خود کوتاہ ہمت نکلے اور بالفاظ سعدی شیرازی درحملۂ اول عصائے شیخ بشکست۔ زرینہ نفرت اور حقارت کے جذبات لے کر واپس لوٹی۔ بقول اُس کے
"اپنی توقعات کے محل مسمار کرکے اور خود پر ایک اور داغ لگا کر واپس لوٹ آئی۔"
اِس بات کا ذکر زرینہ نے اپنی چند سہیلیوں سے کیا جو اِس ماہرِ نفسیات سے مشورے لیا کرتی تھیں۔ اِن سب نے مل کر منصوبہ بنایا کہ اِس عطائی کو اخباروں میں بے نقاب کیا جائے۔ زرینہ نے ماہرِ نفسیات کو لکھا کہ ہمیں آپ کی اصلیت کا علم ہو گیا ہے، دوسری لڑکیوں کو تمہارے چنگل سے بچانے کے لیے تمہارے خلاف مُہم چلائی جائے گی۔ اِس پر اُس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اور اُس نے بڑی عاجزی سے لکھا کہ خُدارا مجھ پر رحم کرو نہیں تو میں مُلک چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں گا یا کسی تکیے پر مجاور بن کر بیٹھ رہوں گا۔ زرینہ کو رحم آ گیا اور اُس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا البتہ مجھے اُس کا نام اور پتہ بتا کر کہا کہ آپ اُسے بے نقاب کرنا چاہیں تو میں اُس کے خطوط آپ کو دے دوں گی لیکن یہ ملک تو اِس نوع کے بے سواد عطائیوں سے بھرا پڑا ہے جو نفسیات کی ابجد سے بھی ناواقف ہیں لیکن دھوم دھڑلے سے تحلیلِ نفسی اور مابعد النفسیات کے چکر چلا رہے ہیں۔ میں کس کس کی نشان دہی کروں گا۔
زرینہ نے ایک ڈاکٹر کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اُس کے کان میں درد رہتا تھا۔ ایک دن وہ اپنی ایک سہیلی کو ساتھ لے کر ایک ڈاکٹر کے یہاں گئی۔ کمپوڈر نے اُس کی سہیلی کو باتوں میں لگا لیا اور زرینہ ڈاکٹر کے کمرے میں چلی گئی۔ اُس وقت کوئی دوسرا مریض وہاں موجود نہیں تھا۔ زرینہ کہتی ہے کہ مجھے دیکھ کر ڈاکٹر کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اُس نے کہا آپ کے مرض کی تشخیص کے لیے ضروری ہے کہ میں آپ کا پورا ملاحظہ کر لوں، آپ لباس اُتار دیں۔ زرینہ اُس کی نیت کو بھانپ گئی اور کہا نہیں آپ میرے کان کا معائنہ کریں۔ ڈاکٹر مصر ہوا کہ کان کے پٹھوں کا دوسرے اعضاء سے بھی تعلق ہوتا ہے اس لیے سارے جسم کا معائنہ ضروری ہے۔ زرینہ نے انکار کیا تو ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر اپنی باہیں اُس کے گلے میں حائل کر دیں اور محبت کا اظہار کرنے لگا۔ زرینہ نے غصے سے اُس کے ہاتھ جھٹک دیئے اور اُسے سخت سست کہا تو ڈاکٹر فرش پر دوزانو بیٹھ گیا اور گڑگڑا کر کہنے

لگا "خدا کے لیئے یہ بات کسی کو نہ بتایئے گا۔ مجھ سے سخت حماقت ہوئی۔ میں معافی چاہتا ہوں" اور وہ زرینہ کے قدموں میں گر کر گھگھیانے لگا۔ زرینہ کہتی ہے کہ میں نے اُس مسخرے کو معاف کر دیا اُس نے بتلایا کہ یہ ڈاکٹر شاعر بھی ہے پھر مجھے اُس کا نام بتلا کر پوچھا کیا آپ اُس کو جانتے ہیں میں نے مصلحتاً نفی میں جواب دیا لیکن ساتھ ہی کہا شاعر ڈاکٹروں کے پاس نہ جایا کرو خدا معلوم کب ڈاکٹری کرتے کرتے شعر کہنے لگیں یا شعر کہتے کہتے ڈاکٹری کرنے لگیں۔

زرینہ کی سرگذشت سے بلوغت کی اُلجھنیں اور معاشرے کے ناسُور سامنے آجاتے ہیں جیسا کہ زرینہ نے لکھا ہے کئی لڑکیاں اپنے ہی عزیزوں کی ہوس کا نشانہ بن جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ہوس کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے تو محرمات بھی اُس کی زد میں آجاتی ہیں۔ ابن حزم لکھتا ہے[1]:

"ایک بدوی عورت اپنے کسی عزیز سے حاملہ ہو گئی۔ کسی نے پوچھا "ہند! تیرے شکم میں کیا ہے۔ وہ بولی "یہ پھل ہے تکیوں کے قریب ہونے کا اور رات کے طویل ہونے کا۔"

ماں کے لیئے ضروری ہے کہ وہ اپنی کنواری جوان لڑکیوں کو اپنے سے جُدا نہ ہونے دیں۔ چچازاد، ماموں زاد وغیرہ سے بطور خاص احتیاط لازم ہے۔ اِس کے بارے میں معمولی سی غفلت لڑکی کے لیئے عمر بھر کی ذہنی و جذباتی اذیت کا سبب بن جاتی ہے جیسا کہ زرینہ کے احوال سے ظاہر ہے۔ بلوغت کے ابتدائی دَور میں نوخیزوں سے ذمے دارانہ رویّے کی توقّع کرنا عبث ہے۔

ہمارے زمانے کے اوائل شباب اور شباب کے مسائل اکثر و بیشتر صنعتی معاشرے کی پیداوار ہیں۔ قبائلی اور زرعی معاشرے میں جونہی ایک لڑکا شباب کی سرحد میں قدم رکھتا ہے اُسے بالغ تسلیم کر کے اُس کا بیاہ کر دیا جاتا ہے۔ لڑکے بچپن ہی میں پیشہ وروں کے پاس شاگرد بٹھا دیے جاتے ہیں اور نوعمری ہی میں اُن کی شادی کر دی جاتی ہے۔ آج بھی ہمارے دیہات میں جب ایک لڑکا ہل چلانے لگتا ہے تو اُسے بالغ سمجھ کر اُس کا نکاح کر دیتے ہیں۔ اِسی طرح لوہاروں، بڑھیوں، نائیوں، موچیوں

---

[1] طوق الحمامہ

کے بیٹے اوائل عمر ہی میں کمانا شروع کر دیتے ہیں اور اُن کا نکاح کر دیا جاتا ہے۔ صنعتی انقلاب کے شیوع اور تعلیم و تربیت کے رواج سے صورتِ حالات بدلتی جا رہی ہے۔ نوجوانوں کو تعلیم و تربیت کے مراحل طے کرنے کے لیے کئی برس درکار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر یا انجینئر بننے یا تکنیکی پیشہ وارانہ تربیت کے حصول میں لڑکوں اور لڑکیوں کو طویل عرصے تک مُجرّد رہنا پڑتا ہے اور لیسا اوقات تیس بتیس برس کی عمر تک شادی کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ تیرہ چودہ برس کی عمر کا لڑکا لڑکی بالغ ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ چودہ پندرہ برس تک وہ تجرّد کی زندگی گذارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہی وہ طویل وقفہ ہے جس میں وہ گُوناگُوں اُلجھنوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اِس دوران میں اکثر نوجوان خود کاری سے رجوع لاتے ہیں جس سے اُن کی صحت پر ناخوشگوار اثر پڑتا ہے یا کسبیوں کے پاس جاتے ہیں جو اور زیادہ خطرناک ہے۔ پڑھے لکھے نوجوان لڑکے لڑکیاں اعلےٰ تعلیم کے حصول کے بعد قدرتاً یہ توقع کرتے ہیں کہ اُنہیں اپنے جیسا پڑھا لکھا جیون ساتھی ملے۔ اس میں ناکامی ہو تو بعض اوقات ساری عمر مُجرّد رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ایسے پڑھے لکھے مُجرّدوں اور کنواریوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ اِن میں اکثریت کنواریوں کی ہے۔ ناآسودہ جنسی خواہش کی قہرمانی اُن کی شخصیت اور کردار کو مسخ کر کے رکھ دیتی ہے۔ برٹرنڈرسل لکھتے ہیں۔[1]

"اکثر نوجوان جنسی جذبے کے ہاتھوں آغازِ شباب ہی سے ایسے گوناگوں مصائب کے شکار ہو جاتے ہیں جن سے پہلو بچایا جا سکتا ہے۔ کوئی نوجوان پاکبازی کی زندگی بسر کرے تو ضبطِ نفس کی مشکلات اُسے کم ہمت بنا دیتی ہیں اور اُسے قوتِ اقدام سے محروم کر دیتی ہیں۔ شادی کے بعد بھی وہ ضبطِ نفس سے نجات نہیں پا سکتا یا نجات پا لیتا ہے تو اُس کا رویّہ اتنا جابرانہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیوی سے محبت کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ کوئی نوجوان کسبیوں کے ہاں جائے تو اُس کے ذہن میں محبت کے نفسانی اور مثالیاتی پہلوؤں کے مابین ایک خلیج سی حائل ہو جاتی ہے اور وہ ابتدائی دَور کی یہ

---

[1] MARRIAGE AND MORALS.

خلیج پاٹنے میں ناکام رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعد میں عورت کے ساتھ اُس کے
تعلقات یا تو جنسی محبت سے عاری ہوتے ہیں یا اُن کے ساتھ پستی اور گراوٹ کا
احساس وابستہ ہو جاتا ہے۔"

ان مشکلات پر قابو پانے کے لئے اضلاع متحدہ امریکہ میں 'رفاقت کی شادی' کا چرچا ہوا۔ جج لنڈسے نے یہ تجویز پیش کی کہ نوجوان لڑکے لڑکیاں چند سالوں تک نکاح کے بغیر میاں بیوی بن کر رہیں تاکہ وہ طویل تجرّد کے احساس جرم، جنسی محرومی اور بے راہ روی سے محفوظ رہ سکیں۔ یورپ میں صرف سویڈن ہی میں اس نوع کی شادی کا تجربہ کیا گیا ہے۔ دوسرے ممالک میں بوجوہ اس کی ترویج ممکن نہیں ہو سکی۔

تاریخ تمدن میں 'رفاقت کی شادی' کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ وحشی اقوام میں اس کا رواج قدیم زمانے سے موجود ہے۔ جزیرہ ٹروبریانڈ میں قبیلے والوں کی بستی سے الگ تھلگ ایک جھونپڑا تعمیر کر دیا جاتا ہے جسے بوکماٹولا کہتے ہیں۔ رات کے وقت کنواری لڑکیاں لڑکے اس میں اکھٹے ہوتے ہیں اور اپنے اپنے ساتھی کے ساتھ رات گذار کر صبح سویرے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ فرینڈ ڈوہنریک لکھتا ہے[1] کہ ہندوستان کی ریاست بستر (سی۔پی) میں موریا قبائل میں بوکماٹولا نہایت منظم صورت میں موجود ہے۔ موریا اُسے گھوٹل کہتے ہیں۔ جو لڑکا لڑکی اس میں جنسی ملاپ کرتے ہیں اُنہیں ایک دوسرے کا 'جوڑی دار' کہتے ہیں۔ کوئی لڑکا کسی ایک لڑکی پر کُلّی حق نہیں جتا سکتا۔ دوسری قسم کا گھوٹل وہ ہے جس میں کوئی لڑکا لڑکی ایک دوسرے سے مستقلاً وابستہ نہیں ہوتے بلکہ جس کے ساتھ چاہیں خلوت میں جا سکتے ہیں۔ اسے 'منڈی بدلنا' کہتے ہیں۔ گھوٹل میں عام طور سے بیس لڑکیاں لڑکے رہتے ہیں۔ لڑکے کو 'چیلک' اور لڑکی کو 'مٹیاری' کہتے ہیں۔ گھوٹل میں جانے کی اجازت صرف رات کو ہوتی ہے۔ دن کو یہ جگہ ویران پڑی رہتی ہے۔ گھوٹل کے باہر کسی لڑکے لڑکی کو جنسی ملاپ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کوئی لڑکی حاملہ ہو جائے تو اُسے اپنے منسوب سے بیاہ دیا جاتا ہے جسے اُس کے حمل پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا کیوں کہ جس لڑکے کا حمل رہ جائے

---

[1] SOCIOLOGY OF SEX.

اُسے حاملہ کے ساتھ شادی کرنے کی سخت ممانعت ہے۔ فرنینڈو ہنریک کہتا ہے کہ موریہ قبیلے نے بوکبا ٹولا کی صورت میں نوخیزوں کے جنسی مسائل کا حل تلاش کر لیا ہے جب کہ مہذب اقوام اس کے بارے میں ہنوز قیل و قال میں معروف ہیں۔"

بچوں اور نوخیزوں کو جنسی تعلیم دلانے کے بارے میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کے مخالف کہتے ہیں کہ جنسی تعلیم سے بچے اور نوخیز جنس میں قبل از وقت دلچسپی لینا شروع کر دیتے ہیں اور اُن کے سروں میں جنسی تجربات کرنے کا سودا سما جاتا ہے۔ اس کے حامیوں کے خیال میں بچوں کو اوائل عمر ہی میں ضروری جنسی معلومات بہم پہنچا دی جائیں تو وہ بے راہ روی سے محفوظ رہیں گے۔ برٹرنڈرسل کہتے ہیں کہ اس نوع کی تعلیم خالص علمی اور تحقیقی انداز میں دی جائے، وعظ و نصیحت سے کام سنورنے کی بجائے اُلٹا بگڑ جاتا ہے۔ اُن کے الفاظ میں؛[1]

"—— بچپن کی اخلاقی تلقین جنسی پہلو سے ضرر رساں ثابت ہوتی ہے بچے کو کسی سخت گیر آیا یا والدین نے رسمی رواجی تعلیم دلائی ہو تو چھ برس کی عمر کو پہنچنے تک اُس کے ذہن میں گناہ اور اعضائے نہانی کا ربط و تعلق اس درجے محکم ہو جاتا ہے کہ وہ ساری عمر اُس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا..... نتیجۃً بہت سے بالغ مرد محسوس کرتے ہیں کہ جنس عورت کی اخلاقی پستی کا باعث ہوتی اور وہ اپنی عورتوں کی عزت اُس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ جنسی ملاپ سے نفرت کا اظہار نہ کریں۔"

ہیولاک ایلس نے اپنی ضخیم نفسیات جنس کی چھٹی جلد میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ بچوں کو اوائل عمر ہی میں مصوری اور سنگ تراشی کے عریاں شاہ کار دکھانا چاہییں۔ اس سے اُن کا جمالیاتی ذوق پختہ ہو گا اور وہ ہوس پرور عریانی کے مضر اثرات سے محفوظ رہیں گے کیوں کہ اُن پر حسین اور فحش کا فرق واضح ہو جائے گا۔ آج کل کے اکثر علمائے جنسیات جنسی تعلیم کے حق میں ہیں۔ راقم الحروف بھی بچوں کی جنسی تعلیم کا حامی ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ جنسی معلومات سے بے بہرہ ہونے کے باعث

---

[1] CONQUEST OF HAPPINESS.

حُسن وجمال

جنسیات میں حُسن نسوانی کو بھی معرض بحث میں لایا جاتا ہے۔ بعض عورت دشمن عورت کے حُسن وجمال کے قائل نہیں ہیں مثلاً "شوپنہائر" کہتا ہے کہ تنگ کندھوں، بھدی ٹانگوں اور چوڑے کولہوں والی اِس مخلوق کو حسین کہنا صریح بدذوقی ہے لیکن اکثر اربابِ ذوق و نظر حُسنِ نسوانی کے راگ الاپتے رہے ہیں۔ بی، آر ہیڈن کہتا ہے۔

"حُسن وجمال صرف عورت ہی کے جسم میں ہوتا ہے۔"

بھرتری ہری نے کہا تھا۔

"چراغ، آگ، ستاروں، چاند، سُورج کے ہوتے ہوئے بھی ایک آہو چشم حسینہ کے بغیر میری دُنیا تاریک ہے۔"

ایک حسین عورت کا چہرہ اور جسم نہ صرف مردوں کے لئے جذب و کشش کا باعث ہوتا ہے بلکہ خود عورتیں بھی اپنے پُرشباب، گدرائے ہوئے اعضا اور موزوں خدّوخال کو دیکھ دیکھ کر حظ اندوز ہوتی ہیں۔ حُسنِ ازل اور فطرتی مناظر کے حُسن کا شعور بھی حُسنِ نسوانی ہی کے حوالے سے ارزانی ہوتا ہے صُوفیہ نے حُسنِ ازل سے عشق کا اظہار کرتے ہوئے وہی پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے جس سے کوئی چاہنے والا اپنی حسین محبوبہ کو مخاطب کرتا ہے۔ مائسٹر ایکہارٹ، میراں، غلام فرید، سٹیفان جارج وغیرہ نے عشقِ حقیقی کا اظہار کرتے وقت مجاز ہی کی زبان سے کام لیا ہے۔ انسانی ذہن و قلب میں فطرتی مناظر کے حُسن کا شعور اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آغاز شباب کے ساتھ جنسی خواہش از سرِ نو بیدار ہو جاتی ہے۔ ایک بچہ دہکتی ہوئی شفق یا اُمڈتے بادلوں کے مناظر سے محظوظ نہیں ہو سکتا لیکن نوخیزی کے دَور میں جنسی خواہش کی بیداری کے ساتھ جب وہ عورت کے حُسن وجمال

میں کشش محسوس کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی وہ فطرتی مناظر کے حسن سے بھی لطف اندوز ہونے لگتا ہے۔ ارباب بصیرت نے بدصورت عورت کے وجود سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ جس عورت کو لوگ بدصورت سمجھتے ہیں وہ بھی اپنے چاہنے والے کے بازوؤں میں حسین بن جاتی ہے۔ فرانس کے مشہور سنگ تراش رودآں نے کہا ہے لے

"نیچر کے مشاہدے سے مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ میں صرف جسمانی حسن کے حوالے سے زوح کے حسن کی جھلک دیکھ سکتا ہوں، میرے بعد ایسا شخص ضرور آئے گا جو اس بات کی تفصیل بتا سکے گا جس کی میں صرف جھلک ہی دیکھ پاتا ہوں کہ تمام دنیا حسین ہے اور تمام بنی نوع انسان خوبصورت ہیں۔ ایک حبشی یا ایک منگول کا بھی حسن کا ایک معیار ہے خواہ وہ ہمارے معیار سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو اور اُن کے کردار کی بھی یہی کیفیت ہے۔ بدصورتی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ جب میں جوان تھا تو میں نے بھی دوسروں کی طرح یہ غلطی کی تھی۔ میں صرف خوبصورت عورت ہی کی چھاتیاں تراش سکتا تھا۔ آج میں کسی بھی عورت کی چھاتیاں تراش سکتا ہوں اور وہ اتنی ہی خوش وضع ہوں گی کوئی عورت خواہ وہ بظاہر کتنی ہی بدصورت ہو اپنے چاہنے والے کی آغوش میں حسین بن جاتی ہے۔ اُس کے کردار میں، اُس کے پرجوش شباب میں ایک حسن ہوتا ہے جو معرضِ اظہار میں آتا ہے کیوں کہ عورت تو وہ سانچا ہے جس میں پرجوش جذبات متشکل ہوتے ہیں اگر جذبات نہ بھی ہوں تو بھی رگوں میں خون تو بہر حال دوڑتا ہے اور ہوا ہے جو پھیپھڑوں میں جاتی ہے۔"

فارسی والے کہتے ہیں لیلٰے را بچشم مجنوں باید دید۔ ایک دن عبد الملک بن مروان نے لیلٰے کو دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قیس عامری مر چکا تھا اور لیلیٰ کا حسن و شباب رخصت سفر

لے یہ اقتباس ہیو لاک ایلس کی نفسیات جنس جلد چہارم میں درج ہے۔

باندھ چکا تھا۔ لیلےٰ کو دربار میں پیش کیا گیا تو عبد الملک نے حقارت سے اُس کی جانب دیکھ کر کہا

" تیرے عاشق نے تجھ میں کیا دیکھا کہ تیرے عشق میں مُبتلا ہو گیا "

لیلےٰ نے برجستہ جواب دیا

" لوگوں نے تجھ میں کیا دیکھا تھا کہ تجھے خلیفہ بنا دیا " عبدالملک بن مروان اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

سٹراٹنز کے خیال میں حُسنِ نسوانی کا معیار ہر کہیں ایک جیسا ہے البتہ طبعی ماحول اور نسلی روایات کے باعث کم و بیش مختلف بھی ہو گیا ہے۔ ہم ذیل میں مختلف اقوام سے چند تصویریں پیش کریں گے۔

سجستانی کی داستان حمزہ بن مغیرہ میں ایک حسینہ کے حُسن و جمال کا نقشہ اِن الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

" ایک کم سن خاتون یکایک پردے میں سے نکلی جس کے قدِ رعنا شاخِ بید کی طرح نازک تھا، آنکھیں سُرمگیں اور بڑی بڑی، بھوئیں چوڑی، پیشانی کشادہ، پنڈے کی سفیدی قمیض کی سُرخی پر غالب تھی، چھاتیاں اُبھری ہوئی، پیٹ گویا حریر کا تھان لپٹا ہُوا، اِس کی شکنیں کاغذ کی تہ سے مشابہ تھیں، سر کے بالوں سے مُشک کی خوشبو اڑ رہی تھی، ناک ستواں، ٹھوڑی موتی جیسی گول، دانت موتیوں کی طرح، منہ سے خوشبو کی لپٹیں آرہی تھیں۔"

الف لیلہ و لیلہ سے ایک لڑکی کا سراپا

" نو عمر لڑکی، بلند بالا، سینہ اُبھرا ہوا، حُسن و جمال اور آب و تاب اور قد و اعتدال میں لاجواب، روشن پیشانی، نیل گائے کی آنکھیں، شعبان کے چاند کی کمان کے ابرو، شقائق النعمان کے سے رُخسار، سُلیمان کی انگوٹھی کا سا مُنہ، مرجان کی طرح سُرخ ہونٹ، موتی کی لڑی کی طرح دانت، غزال کی سی گردن، شامیانے کی طرح سینہ، پستان جیسے دو انار، پیٹ ریشم کی طرح نرم.....اس کے بدن کے

اعضاء خوبصورت، جلد ملائم اور چہرہ حسین ہے گویا وہ اچھے قوام کی مصری کی ڈلی ہے۔"

عرب حسنِ نسوانی کے بہت بڑے مبصّر تھے۔ انہوں نے اِس موضوع پر مستقل کتابیں تالیف کی ہیں۔ اِن میں سلامہ بن رحمون کی کتاب "المقالہ فی حصب ابدان النساء" اور جاحظ کی کتاب القیان قابلِ ذکر ہیں۔ عربوں کی طرح قدیم دور کے ہندو بھی حسنِ نسوانی کے قدردان تھے۔ بھرتری ہری ایک حسینہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔[1]

"چاند سا سُندر مکھڑا، کنول کو شرمانے والی مخمور آنکھیں، سونے کی دمک کو ماند کرنے والا کُندن سا بدن، بھونرے سے بڑھ کر سیاہ گھنی زُلفیں، طلائی کلس کی طرح چھاتیوں کا اُبھار، ہاتھی کی سونڈ کی طرح گدرائی ہوئی رانیں، رسیلی آواز۔"

دمینتی کا حُسن[2]

"دمینتی کی چال ہنس کی ہے، اُس کی باتوں سے اُمرت ٹپکتا ہے، ہرن کی سی آنکھیں جن سے نشہ چھلکتا ہے، چہرہ چاند کی طرح روشن، اُس کے چہرے سے حُسن کی شعاعیں چاند کی کرنوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر نکلتی ہیں۔"

سیتا کا سراپا[3]

"تیرے دانت سفید ہیں، تیری آنکھیں بڑی بڑی، پتلیاں سیاہ، اِن کے کنارے سُرخی مائل، رانیں ہاتھی کی سونڈ کی مانند، تیری چھاتیاں اُبھری ہوئی گول، سرِ پستان اُوپر کی جانب اُٹھتے ہوئے۔"

کالی داس شکنتلا کے حُسن کے بارے میں کہتا ہے۔

"شکنتلا کے رسیلے ہونٹ نوخیز کونپل کی سُرخی لئے ہوئے ہیں۔ اُس کے بازو نرم لچکیلی ٹہنیوں کے مشابہ ہیں اور جوشِ شباب غنچۂ ناشگفتہ کی طرح اُس کے انگ انگ سے نمایاں ہے۔"

---

[1] بھرتری ہری، جے کشن چوہدری [2] حکایاتِ پنجاب آر۔سی ٹمپل [3] رامائن

دمینتی، سیتا، شکنتلا ہندوؤں کی مثالی حسین عورت پدمنی کا نمونہ ہیں جس کی تعریف میں تسیان کہتا ہے۔

"پدمنی کی جلد سرس کے پھول کی طرح نرم، چال راج ہنس کی، آواز کومل کی، بدن میں خوشبو ہوتی ہے۔"

چینی حسن کا نمونہ۔

"ہاتھوں کی انگلیاں جیسے گھاس کی نرم پتیاں، جلد نرم جیسے سیال مرہم، گردن ریشم کی طرح سفید، دانت ہموار جیسے کہ تربوز کے بیج، آنکھیں خوش وضع جن میں سیاہی اور سفیدی ایک ساتھ چمک رہی ہیں، کشیدہ قامت۔"

جاپانی حسینہ کا نقشہ خان لین گگ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"سر نہ چھوٹا نہ بڑا، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، لمبی پلکیں، محرابی ابرو، چہرہ گول، رخسار نرم و نازک جن کا رنگ ہلکا گلابی، ناک سیدھی، دہن چھوٹا، ہونٹ تر و تازہ جن میں چمکتے ہوئے سفید دانت، بھری بھری گردن، گدرایا ہوا بدن چھاتیاں گول اور سخت، سرین زیادہ فربہ نہیں، ہاتھ پاؤں نازک۔"

جے، ڈیوی نے سنگھالی حسینہ کی وصف نگاری کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اس کی ناک باز کی چونچ کی مانند ہے، ہونٹ سرخ مونگے کی طرح، گردن بھری ہوئی، سینہ چوڑا، چھاتیاں گول زرد ناریل کی مانند، گدرایا ہوا بدن، جلد کومل، کمر پتلی، اتنی پتلی کہ ایک ہاتھ کی گرفت میں آجائے۔"

پشتو کا مشہور شاعر خوشحال خان خٹک ایک نظم میں آفریدی عورتوں کے حسن وجمال کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"آدم خیل آفریدی دوشیزائیں سرخ و سفید رنگ کی ہیں، ان کے حسن اور ادا میں دلکشی ہیں، مست آنکھیں لمبی پلکیں، سیاہ ابرو، رسیلے ہونٹ، گلابی رخسار، چمکتی پیشانیاں، ان کے دہن ننھی کلیاں ہیں، دانت ننھے موتی ہیں، ان کے سیاہ

بال معنبر ہیں، جلد ہاتھی دانت کی طرح سفید ہے۔ اُن کا قد الف کی طرح سیدھا ہے۔"
یورپ کی نورڈک نسل کے اقوام میں سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں کو خوبصورت سمجھا جاتا ہے جنوبی یورپ کی لاطینی اقوام میں سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں کشش کا باعث ہوتی ہیں، ایرانی کشیدہ قامت، پتلی کمر، ساقِ سیمیں، انار پستان، غنچہ دہن، سیب رُخسار کے شیدائی ہیں۔

اِن تصویروں میں جس حسینہ کا تصور آنکھوں کے سامنے اُبھرتا ہے وہ کشیدہ قامت ہے، اُس کا بدن گدرایا ہوا، اعضاء سانچے میں ڈھلے ہوئے، لمبی زلفیں، قوسی ابرو، بڑی بڑی مست آنکھیں، ترشے ہوئے لب و دہن، رخساروں پر شباب کی سُرخی، چھاتیوں اور سُرینوں کا اُبھار نمایاں، ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے اور گداز، جسم کے خطوط میں گولائی۔ عورت کے جسم کے بعض اعضاء زیادہ پرکشش ہوتے ہیں اور خاص طور سے جنسی خواہش کی ترغیب کا باعث ہوتے ہیں۔ انہیں نفس پرور اعضاء[ل] کہا جاتا ہے۔ علمائے جنسیات کے خیال میں گھنیری زلفیں، نرگسی آنکھیں، بھرے بھرے سرخ ہونٹ، اُبھری ہوئی چھاتیاں اور کُولہے اور بدن کی خوشبو خاص طور سے نفس پرور ہوتی ہیں۔

زُلفِ پُرپیچ اور گیسوئے دراز کو حُسن کا لازمہ سمجھا جاتا ہے۔ عورت کے چہرے کے لئے گھنیرے بال چوکھٹے کا کام دیتے ہیں جس میں اُس کے چہرے کا حُسن نکھر آتا ہے اور چہرہ دمک اُٹھتا ہے۔ بعض عورتوں کے سر کے بال اتنے لمبے ہوتے ہیں کہ ساقِ سیمیں کی خبر لاتے ہیں۔ فردوسی کہتا ہے کہ جب ایک رات کو زال اپنی محبوبہ رودابہ سے ملنے گیا تو اِس نے اپنے سر کے بال کھول کر شہر پناہ کے نیچے لٹکا دیئے اور کہا انہیں پکڑ کر اوپر آجاؤ۔ ایرانی شاعر نے زُلفِ مُعنبر، گیسوئے مُشکیں، زلفِ دوتا، زلفِ پیچاں اور طرّۂ مُشکبو کا ذکر کیا ہے۔ مغربی عورت نے سر کے بال کٹوا دیئے ہیں جس سے اُس کا حُسن گھٹتا گیا ہے۔

ایک حسینہ کی کٹوری دار مست و مخمور آنکھوں میں بلا کی کشش ہوتی ہے۔ اربابِ نظر خد و خال اور قد و قامت کے حُسن و رعنائی کے ساتھ عشوہ و ادا کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ عشوہ و ادا اور

ل EROGENOUS

ناز و غمزہ کا تعلق آنکھوں سے ظاہر ہے۔ ایک حسینہ ایک نگاہِ غلط انداز یا ایک نگاہِ دُزدیدہ سے دلوں میں آگ لگا دیتی ہے۔ تیرِ نگاہ، کمانِ ابرو، نگاہِ ناز، چشمِ نرگس، چشمِ غزال، چشمِ فتاں، چشمِ سُرمگیں، چشمِ خمار آلود کی تراکیب نہایت بلیغ ہیں۔ اقبال ؎

نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اُس میں
نہ پوچھ اے ہم نشیں مجھ سے وہ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے

چشمِ بیمار اور چشمِ خواب ناک کے بارے میں ایک عرب شاعر کہتا ہے ؎

وَكَأَنَّهَا وَسْنَىٰ إِذَا نَظَرَتْ
أَوْ مُدْنَفٌ لَمَّا يُفِقْ بَعْدُ

(جب وہ دیکھتی ہے تو یوں معلوم ہوتی ہے جیسے اُونگھ رہی ہو یا جیسے مدت سے بیمار چلی آ رہی ہو اور ابھی افاقہ نہ ہُوا ہو)

جریر نے کہا ؎

إِنَّ الْعُيُونَ الَّتِي فِي طَرْفِهَا حَوَرٌ
قَتَلْنَنَا ثُمَّ لَمْ يُحْيِينَ قَتْلَانَا

يَصْرَعْنَ ذَا اللُّبِّ حَتَّىٰ لَا حَرَاكَ بِهِ
وَهُنَّ أَضْعَفُ خَلْقِ اللهِ إِنْسَانَا

(ان خوبصورت آنکھوں نے جن کی سیاہی گہری سیاہ اور سفیدی خالص سفید ہے نہایت بے دردی سے ہمیں مار ڈالا اور پھر مقتولین کو زندہ بھی نہ کیا۔ یہ اچھے بھلے خردمند کو اس طرح پچھاڑ دیتی ہیں کہ وہ بے حس و حرکت ہو جاتا ہے حالاں کہ تمام مخلوقات میں یہی سب سے زیادہ کمزور اور نازک ہیں۔)

بعض عرب شعراء نے ایک حسینہ کی آنکھوں کو نیل گائے کی آنکھوں سے تشبیہ دی ہے اور انہیں خمار آلود کہا ہے۔ مسلم بن ولید الانصاری ؎

مَا كُنْتُ أَحْسَبُ خَمْرًا لَيْسَ مِنْ عِنَبٍ * حَتَّىٰ سَقَتْنِيهِ صِرْفًا أَعْيُنُ الْبَقَرِ

(میرا خیال تھا کہ کوئی شراب ایسی نہیں ہوتی جو انگوروں سے نہ نکلتی ہو یہاں تک کہ اِس نیل گائے کی آنکھوں سے میں نے مئے ناب نوش کی)

شاعرانہ توارد ملاحظہ ہو۔ عراقی کہتا ہے ؎

نخستین بادہ کاندر جام کردند
ز چشمِ مستِ ساقی وام کردند

ہسپانیہ کی عورتیں آنکھوں ہی آنکھوں میں معاملہ کرنے میں شہرۂ آفاق ہیں۔ ہندو آنکھوں کو کنول سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اجنتا کی تصاویر میں عورتوں کی نیم خوابیدہ آنکھیں دیکھ کر ذہن بلاشبہ کنول کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ شیکسپیئر خوبصورت آنکھوں کے تاثر کا ذکر کرتے ہوئے ایک سانیٹ میں کہتا ہے۔

"میں نے علم تیری آنکھوں سے حاصل کیا ہے۔ اِن کے مشاہدے سے مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ حسن اور صداقت توأم ہیں۔"

امریکی عورتیں صرف اپنی آنکھوں کی زیبائش پر ہر سال اڑتالیس ملین ڈالر خرچ کرتی ہیں۔

لب و دہن کی خوبصورتی بھی دلوں کو موہ لیتی ہے۔ عورت کے سُرخ ہونٹوں میں مرد کے لئے بے پناہ کشش ہوتی ہے۔ لیو ٹالسٹائے نے ایام پیری کے روزنامچے میں لکھا ہے کہ میری بیوی سونیا کے سُرخ ہونٹ میرے لئے بلائے بے درماں بن گئے تھے۔ اُن پر نگاہ پڑتے ہی میں سپر انداختہ ہو جاتا تھا اور اِس کی جنسی کشش مجھ پر غالب آجاتی تھی۔ عرب لب و دہن کی شیرینی کو شہد اور شراب سے تشبیہ دیتے ہیں۔ الف لیلہ و لیلہ میں لکھا ہے۔

"اُس کی سانس خالص مُشک سے زیادہ خوشبودار ہے۔ اُس کا لعاب دہن شراب سے زیادہ مزے دار اور تریاق سے زیادہ مفید ہے۔"

عمر بن ابی ربیعہ ؎

حَوْرَاءُ آنِسَةٌ مُقَبَّلُهَا   عَذْبٌ كَانَ مَذَاقَهُ خَمْرٌ

(سیاہ چشم، ملنسار جس کا دہن شیریں ہے اور اُس کا مزا شراب جیسا ہے۔)

اُسی کا شعر ہے ؎

يُرْدِي بِهِ الظَّمْآنُ حِينَ يَشُوفُهُ   لَذُّ الْمُقَبَّلِ بَارِدًا خَمَّارَا

(دہن ایسا کہ اُسے دیکھتے ہی ایک پیاسا سیراب ہو جائے، لذیذ ہونٹوں والا، ٹھنڈا، شراب کی مستی لئے ہوئے۔)

ابن الرومی ایک کنیز دریرہ کی تعریف میں کہتا ہے

"اس کے مے گوں ہونٹوں میں آب حیات ہے

اس کی سانس گویا معطر باد شمال ہے جو چمنستانوں سے آرہی ہے۔"

دہن کی خوشبو کا ذکر پہلے پہل امرؤالقیس نے کیا تھا

"جب اس نے پہلے پہل مجھے اپنے حسن کا دیوانہ بنایا وہ چمک دار موتیوں کے

سے دانت اور لعل لب جن کا بوسہ شہد سے زیادہ لذیذ تھا اس قسم کی خوشبو

اس کے منہ سے آتی تھی گویا کسی تاجر نے قیمتی عطردان کھول دیا ہو۔"

کالی داس شکنتلا میں ہونٹوں کے رس کا ذکر کرتا ہے

"دشینت (شکنتلا سے) جس طرح بھونرا گل تازہ کا مدھو گھونٹ گھونٹ کر پیتا ہے

اسی طرح تیرے اچھوتے ہونٹوں کا رس ہولے ہولے پی لوں تو چھوڑ دوں گا۔"

دانت ہموار اور چمکتے ہوئے سفید ہوں تو مسکراہٹ سے لب و دہن کی کشش میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے

"الوپ دئی ہنستی تو شاخ پھولوں سے بھر جاتی" [1]

لیو ٹالسٹائے نے تو مسکراہٹ ہی کو حسن و جمال کا واحد معیار قرار دیا ہے۔ کہتا ہے۔ [2]

"میرے خیال میں حسن صرف مسکراہٹ میں ہوتا ہے۔ اگر مسکراہٹ سے چہرے

کی کشش میں اضافہ ہو جائے تو وہ چہرہ حسین ہے اگر مسکراہٹ میں چہرہ ویسے

کا ویسا ہی رہے تو وہ عام سا چہرہ ہے اور اگر مسکراہٹ سے چہرہ بدنما ہو جائے

تو وہ چہرہ بدصورت ہے۔"

ایرانی غنچہ دہن اور پستہ دہن پر فدا ہیں۔ عرب چھوٹے دہن کو انگشتری سے تشبیہ دیتے ہیں۔

اہل مغرب فراخ دہن کو پسند کرتے ہیں۔ دہن چھوٹا ہو یا بڑا بھرے بھرے سرخ ہونٹ بہرحال

جنسی ترغیب کو ہوا دیتے ہیں اور بوس و کنار کی دعوت دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ مردوں

---

[1] حکایات پنجاب ، آر۔ سی ٹمپل

[2] CHILDHOOD, BOYHOOD & YOUTH.

کو لبھانے کے لیے عورتیں قدیم زمانے سے اپنے ہونٹوں پر لالی لگاتی رہی ہیں۔ لب و دہن کی خوبصورتی کے ساتھ آواز کا سُریلا پن بھی لازم ہے۔ ایک عورت خواہ کتنی ہی حسین و جمیل ہو اُس کی آواز کرخت ہوگی اور لب و لہجہ درشت ہوگا تو اُس کی کشش جمال ختم ہو جائے گی۔ لوئی پنجم شاہِ فرانس کی محبوبہ مادام پومپیدو کی آواز اتنی سُریلی تھی کہ اُس کی باتیں سُن کر مرد مست و بےخود ہو جاتے تھے۔ قلوپطرہ کی بے پناہ کشش کا راز اُس کے حسین لب و دہن اور جادو بھری آوازیں تھا وہ بات کرتی تو یوں لگتا جیسے کسی سُر کیے ہوئے ساز کے تار جھنجھنا رہے ہیں۔ ہندو کہتے ہیں کہ پدمنی کی آواز کوئل کی سی ہوتی ہے۔

جنسی کشش کے پہلو سے چھاتیوں اور سُرینوں کے اُبھار نہایت دلاویز ہیں۔ زمانہ ماقبل تاریخ کے چند نسوانی مجسّمے دستیاب ہوئے جنہیں وینس کہا جاتا ہے۔ یہ مجسّمے ہڈی، پتھر اور ہاتھی دانت سے تراشے گئے ہیں۔ اِن میں عورت کے پستانوں اور سُرینوں کا غیر معمولی اُبھار دکھایا گیا ہے۔ یہ مجسّمے مادری نظامِ معاشرہ سے یادگار ہیں۔ اِن کے مشاہدے سے مفہوم ہوتا ہے کہ قدیم ترین زمانوں میں بھی عورت کی چھاتیوں اور سُرینوں کا غیر معمولی اُبھار[1] جنسی کشش کا موجب تھا۔ قدمائے یونان فربہ سُرینوں کے شیدائی تھے۔ جن کی دیوی افرودائتی کے ایک مجسّمے میں اُس کے سُرینوں کو برہنہ دکھایا جاتا تھا[2]۔ جرمن زبان میں سُرینوں کو "پیچھے کے رُخسار"[3] کہا جاتا ہے۔ افریقی اور عرب لوگ بھی سُرینوں کے خبطی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک چھاتیوں اور سُرینوں کے غیر معمولی اُبھار کا تعلق ہے تمام مرد ان کے خبطی ہوتے ہیں۔ ایک پُرشباب گدبدی عورت سامنے آ جائے تو مردوں کی نگاہیں اُس کی اُبھری ہوئی چھاتیوں پر جم کر رہ جاتی ہیں اور وہ پیٹھ پھیر کر گذرے تو اُس کے بھرے بھرے کولہوں کا تموّج جذبِ توجّہ کا باعث ہوتا ہے چنانچہ جنسی خبطیوں میں چھاتیوں اور سُرینوں کے خبطیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ عرب اور حبشی من حیث القوم

---

[1] سُرینوں کے غیر معمولی اُبھار کو اصطلاح میں STEATOPYGY کہتے ہیں۔

[2] اِسے KALLIPYGOS کہتے تھے۔

[3] HINTERBACKEN

بوجھل سُرینوں کے شیدائی ہیں۔ افریقہ میں ہر کہیں موٹی تازی عورت کو خوبصورت سمجھا جاتا ہے کیوں کہ حبشیوں کے یہاں حُسن اور فربہی لازم و ملزوم ہیں۔ رچرڈ برٹن لکھتا ہے کہ صومالیہ کا مرد عورتوں کو قطار میں کھڑا کر دیتا ہے جس عورت کے کولہے سب سے زیادہ بوجھل ہوں اُس سے بیاہ کر لیتا ہے۔ منگو پارک نے لکھا ہے کہ نائیجیریا میں فربہ اندام عورت کو پسند کرتے ہیں۔ وہاں کی بعض عورتیں اس قدر موٹی ہوتی ہیں کہ جب تک دونوں جانب سے عورتیں سہارا نہ دیں وہ چل پھر نہیں سکتیں۔ اینڈریو سمتھ کے بقول افریقہ میں بھاری بھرکم سُرین کو حُسنِ نسوانی کی سب سے بڑی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اُس نے ایک افریقی عورت کو دیکھا جس کے کولہے اِس قدر بوجھل تھے کہ وہ آسانی سے اُٹھ کر کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ عرب بھی فربہ اندام عورت پر جان چھڑکتے ہیں۔ موطا امام مالک میں ہے

"ہیت نے کہا تم غیلان کی بیٹی کو ضرور لینا۔ جب وہ سامنے آتی ہے تو اُس کے پیٹ پر چار بٹیں معلوم ہوتی ہیں اور جب پیٹھ پھیر کر جاتی ہے تو چار کی آٹھ بٹیں معلوم ہوتی ہیں۔"

عرب عورتیں اپنے کولہوں کے اُبھار کو نمایاں کرنے کے لئے اُن پر گدا باندھتی رہی ہیں جسے عربی میں زنجبہ کہتے ہیں۔ عربوں نے بوجھل اور متلاطم کولہوں کو ذکر نہایت ذوق و شوق سے کیا ہے۔

عمر بن ابی ربیعہ ؎

مُرْتَجَّةُ الرِّدْفَيْنِ بِمُكْنَةٍ — رُؤْدُ الشَّبَابِ كَأَنَّهَا قَصْرٌ

وَتَنُوْ فَتَصْرَعُهَا عَجِيْزَتُهَا — مَمْشَى الضَّعِيْفِ يَؤُوْدُهُ الْبَهْرُ

(وہ موجوں کی طرح متلاطم کولہوں والی، تر و تازہ، پُر شباب، اپنے بھرے بھرے جسم کے ساتھ جیسے ایک قصر اور جب وہ ہمت کر کے اُٹھتی ہے تو اُس کے سُرین کا بوجھ اُسے نیچے کھینچتا ہے اور چال اُس کی یوں ہے جیسے کوئی کمزور، تھکا ماندا۔)

عرب شاعروں نے بھاری بھرکم کولہوں کو ریت کے تودوں سے تشبیہ دی ہے مسلم بن الولید الانصاری ؎

كُثْبَانُ رَمْلٍ إِذَا ارْتَجَّتْ أَسَافِلُهَا — مَالَتْ بِأَثْمَارِهَا مِنْ فَوْقِهَا الْقَصَبُ

(جب اُس کے نچلے حصے (کولہے) تھرکتے ہیں تو یوں لگتے ہیں جیسے ریت کے ٹیلے اور اُن کے اوپر لچک دار شاخیں (بازو)۔)

ابن حزم قرطاجنی قصیدۂ مقصورہ میں کہتا ہے ۔

" اگر اُس کے حُسن کی شرح جسم کے بالائی حصّے سے زیریں حصّے کی جانب کی جائے تو وہ ایک چاند ہے جو ریت کے تودے پر چمک رہا ہے ۔ اگر زیریں حصّے سے بالائی حصّے کی جانب اُس کے حُسن کی شرح کرو تو وہ ریت کا تودا ہے جس پر ایک شاخ اوپر کی طرف نکلتی ہے جس کے اوپر چاند چمک رہا ہو ۔"

افریقی اور عرب ناچنے والیاں بڑے نفس پرور انداز میں سرینوں کو حرکت دیتی ہیں ۔ بیلی ڈانسنگ عرب ممالک کا مقبول ترین رقص ہے اِس میں ناچنے والیاں اِس تیزی سے اپنے کولہے پھڑکاتی ہیں کہ دیکھنے والے مست و مدہوش ہو جاتے ہیں ۔ ہسپانیہ کے فان دانگو ناچ میں عربی رقص کی یہ روایت باقی و برقرار ہے ۔ قدیم چین میں لڑکیوں کے پاؤں کس کر باندھ دیئے جاتے تھے ۔ پاؤں چھوٹے رکھنے کا مقصد یہ تھا کہ جب عورت چلتی تو اُس کے کولہوں میں ہوس پرور جنبش ہوتی تھی ۔ اونچی ایڑی کا جُوتا پہننے میں بھی یہی مصلحت ہے کہ اِس سے چلتے وقت سرینوں میں پرکشش حرکت ہوتی ہے ۔ عورتیں جانتی ہیں کہ اُن کے سُرینوں میں مردوں کے لیئے بڑی جاذبیت ہوتی ہے اس لیئے وہ انہیں مٹکا مٹکا کر راستہ چلتی ہیں ۔ اناطول فرانس نے کہا " عورتوں کے سُرینوں سے زیادہ دُنیا کی کوئی بھی چیز خوبصورت نہیں ہے " ایک عرب شاعر نے سینے اور سُرین کے اُبھار پر بے مثل شعر کہا ہے ۔

اَبَتِ الرَّوَادِفُ وَالنُّهُوْدُ لِقُمِیْصِهَا ۔۔۔ مِنْ اَنْ تَمَسَّ بُطُوْنَهَا وَظُهُوْرَهَا

(اُس کے سُرین اور چھاتیاں اُس کی قمیص کو اُس کے پیٹ اور پیٹھ کو چھُونے سے روکتی ہیں ۔)

قدیم کریٹ ، ہند ، احیاء العلوم اور سترھویں صدی کے فرانس اور اطالیہ میں عورتیں اپنی چھاتیاں برہنہ رکھتی تھیں اور اُن پر غازہ لگاتی تھیں ۔ فرانس کا انشائیہ نگار مان تین کہتا ہے " ہماری

عورتوں کی چھاتیاں لبسا اوقات ناف تک بالکل برہنہ ہوتی ہیں۔" روما کی ملکہ میسالینا اپنی چھاتیوں پر سنہرا رنگ لگایا کرتی تھی۔ خوش وضع اور سڈول چھاتیوں کی کشش سے کوئی بھی مرد محفوظ نہیں۔ ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ چوتھی صدی قبل مسیح میں ایتھنز کی ایک بیسوا فرنی حسن و جمال میں یکتائے روزگار تھی۔ مشہور سنگ تراش پراکسی طیلس نے حسن و عشق کی دیوی افرو ڈائٹی کے مجسمے فرنی کی دلآویز جسمانی زاویوں پر تراشے تھے۔ فرنی الیوسینی جشن پہ برسرِ عام بال کھول دیتی اور مادر زاد برہنہ سمندر میں نہایا کرتی تھی۔ ایک دفعہ ایک شہری نے فرنی پر معصیت پھیلانے کا الزام لگایا اور اُس کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ فرنی کے وکیل ہائپر یڈلیس نے اُس کے دفاع میں تقریر کرتے ہوئے فرنی کے سینے پر سے کپڑا ہٹا کر منصف صاحبان سے کہا " حضرات! ایک نظر ادھر دیکھئے۔ کیا یہ حسن معصیت پرور ہو سکتا ہے؟" منصف صاحبان نے فرنی کی حسین چھاتیوں کو غور سے دیکھا اور یہ دلیل تسلیم کرتے ہوئے اُسے بری کر دیا۔[1] یونانِ قدیم کی ایک روایت ہے کہ پہلا طلائی پیالہ ہیلن کی چھاتیوں پر ڈھالا گیا تھا۔ ہیلن کے حسن و جمال کی شہرت میں اُس کی سڈول، چھاتیوں کو بھی دخل تھا۔ ٹرائے کی تسخیر پر اس کے شوہر مینی لاس نے قسم کھائی کہ وہ بے وفا ہیلن کو دیکھتے ہی موت کے گھاٹ اُتار دے گا۔ ہیلن سامنے آئی تو وہ غضبناک تلوار سونت کر جھپٹا۔ ہیلن نے اپنا سینہ کھول دیا۔ مینی لاس اُس کی خوش وضع چھاتیوں کے نظارے سے ہچکچک رہ گیا، تلوار ہاتھ سے پھینک دی اور اُسے گلے سے لگا لیا۔ اِسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ حسین عورتوں کو اپنی قوت کا اِحساس ہوتا ہے اور اپنے حسن و جمال سے جب تک چاہتی ہیں مردوں کو گدھا بناتی رہتی ہیں۔ یونانی خوبصورت چھاتیوں کو سیب سے تشبیہ دیتے تھے، ایرانی انارِ پستان کہتے ہیں۔ وارث شاہ نے انہیں سیب اور ریشم کی گیندیں کہا ہے۔ ہیر کا سراپا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

چھاتی ٹھاٹھ دی اُبھری پٹ کھنوں سیب بلخ دے چنڑے انبار وچوں

برخوردار صاحباں کے حسن کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ؎

---

[1] LIFE OF GREECE.

اوہدے سینے اُتّے دو ڈبیاں عاشق مست کرن ۔ اُپر بھوچھن کڈھواں وچ تلیر چوگ چگّن

ایک پُر شباب عورت کی چھاتیوں کا اُبھار دوپٹے میں بھی نمایاں ہوتا ہے ۔ اُس کے چلنے سے چھاتیوں میں جنبش ہوتی ہے ۔ برخوردار کہتا ہے کہ دوپٹے کے نیچے متحرک چھاتیاں دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے تلیر چوگ چُگ رہے ہیں ۔ زولا نانا[1] کے حُسن کے بارے میں کہتا ہے " اُس کی سنہری چھاتیاں یوں دمک رہی تھیں جیسے شمع کی روشنی میں ریشم جھلملا رہا ہو ۔ " فلابیر نے اپنے ایک نسوانی کردار کا ذکر کرتے ہوئے کہا " اُس کی چھاتیاں اس قدر خوش وضع ہیں کہ اُن پر سر رکھ کر مرجانے کو جی چاہتا ہے

مسلم بن ولید الانصاری کہتا ہے ؎

نَدَعَ الشَّبَابُ لَهُنَّ دُمَّانَ الصِّبَا ۔ فِیْ اَنْحُرٍ قَدْ زُیِّنَتْ بِالتَّرَائِبِ

(شباب نے اُن کے سینوں میں حُبّ و شوق کے انار اُگائے ہوئے تھے اور یہ اُبھار اُن کی چھاتیوں کی زینت تھے)

قدما نے حسین عورتوں کے بدن کی خوشبو کا ذکر کیا ہے ۔ ہندو کہتے ہیں کہ پدمنی کے بدن سے کستوری کی خوشبو آتی ہے ۔ چینیوں نے اِسے " سنگ مرمر کی خوشبو " کہا ہے ۔ یہ خوشبو مردوں کے لیے بڑی دلکش ہوتی ہے ۔ بعض جوان مردوں کے جسم سے بھی خوشبو آتی ہے جو عورتوں کو حظ بخشتی ہے ۔ بقول پلوٹارک سکندرِ اعظم کے پسینے سے مُشک کی مہک اُٹھتی رہتی تھی جس سے اُس کے کپڑے معطّر ہو جاتے تھے ۔ فاوسٹ میں عورتوں نے نوجوانوں کے بدن کی دلآویز خوشبو کا ذکر کیا ہے ۔

عرب کے مشہور شاعر اور عشق باز اِمرؤ القیس نے بھی عورتوں کی بدن کی خوشبو کا ذکر کیا ہے ۔ کہتا ہے ؎

" جب وہ دونوں نازنینیں کھڑی ہوئی تھیں تو اِن میں سے ایسی خوشبو آ رہی تھی
گویا بادِ صبا لونگ کے درختوں میں سے گذر کر آ رہی ہے ۔ "

ایک عرب شاعر کہتا ہے ؎

اِنَّ النِّسَاءَ رَیَاحِیْنٌ خُلِقْنَ لَکُمْ ۔ وَکُلُّکُمْ یَشْتَهِیْ شَمَّ الرَّیَاحِیْنِ

(عورتیں گلدستے کی مانند ہیں اور تمہارے لیے ہی پیدا کی گئی ہیں اور عالم یہ ہے کہ تم سے ہر شخص گلدستے کو سونگھنا

---

[1] NANA
[2] ODER DE FEMINA

چاہتا ہے۔)

خوشبو کا جنسی جذبے کے ہیجان سے گہرا تعلق ہے۔ اس لیے خوش ذوق عورتیں اپنے سینے، بغلوں، اور کنجِ ران کو عطریات میں بسا لیتی ہیں۔ الف لیلہ ولیلہ میں قمر کہتی ہے۔

"میں لطیف عطریات سے اپنے سینے، شکم اور بدن کے دوسرے حصوں کو بساؤں گی تاکہ میرا بدن شیرینی کی طرح تیرے منہ میں گھل جائے۔"

خوشبو کا اثر عورت پر گہرا ہوتا ہے۔ مانٹا گیزا لکھتا ہے کہ مجھے ایک خاتون نے بتایا کہ میں پھولوں کی خوشبو سے اس قدر لذت محسوس کرتی ہوں کہ مجھے لگتا ہے جیسے میں کوئی گناہ کر رہی ہوں۔

ایرانی پھولوں کے شیدائی ہیں اور خوشبو کے اثرات سے بخوبی واقف ہیں۔ طالب آملی ؎

بہ تن بویا کند گلہائے تصویرِ نہالی را　　　بپا بیدار سازد خفتگان نقشِ قالی را

ایک شاعر کہتا ہے ؎

ازیں دیار گذشتی و سالہا بگذشت　　　ہنوز بوئے تو می آید از منازلِ ما

نسوانی حسن و جمال کے مشہور مبصر کسانوا نے کسی حسینہ کی مندرجہ ذیل صفات گنائی ہیں۔[1]

"جلد اطلس کی طرح نرم اور چمکتی ہوئی سفید جو گھنیری زلفوں کی سیاہی کو اجاگر کر دے، چہرے کے نقوش موزوں، رخساروں پر سوسن اور گلاب کھلے ہوئے، چھاتیاں سڈول، ہاتھ سپید اور گداز، چمکتی ہوئی آنکھوں میں دلربا خفگی کی جھلک، ابرو محرابی، دہن غنچے کی مانند، دانت ہموار اور موتیوں کی طرح سپید، ہونٹ گلابی، پاؤں ننھے منے۔"

کسانوا کشیدہ قامت حسینہ کو پسند کرتا ہے البتہ یہ کہتا ہے کہ ایک کشیدہ قامت حسینہ کے ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے گداز ہونا ضروری ہیں۔ جس کشیدہ قامت عورت کے ہاتھ پاؤں بڑے بڑے اور کرخت ہوں گے اس میں مردانگی کا عنصر ہوگا اور اس کے جسم کے زاویوں میں گولائی اور گدازپن نہیں ہوگی۔ وہ کہتا ہے کہ حسیناؤں کی روح بھی حسین ہوتی ہے۔ عربوں کے خیال میں حسین لوگ فیاض ہوتے ہیں ؎

---

[1] MEMOIRS

اُطْلُبُوا الْحَاجَاتِ عِنْدَ حِسَانِ الْوُجُوْہِ۔

(اپنی حاجات خوبصورت لوگوں سے طلب کرو)

مائکل انجلو کہتا ہے "با عصمت عورت کا چہرہ بدکار عورت کے چہرے سے زیادہ شگفتہ و شاداب ہوتا ہے۔"
حافظ شیرازی کے خیال میں عشق محض خدوخال سے نہیں بلکہ "لطیفۂ نہانی" سے پیدا ہوتا ہے جو کسی عورت کے ناز و ادا اور کشش جمال پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایسی عورتیں جن کے خدوخال ستعلیق نہ ہوں لطیفۂ نہانی کے طفیل مرکزِ توجہ بن جاتی ہیں۔ عرفی نے کہا ہے کہ ناز و ادا کے بغیر ایک حسین عورت پتھر کی مورتی بن کر رہ جاتی ہے ؎

زُبت نہ گوشۂ چشمے نہ چینِ ابروئے　　بحیرتم کہ دلِ برہمن زکف چوں شد

فارسی والے حسین عورت کو نگاریابت کہتے ہیں کیوں کہ وہ تراشی ہوئی مورتی کی طرح متناسب الاعضا ہوتی ہے[1]۔ اہل مغرب جسمانی شماریات میں ۳۶—۲۴—۳۶ کو مثالی سمجھتے ہیں۔

جدید دور میں حسنِ نسوانی کا کلاسیکی معیار بدل گیا ہے۔ فی زمانہ چہرے کے نقوش کی بہ نسبت تناسب اعضاء، بدن کی گدراہٹ، رنگ روپ کی فطرتی تازگی اور جنسی کشش کو اہم خیال کیا جاتا ہے۔ جب عورتیں حرم سراؤں اور گھروں کی چار دیواروں میں محصور تھیں اُس وقت چہرے کا حسن زیادہ اہم تھا اور افسانوی عشاق کسی حسینہ کے چہرے کی ایک جھلک دیکھ کر غش کر جایا کرتے تھے۔ اب عورت آزاد ہے اور روایتی پابندیوں کو خیر باد کہہ رہی ہے۔ اُس نے ایسا لباس پہننا شروع کر دیا ہے جو تن کو ڈھانپتا کم ہے اور بدن کی گدراہٹ اور اعضاء کی گداختگی کو نمایاں زیادہ کرتا ہے۔ کسی عورت کے چہرے کے نقوش خواہ معمولی ہوں تناسب اعضاء اور جوبن کے نکھار کے باعث اُسے حسن و جمال کا پیکر سمجھا جاتا ہے۔ اب یہ حقیقت تسلیم کر لی گئی ہے کہ ہر صحت مند پُرشباب عورت خوبصورت ہوتی ہے خواہ اُس کے چہرے کے نقوش کیسے بھی ہوں۔ بعض نوجوان صحت مند لڑکیاں جن کے بدن سانچے میں ڈھلے ہوئے خوش وضع ہوتے ہیں محض اِس لئے احساس کہتری میں مبتلا ہو

---

[1] انگریزی میں متناسب نسوانی پیکر کو SANDGLASS FIGURE کہتے ہیں۔

جاتی ہیں کہ اِن کی آنکھیں چھوٹی ہیں، پیشانی تنگ ہے، دہن فراخ ہے یا رنگ سانولا ہے۔
یہ اُن کی بھول ہے۔ آج کل چہرے کے نقوش سے زیادہ عورت کے پُرشباب جسم کو کشش سمجھا جاتا ہے۔ دمینتی نے کہا تھا[1]

"چڑھتے جوبن نے مجھے یوں گھیر لیا جیسے باغ مالی کو گھیر لیتا ہے۔"

ہیر نے کہا[2]

"میرا جوبن چھلک چھلک کر راستوں میں گرا پڑتا ہے۔"

آج کل اِسی چڑھتے اور چھلکتے ہوئے جوبن کو حُسن سمجھا جاتا ہے۔

نسوانی حُسن میں غرابت کا عنصر بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اپنے مُلک و قوم کی بہ نسبت دوسری اقوام کی عورتوں میں اِک گُونہ زیادہ کشش نامعلوم ہوتی ہے۔ اِسی کے تحت اہلِ مغرب ایشیائی عورتوں میں زیادہ جنسی کشش محسوس کرتے ہیں اور ایشیائی مغربی عورتوں کو حُسن و جمال کا پیکر سمجھتے ہیں۔

---

[1] [2] حکایاتِ پنجاب ۔ آر، سی ٹمپل۔

حدیثِ عشق

عشق کے دو پہلو ہیں ۔۔۔ (۱) عشقِ حقیقی جسے اہلِ مغرب عشقِ روحانی کہتے ہیں۔ ۔۔۔ (۲) عشقِ مجازی۔ صوفیہ عشقِ حقیقی کے مدّعی ہیں اور محبوبِ ازلی سے اظہارِ محبت کرتے ہیں۔ عشقِ مجازی کے دو معروف پہلو ہیں ۔ (۱) رُوحانی عشق ۔ (۲) ہم جنسی عشق ۔

عشقِ حقیقی کا تصوّر بُنیادی پر نو اشراقی ہے۔ سکندریہ کے ایک عارف فلاطینوس نے افلاطون کے اشراقی افکار کی نئے سرے سے ترجمانی کی تھی۔ افلاطون نے کہا تھا کہ کائنات کی جملہ اشیا حُسنِ ازل کی جانب کشش محسوس کرتی ہیں۔ اسی کشش کو اُس نے عشق کا نام دیا۔ افلاطون کے نظریۂ عشق سے بحث کرتے ہوئے فلاطینوس نے کہا کہ انسانی رُوح عالمِ بست و بُود میں آکر مادے کی اسیر ہو گئی ہے اور اپنے مبدء کے فراق میں تڑپتی رہتی ہے۔ تجرد اور ریاضت کی زندگی گذارنے سے رُوح مادے کی قید سے آزاد ہو جاتی ہے اور دوبارہ ذاتِ حقیقی میں جذب ہو جاتی ہے۔ عشق کا یہ تصوّر فلاسفۂ اسلام میں بڑا مقبول ہوا اور اُن کے واسطے سے صوفیہ تک پہنچا۔ فارابی کا قول ہے "خُدا خود عشق ہے اور تخلیق و تکوین کا اصل سبب بھی عشق ہی ہے۔"

سنائی، عطار، رومی، جامی اور حافظ شیرازی نے ولولہ انگیز پیرائے میں اسی عشق کی گوناگوں کیفیات کو نظم کیا تھا۔ ہندو ویدانتی برہمن آتما ایکتا کے قائل ہیں۔ اُن کے خیال میں آتما مایا کے جال سے آزاد ہو جائے تو وہ دوبارہ برہمن میں جذب ہو جاتی ہے۔ بھگت شاعروں نے رادھا (آتما) اور کرشن (برہمن) کے حوالے سے اِس نظریے کی ترجمانی کی ہے۔ گووندا، میراں، سورداس وغیرہ کی شاعری میں رادھا کرشن سے والہانہ اظہارِ محبت کرتی ہے اور اُس سے وصال کی خواہاں ہوتی ہے۔ المانوی اشراق میں نو فلاطونی نقطۂ نظر کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔

جرمن شاعر ریلکے جو اپنے ہم قوم ماسٹر اکہارٹ کے عرفانی افکار سے متاثر ہوا تھا اپنی ایک نظم میں کہتا ہے

"خدایا! میری موت کے بعد تو کیا کرے گا؟

میں وہ سانچا ہوں جس میں تو موجود ہے، اس کے ٹوٹ جانے کے بعد تیرا کیا بنے گا؟

میں وہ مے ہوں جسے تو پیتا ہے، اس کے سڑ جانے کے بعد تیرا کیا ہوگا؟

میں تیرا لباس ہوں، تیرا شغلہ ہوں، مجھے کھو کر تیری اپنی ذات بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔"

تحلیل نفسی کی رُو سے عشق لازماً جنسی ہوتا ہے۔ عشق روحانی یا عشق حقیقی بھی اسی کی ایک صورت ہے کہ صوفیہ عشق حقیقی کا اظہار ہمیشہ مجاز ہی کے پیرائے میں کرتے رہے ہیں حافظ شیرازی کی غزلیات، میراں کے بھجنوں، ولیہ ترلیسا کے مراقبات اور رومی کی مثنوی میں اظہار عشق کے لئے جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ خالصتاً مجاز کی زبان ہے۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے محبوب کی آواز سُنے، اُسے دیکھے، اُسے چھُوئے اور گلے سے لگائے۔ غالب ؎

تکلف برطرف لب تشنۂ بوس و کنارستم
زراہم بازچیں دام نوازش ہائے پنہاں را

یہی وجہ ہے کہ ایک ذات مجرّد و بسیط و بیچون و بیچگون سے جو شعور و ادراک کی گرفت سے آزاد ہو عشق کرنا محال ہے اس لئے انسان حقیقت کو لباس مجاز میں دیکھنے کا متمنی ہوتا ہے اس لئے محبوب حقیقی کا تصوّر بھی مجاز کے پیرائے میں کرتا ہے تاکہ وہ اُس سے عشق کر سکے۔

روحانی عشق کا تصوّر تحریک جوانمرد[1] کے ساتھ وابستہ ہے جس کا آغاز عرب سے ہوا تھا اور جو فلسطین، صقلیہ اور ہسپانیہ سے مغربی ممالک میں پھیلی تھی۔ اس تحریک کے آداب تھے شجاعت، حماست، مروّت، مہمان نوازی اور عورتوں کی حفاظت۔ مورخین اس کا آغاز عنترہ بن الشداد سے کرتے ہیں جس نے عورتوں کی حفاظت کرتے ہوئے جان دی تھی اور جو جاہلی دور کا مشہور جوانمرد اور شاعر تھا۔

[1] عربی میں اسے فتوت یا فرویت کہتے ہیں۔ فرانسیسی میں شویلر کا معنیٰ ہے شہسوار اور لفظ شولری فرویت (شہسواری) کا لغوی ترجمہ ہے۔

عہدِ جاہلیت کی عورتیں اِس قسم کے مضمون کے اشعار پڑھ پڑھ کر میدانِ جنگ میں اپنے مردوں کی ہمت بندھاتی تھیں [1]

"ہمت! ہمت!! اے عورتوں کے محافظوں! ہمت سے کام لو۔ اپنی تلواروں کی دھار سے دشمن کو کاٹ ڈالو، ہم طارق (ستارۂ سحر) کی بیٹیاں ہیں جن غالیچوں پر ہمارے پاؤں پڑتے ہیں وہ نرم ہیں۔ ہمارے گلوں میں موتیوں کے ہار ہیں۔ ہماری زلفیں عنبریں ہیں۔ جو بہادر دشمن سے لڑیں گے ہم اُنہیں گلے لگائیں گی لیکن جو بزدل ہو کر بھاگ نکلیں گے ہم اُنہیں ٹھکرا دیں گی اور ہماری باہیں اُن کے گلے میں تو پڑیں گی۔"

اشاعتِ اسلام کے بعد جناب امیر المومنین علی ابن ابی طالب فتوت کے مثالی نمونے بن گئے۔ شامی لشکریوں نے عورتوں پر دست تعدی دراز کیا تو آپ نے فرمایا [2]

مجھے تو یہاں تک خبر ملی ہے کہ اِس لشکر کا ایک آدمی مسلمان عورت کے گھر میں اور دوسرا ذمی عورت کے یہاں گھس جاتا تھا اور اُس کے خلخال، دست بند، بُندے، گوشوارے چھین لیتا تھا۔۔۔۔۔ یہ واقعہ سُن کر اگر کوئی مردِ مسلمان غم سے ہلاک ہو جائے تو اِس پر تعجب نہیں کیا جا سکتا۔"

دُنیائے اسلام میں الناصر عباسی، صلاح الدین ایوبی اور سلطان رُکن الدین بیبرس بندوق داری، جوانمردی کی درخشاں روایات کے پاسبان تھے۔ مرورِ زمانہ سے تحریک جوانمردی سے مسلک نسائیت [3] نے جنم لیا یعنی عشق میں عورت کی پرستش مشمول ہوئی۔ عشاق اپنی محبوبہ کی ادنیٰ سی خواہش کی تکمیل کو بھی فرضِ عین سمجھتے تھے اور اُس کے دیئے ہوئے رُومال کا پھریرا اپنے نیزے کے سرے پر لہرا کر اکھاڑوں میں اُترتے تھے۔ اس مسلک میں عورت کو ایک مافوق الطبع مخلوق تسلیم کیا جاتا تھا اور نہایت پُرجوش انداز میں اُس سے اظہارِ عشق کرتے تھے۔ محبوبہ جتنی عالی نژاد ہوتی تھی اتنی ہی شیفتگی سے اُس

---

[1] تاریخ اندلس ڈوزی ترجمہ عنایت اللہ دہلوی [2] نہج البلاغہ ترجمہ رئیس احمد جعفری

[3] CULT OF THE DAME

کے حُسن وجمال کے گیت گاتے تھے۔ پاکبازی کے عشق کی روایت بدوؤں کے ایک قبیلے بنو عذرا سے یادگار ہے۔ مسعودی نے بنو عذرا کے بے لوث عشق کو الھویٰ العُذری کہا ہے اور اِس قبیلے کے دو عشاق عُفرا اور عُروہ کی المناک عشقیہ داستان بیان کی ہے۔ جمیل بن معمر العذری اور اُس کی محبوبہ بُثینہ اسی قبیلے کے افراد تھے۔ عَذری عورتیں اپنے عُشاق سے توقع کرتی تھیں کہ وہ اُن کی تعریف میں شعر کہیں تاکہ اُن کے حُسن وجمال کا شُہرہ دوُر دوُر تک ہو جائے۔ عشقِ عَذری کا یہ تصوّر بغداد سے ہسپانیہ تک پھیل گیا۔ ہسپانیہ کی شاعری بلکہ تمام رُومانی شاعری میں عُذری نصب العین دکھائی دیتا ہے۔ ابن داود اصفہانی اور ابن فرح جیانیؔ عَذری اِس تصورِ عشق کے مشہور پاسبان تھے۔ ابن فرح عذری کہتا ہے۔

"اگرچہ وہ سپردگی پر آمادہ تھی لیکن میں نے ضبط سے کام لیا۔ رات کو وہ کھلے مُنہ آئی۔ رات کے سایوں میں اُس کا چہرہ چمک اُٹھا۔ اُس کی ایک ایک نگاہ دل کو بے قرار و بے خود کرنے کے لئے کافی تھی لیکن میں نے ہوس کے مُنہ زور گھوڑے کو بے قابو نہیں ہونے دیا۔ میں نے رات اُس کے ساتھ گذاری جیسے اُونٹنی کا بچہ جس کا مُنہ رسیوں سے باندھ دیا جائے اور وہ اپنی ماں کے تھن سے دُودھ نہ پی سکے۔ میرے جیسے لوگ پھُولوں بھرے باغ میں صرف اُن کا نظارہ کرتے ہیں۔ اور خوشبو سونگھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ میں آوارہ وحوش سے نہیں ہوں جو اس باغ کو اپنی چراگاہ بنالیتے ہیں۔"

اِس کے دو سَو برس بعد مرسیہ کے شاعر صفوان بن ادریس نے کہا۔

"وہ کس قدر حسین ہے۔ حُسن تو اِس کی محض ایک صفت ہے۔ اُس کی حرکات نہایت جادو بھری ہیں۔ وہ چاند کی طرح خوبصورت ہے۔ چاند سے پُوچھا جائے تم کیا چاہتے ہو تو وہ جواب دے گا میں اُس کا ہالہ بننا چاہتا ہوں چاند اُس کے چہرے کے سامنے آجائے تو گویا وہ عکس ہے اُس کے چہرے کا جو آئینے میں پڑ رہا ہے۔ رات کے وقت میں اُس سے ملا۔ میرے جُبّے کے نیچے آگ سلگ رہی

تھی جیسی کہ تمتمائے گالوں میں سلگتی ہے ۔ میں نے اُسے گلے لگا کر بھینچا جیسے کہ بخیل اپنے خزانے کو بھینچتا ہے ۔ میں نے اُسے بازوؤں میں جکڑ لیا کیوں کہ وہ غزال ہے ، میں ڈرتا ہوں وہ بھاگ نہ جائے لیکن میری پاکبازی نے مجھے اجازت نہ دی کہ میں اُس کا منہ چوموں اور میرا دل بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جلتا رہا اُس شخص کا دھیان کرو جس کا اندرون پیاس کی شدت سے جل رہا ہو لیکن وہ پانی سے اپنا حلق تر نہ کرے ۔"

تاریک زمانوں کے دوران میں یورپ میں ایک بھی عشقیہ نظم نہیں کہی گئی کیوں کہ ایک تو عشقیہ شاعری مذہباً ممنوع تھی دوسرے یورپ کی اُجڈ ، وحشی اقوام جذبۂ عشق کی لطافت اور حُسنِ نسوانی کی قدر و قیمت سے ناآشنا تھیں چنانچہ ۱۱ ویں صدی سے پہلے یورپ میں رومانی عشق کا تصوّر ناپید تھا ۔ اسی دوران میں ہسپانیہ اور صقلیہ کے عرب شاعروں نے بے نظیر عشقیہ نظمیں کہیں جن میں موشح اور زجل کے اصناف کو خاص شہرت حاصل ہوئی ۔ عرب طراب[1] (گا کر شعر سنانے والے) عشق ناکام اور حرماں نصیبی کے مضامین دلدوز پیرائے میں گا کر سناتے تھے ۔ تحریک جوانمردی کی اشاعت کے ساتھ یہ روایت فرانس کے ایک صوبے پرووِنس میں سرسبز ہوئی جو ہسپانیہ کی سرحد پر واقع تھا ۔ مغربی اقوام کی عشقیہ شاعری پرووِنس کی شاعری ہی سے متفرع ہوئی ہے ۔ ابن قزمان کی کتاب الاغانی میں ایک سَو سے زیادہ عشقیہ قصائد ہیں جو عام فہم عربی روزمرے میں لکھے گئے تھے ۔ ولیم نہم جو یورپ کی اس دور کی شاعری کا باوا آدم تھا ، ابن قزمان ہی کا معاصر تھا اور عربی اصنافِ شعر سے متاثر ہوا تھا ۔ بعد میں آنے والے شاعر گویوں نے اُس کی تقلید میں رُومانی نظمیں لکھیں ۔ پرووِنس کی اِس دور کی رُومانی شاعری کا خاتمہ ربی کوئسر پر ہوا یعنی دو سَو برس تک (۱۱۰۰ ـــــ ۱۳۰۰ ب م) فرانس کی عشقیہ شاعری پر عربی شاعری کے اثرات ثبت ہوتے رہے ۔ پرووِنس کے شاعروں نے موضوعات

---

[1] انگریزی کا لفظ TROUBADOUR اور فرانسیسی کا لفظ TROVIER لفظ طراب ہی کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں ۔ یہ لوگ عشق و محبت اور جنگ و جدال کے گیت سازوں کے ساتھ گا کر سناتے تھے ۔

کے ساتھ عربی شاعری کے اسالیب بھی اپنا لئے۔ عربوں نے جنس اور تقدس کے امتزاج سے رومانی شاعری کی بنیاد رکھی تھی۔ اندلس کے شاعروں نے اس روایت کی آبیاری کی اور عشق ناکام کی حسرت ناکی پر پرجوش نظمیں لکھیں لیکن مغرب کی اجڈ اقوام میں جنس اور تقدس کا تعلق برقرار نہ رہ سکا۔ مغربی سورما عربوں کی طرح عالی ظرف اور پاک بیں نہیں تھے اس لئے ان کے یہاں مسلک نسائیت کی پاکبازی مجروح ہو گئی۔ یہ سورما اپنی محبوب خواتین سے تمتع کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے تھے۔ جو سورما کسی حسینہ کو دشمن کے چنگل سے چھڑا لاتا وہ اس کے ساتھ خلوت میں جانے کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔ گول میز کا ایک سورما سر لانسیلاٹ شاہ آرتھر کی ملکہ گینور سے کھلم کھلا معاشقہ کرتا تھا۔

صوفیہ کے عشق حقیقی کی طرح رومانی عشق بھی جنسی جبلت ہی کی مرتفع صورت ہے۔ شیخ اکبر ابن عربی اندلس کے مشہور وجودی صوفی تھے۔ انہوں نے اپنی حسین محبوبہ نظام سے عشق کیا تھا اور اس کے حسن و جمال کی تعریف و توصیف میں پرجوش قصائد لکھے تھے۔ ان کا قول ہے "جس نے عشق کیا اور مرتے دم تک پاک منش رہا وہ شہید کی موت مرا۔"

یاد رہے کہ رومانی عشق ایسے معاشرے میں پنپ سکتا ہے جس میں مردوں عورتوں کو آزادانہ میل ملاپ کے مواقع نہ ملیں۔ اس تفریق سے دونوں ایک دوسرے کی ذات میں کشش نامعلوم محسوس کرتے ہیں۔ مرد عورت کو کوئی آسمانی مخلوق سمجھنے لگتا ہے اور عورت مرد میں بطل جلیل کو تلاش کرتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس معاشرے میں عورتیں مرد بلا تکلف اور بے محابا ایک دوسرے سے ملتے ہیں اس میں رومانی عشق کا کھوج نہیں ملتا۔ وحشی قبائل میں جن کے ہاں آزادانہ جنسی ملاپ کا رواج ہے، رومانی عشق کا تصور ناپید ہے۔ آسٹریلیا، افریقہ اور جزائر غرب الہند کے وحشی قبائل میں لڑکے لڑکیاں شادی سے پہلے جنسی تعلق قائم کر لیتے ہیں اور محبت کے نام ہی سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ جب مشنریوں نے انگاکون قبیلے کے وحشیوں کی زبان میں بائبل کا ترجمہ کرنا چاہا تو انہیں مقامی بولی میں لفظ عشق کا کوئی مترادف نہ مل سکا۔ مارگریٹ میڈ لکھتی ہیں کہ سموان وحشیوں کو رومیو جولیٹ کی کہانی سنائی گئی تو وہ مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گئے اور کہنے

لگے اِن نادانوں کو خودکشی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ باہم مل کر جنسی خوشی زندگی گذار سکتے تھے۔
اِس سے مفہوم ہوتا ہے کہ رُومانی محبت کا آغاز ایسے معاشرے میں ہوا جس میں مردوں اور عورتوں کے مابین شرم و حجاب کی دیواریں حائل کر دی گئی تھیں۔ جدید مغربی معاشرے میں بھی آزادانہ جنسی ملاپ نے رُومانی محبت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ آج کل کے کسی مغربی نوجوانوں یا لڑکی کے سامنے رُومانی عشق کا نام لیا جائے تو اُن کے لبوں پر زہرخند پھیل جاتا ہے۔

افلاطونی یا ہم جنسی عشق کی روایت یونانی الاصل ہے۔ قدمائے یونان کے یہاں عشقِ صادق خالصتاً ہم جنسی ہوتا ہے۔ یورپ کے اُدباء اور شعراء نے غلطی سے مرد عورت کے ایسے عشق کو افلاطونی کہنا شروع کیا جس میں عشاق پاک باز ہوں۔ فی الحقیقت افلاطونی عشق سے مُراد ہم جنسی محبت تھی جسے اہلِ یونان جملہ محاسنِ اخلاق کا مصدر سمجھتے تھے۔ اُن کے خیال میں نوجوانوں کی مناسب تربیت کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے سے عشق کریں کہ اِس کے بغیر انسان کردار و شخصیت کی بلندیوں تک پہنچنے سے قاصر رہتا ہے۔ افلاطون سمپوزیم میں کہتا ہے۔

"ایراس (عشق کا دیوتا) کو قدیم ترین دیوتا سمجھا جاتا ہے۔ ہم اِس کے فیوض و برکات کے لئے اِس کے ممنونِ احسان ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کسی نوجوان کا اِس سے بڑا فائدہ اور کس بات میں ہو سکتا ہے کہ اُس سے عشق کیا جائے یا وہ کسی سے عشق کرے۔ جو لوگ شریفانہ زندگی گذارنا چاہتے ہیں اُن کی زندگی کی تکمیل نہ دولت سے ہو سکتی ہے نہ اعزاز سے نہ کسی اور شئے سے۔ عشق ہی اِس مقصد کے حصول میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔"

اِسی مکالمے میں عشق کی ماہیت سے بحث کرتے ہوئے افلاطون دیوتیمہ کی زبان میں کہتا ہے۔

"وہ لوگ جن کی تخلیقی جبلت جسمانی ہوتی ہے عورتوں سے رجوع لاتے ہیں اور اُن سے پیار کرتے ہیں۔ اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ بچے پیدا کر کے وہ اپنے پیچھے غیر فانی یادگار چھوڑ جائیں گے لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی تخلیقی تمنا رُوحانی

ہوتی ہے۔ چنانچہ اُن کی تخلیقات جسمانی نہیں رُوحانی ہوتی ہیں کہ رُوح انہیں عالمِ وجود میں لاتی ہے۔ اگر تم پُوچھو کہ وہ تخلیقات کیا ہوتی ہیں تو میں کہوں گی کہ وہ دانش اور نیکی ہیں جن کے خالق شاعر اور دوسرے فن کار ہوتے ہیں۔ دانش کی اعلیٰ صورت مملکت اور خاندان کی تنظیم ہے جسے ہم توافق اور عدل کا نام دیتے ہیں"۔

یہ کلیّہ قائم کر کے افلاطون کہتا ہے کہ ایک حسین دوست کا عشق رُوحانی حُسن کی جانب رہنمائی کرتا ہے حتیٰ کہ وہ حُسنِ مطلق کے نصب العین کو پا لیتا ہے۔ اس عشق کا آغاز بقول اُس کے خوبصورت نوجوانوں کی محبت سے ہوتا ہے، اِس میں عورت کی محبت کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ مرد اور عورت کا باہمی عشق ایک مرض[1] ہے اور جنوں کی ایک قسم ہے جس سے غور و فکر کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ بقوکریٹس نے مرضِ عشق کا علاج یہ تجویز کیا تھا کہ مریض کو گانا سُننے کی ترغیب دلائی جائے۔ افلاطون کے خیال میں حسین لڑکوں کا عشق جسمانی پہلو سے شروع ہوتا ہے اور حُسن، صداقت، عدل اور خدمتِ خلق کے نصب العین پر منتہی ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مذہب، آرٹ اور اخلاق کی بنیاد اسی عشق پر استوار کی گئی ہے۔ سمپوزیم کے مباحثے میں شرکت کرنے والے اس بات پر متفق ہو جاتے ہیں کہ مرد کی مرد سے محبت مرد عورت کی محبت سے کہیں زیادہ شریفانہ اور ارفع ہوتی ہے ایک اور مکالمے فیدرس میں بھی افلاطون نے ہم جنسی عشق کی تعریف و توصیف کی ہے۔ یہ ہے وہ افلاطونی عشق جسے شیلی، براؤننگ اور دوسرے شعراء نے غلط مفہوم دیا تھا۔ ہمارے ہاں صوفیہ بھی عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی کا پیش خیمہ سمجھتے رہے ہیں، ایک صوفی کا قول ہے "المجاز قنطرۃ الحقیقۃ" (مجاز حقیقت کا پُل ہے) یہ مرحلہ بعض اوقات نوعمر حسین اَمردوں سے عشق کر کے طے کیا جاتا تھا۔

عشق کے تمام پہلوؤں کا ذکر کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوگا کہ آخر عشق کیا ہے؟ راقم التحریر

---

[1] ہندوؤں کے ہاں مرضِ عشق کے دس مراحل ہیں۔ آنکھ کی محبت، دل کی کشش، خواہش کا اُبھار، بے خوابی، دُبلاپن، تمام چیزوں سے بے اعتنائی، شرم و حیا کا اُٹھ جانا، خیالات کا انتشار، بے ہوشی، موت۔

کے خیال میں اس کا جواب یہ ہوگا کہ عشق جنسی کشش کی شائستہ اور ارفع صورت ہے۔ بعض اصحاب فکر عشق کو سراسر ایک شہوانی ضرورت سمجھتے ہیں۔

"____ عشق محض اوعیہ منی کو خالی کرنے کی لذت کا نام ہے جس طرح ہم ادرار بول سے اپنا مثانہ خالی کرتے وقت یا رفع حاجت کے وقت بڑی انتڑیوں کے خالی ہونے سے تسکین محسوس کرتے ہیں اسی طرح اوعیہ منی کو خالی کر دینے میں ہمیں اک گونہ حظ نفس محسوس ہوتا ہے۔ قدرت کی ستم ظریفی یہ ہے کہ ہمارے لیے لذت اور غلاظت کو ایک ہی جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔" (مانتین)

"____ عشق نام ہے محبوب سے مقاربت کی خواہش کا۔" (مانتین)

"____ عشق کی تعریف کرنا مشکل ہے۔ عقلیاتی لحاظ سے یہ ہمدردی ہے اور روحانی پہلو سے یہ دوسرے شخص پر قابو پانے کی خواہش ہے، جسمانی لحاظ سے محبوب سے متمتع ہونے کی آرزو ہے۔" (راک فوکال)

"____ عشق اور بھوت کا حال ایک جیسا ہے۔ سب ان کی باتیں کرتے ہیں لیکن کسی نے انہیں نہیں دیکھا۔" (راک فوکال)

"____ نظریاتی لحاظ سے عشق مثالیاتی رغبت طلبی ہے، عقلاً یہ بدترین قسم کی ہوس کاری ہے جس سے متعلق بات کرنے اور سوچنے سے بھی ننگ و عار محسوس ہوتا ہے۔" (لیو ٹالسٹائے)

"____ مرد کا عشق اس کی جنسی آسودگی کے ساتھ ہی ماند پڑ جاتا ہے جب وہ اپنی محبوبہ سے فیض یاب ہوتا ہے تو دوسری عورتوں کی طرف مائل ہو جاتا ہے اس لیے عشق فطرت کے حصول مقصد کا ایک وسیلہ ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہ مقصد پورا ہونے پر عشق کا جذبہ بھی سرد پڑ جاتا ہے۔" (شوپنہائر)

"____ اکثر لوگ اپنی محبوبہ سے فیض یاب ہونے کے بعد عشق و محبت کو بالائے طاق رکھ دیتے

ہیں۔ یہ عین فطرتی ہے۔ کیا ایسا عشق بھی ممکن ہے جس میں یہ بات نہ ہو۔"
(ڈزنگ)

"۔۔۔۔۔ عشق میں لذت کم اور درد زیادہ ہے۔ لذت ایک واہمہ ہے۔ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ عشق سے اجتناب کیا جائے۔ یہ محض جنسی جذبے کی کارفرمائی ہے۔ اس سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو آختہ کرا لے۔"
(ہارٹ مان)

"۔۔۔۔۔ بعض گمراہوں کو عشق سوجھتا ہے اور اس سے کمال درجے کی جہالت غرض اصلی جماع سے پائی جاتی ہے اور قوت بہیمی میں چوپایوں سے بھی بڑھ جاتا ہے اس لیے کہ چوپایہ اپنی شہوت کو کسی نہ کسی طرح دور کر دیتا ہے اور عاشق ایک خاص شخص کے سوا اور کسی طرح اپنی شہوت رفع نہیں کر سکتا یہاں تک کہ اس کے لئے ذلت پر ذلت اور غلامی اٹھاتا ہے۔"
(غزالی، احیاء العلوم)

"۔۔۔۔۔ عشق کے نام پر بہت کچھ بکواس کی جاتی ہے اور اسے ضرورت سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ لوگ ایسے باتیں کرتے ہیں جیسے عشق دنیا کی عظیم ترین قدر ہے۔ افلاطون نے دلکش پیرائے میں جذباتی نفس پروری کا ذکر کیا ہے۔ قدماء کا یہ رویہ عشق سے متعلق مناسب اور قابل فہم تھا۔ مسلمانوں کے صحت مند حقیقت پسندانہ نقطہ نظر سے اسے ایک جسمانی ضرورت ہی سمجھا جاتا ہے جیسائیت میں نوفلاطونی جذبات ممزوج ہوئے جس نے اسے زندگی کا ایک اہم مقصد اور جواز بنا دیا لیکن عیسائیت غلاموں کا مذہب تھا۔ اس نے کچلے ہوئے ستم رسیدہ لوگوں کو بہشت کی بشارت دی تاکہ ان کی حالیہ زندگی کے مصائب و آلام کی تلافی ہو سکے۔ دوسرے منشیات کی طرح عشق کے نشے نے بھی نشہ کرنے والوں کو مضمحل اور بے حس کر دیا۔ اس نشے نے ہماری قوت ارادی کو سلب کر لیا ہے اور ہمیں بزدل بنا دیا ہے۔ جدید دور میں ہم جان گئے ہیں کہ ہمیں دنیا کی اور

بہت سی چیزیں عشق کی بہ نسبت زیادہ عزیز ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ صرف احمق اور
کمزور طبع لوگوں کے اعمال ہی عشق سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود ہم اس
کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ کتابوں میں ہشیر پر عشق و محبت کے بارے میں
واہی تباہی بکے جا رہے ہیں جس سے سکندریہ کے غلاموں نے دھوکا کھایا تھا۔"[1]

حیاتیاتی پہلو سے جنسی خواہش کھانے کی جبلت سے پیدا ہوئی ہے۔ بوسے میں دونوں کا امتزاج موجود ہے۔ فرائڈ کہتا ہے کہ عشق اور بھوک ماں کے پستانوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ بوسہ لینے کی تمنا اور محبوب کے رخسار و گلو وغیرہ کو چومنے کی خواہش اس بات کا ثبوت ہے کہ منہ میں خوراک اور انسانی جبلتیں جمع ہو گئی ہیں۔ اس کے خیال میں جب جنسی جبلت اپنی اصل منزل یعنی جنسی تشفی سے بھٹک جاتی ہے یا اس تک پہنچ نہیں پاتی تو اس محرومی کو عشق کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ عشق کو دو رخا سمجھتا ہے یعنی جذبہ محبت میں نفرت بھی شمول ہے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے فرائڈ سے لکھ کر استفسار کیا کہ آیا جنسی جبلت سے علاحدہ بھی عشق کا کوئی وجود ہے۔ فرائڈ نے جواب میں لکھا۔

"جناب من میں آپ کی درخواست پوری کرنے سے قاصر ہوں۔ آپ بہت زیادہ کا
مطالبہ کرتے ہیں۔ آج تک مجھے اس بات کی جرأت نہیں ہو سکی کہ میں عشق کی ماہیت
پر کوئی مفصل بیان دے سکتا۔ میرے خیال میں اس کے بارے میں ہمارا علم بہت محدود ہے۔"

فرائڈ کے اس خط سے مفہوم ہوتا ہے کہ وہ جنسی خواہش سے الگ عشق کا تصور کرنے سے قاصر ہے۔ ایرک فروم اور کرن ہورنی نے فرائڈ سے اختلاف کیا ہے۔ ایرک فروم کہتا ہے کہ جنس ہی عشق کی بنیاد نہیں ہے نہ محض جنسی جذبے کی تشفی یا محرومی سے انسانی کردار کی تشکیل ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان معاشرتی وجود ہے، اس کے جذبہ عشق میں جنس کے علاوہ معاشرتی علائق بھی دخیل ہوتے ہیں۔ کرن ہورنی کہتی ہیں کہ عشق کا مطلب خود سپردگی ہے کسی شخص کا اپنے آپ کو بے اختیار اپنے محبوب کے سپرد کر دینا ہی عشق ہے۔ جو شخص جتنا زیادہ خود سپردگی کا اہل ہوگا اتنے ہی زیادہ

---

[1] سومرسٹ مام، کرسمس ہالیڈے۔

عشق سے بہرہ مند ہو گا۔ جو عورت یا مرد کامل سپردگی کے قابل نہ ہو وہ کسی سے حقیقی محبت نہیں کر سکتا۔ اس نوع کی عورت سرد مہر ہوتی ہے اور اس قسم کا مرد کسی کا مخلص دوست نہیں بن سکتا۔ فرائڈ کے خیال کے برعکس کرن ہورنی انا کی شکست کو عشق کا لازمہ سمجھتی ہیں۔ کئی ارباب نظر عشق کو محض حیوانی جذبے کی آسودگی ہی نہیں سمجھتے بلکہ ایک اعلٰے وارفع جذبہ خیال کرتے ہیں جس کے اثرات انسان کے ذہن وقلب پر صالح اور رفعت بخش ہوتے ہیں۔

"—— عشق بے مایہ اور گھٹیا چیزوں کو باوقار بنا دیتا ہے۔" (شیکسپیر)

"—— عشق سب سے بڑا معجزہ ہے۔ یہ ایک معمولی کلرک کو فرشتہ بلکہ دیوتا بنا دیتا ہے۔" (وکٹر ہیوگو)

"—— عشق پاکیزہ ترین جذبہ ہے اور بے شمار خوبیوں اور نیکیوں کا مصدر ہے۔ یہ اعلٰے کارنامے انجام دینے کی تحریک کرتا ہے اور تمام عظماء اس سے متاثر ہوئے ہیں۔" (مولیئر)

"—— عشق دُنیا کا سب سے سُریلا نغمہ ہے۔" (بالزاک)

"—— ایک فرومایہ، دنی الطبع شخص عشق اور فلسفے سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتا۔" (ول ڈیوراں)

"—— عشق قوت ہے، توانائی ہے، رُوح کے تمام عوارض کا واحد علاج ہے، عشق ہر شخص کی دسترس میں ہے۔ اس پُرآشوب عالم میں صرف عشق ہی ایک مستقل اور محکم عنصر ہے۔ عشق ایسی لازوال دولت ہے جس میں دوسرے حصّہ نہیں بٹا سکتے۔ فیلڈز نے کہا ہے کہ عشق نہ صرف فرد کے دل کو گرماتا ہے بلکہ ہر اُس شخص کو متاثر کرتا ہے جو اُس کے قریب آتا ہے[1]۔" (فرینک کاریریو)

"—— میں اُن عورتوں کا شکر گذار ہوں جن کے عشق سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ اگر میں محبت نہ کر سکتا تو نہایت تنگ نظر ہوتا[2]۔" (برٹرنڈ رسل)

"—— ایک عورت نے کہا " جب میں عشق کر رہی ہوں تو میرا اعتماد انسانیت پر بحال

---

[1] THE SEXUALLY ADEQUATE MALE [2] AUTOBIOGRAPHY

ہوجاتا ہے، ہر شے کامل و اکمل دکھائی دیتی ہے، ہر چیز حسین لگتی ہے، ہر شے میں خواب ناک شعریت پیدا ہو جاتی ہے۔"[1] (فرائڈ)

"——عشق جنسی خواہش اور دوستی کے امتزاج کا نام ہے۔" (سومرسٹ ماہم)

"——فرائڈ کا یہ خیال صحیح نہیں کہ خللِ ذہن جنسی فاقہ زدگی کا نتیجہ ہے۔ فی الاصل خللِ ذہن عشق و محبت سے محرومی کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔" (تھیوڈور رائک)

برٹرنڈ رسل نے پُرمغز بحث کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عشق محض جنسی خواہش ہی نہیں ہے بلکہ اُس احساسِ تنہائی کا مداوا ہے جو اس بے کراں کائنات اور معاندانہ معاشرے میں تمام عورتیں اور مرد محسوس کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں:[2]

"عشق صرف جنسی خواہش تک محدود نہیں ہے۔ یہ اُس احساسِ تنہائی کا جو اکثر مردوں اور عورتوں کے لیے زندگی بھر کا عذاب بن جاتا ہے سب سے بڑا مداوا ہے۔ اکثر لوگ اربابِ دنیا کی سرد مہری سے دہشت محسوس کرتے ہیں اور ابنائے زمانہ کے ظلم و ستم سے ڈرتے ہیں۔ اُنہیں محبت کی آرزو ہوتی ہے جسے اکثر اوقات مرد درشتی، سرکجھنی اور غنڈے پن میں چھپاتے ہیں اور عورتیں اس پر بدمزاجی اور عیب جوئی کے پردے ڈال لیتی ہیں۔ پُرجوش باہمی محبت اس احساسِ تنہائی کا خاتمہ کر دیتی ہے، انا کی سنگین دیواروں کو توڑ پھوڑ دیتی ہے اور ایک نئے آدمی کو جنم دیتی ہے جو یک جان دو قالب ہوتا ہے۔ فطرت نے انسان کو تنہا رہنے کے لیے پیدا نہیں کیا کیوں کہ بنی نوعِ انسان فریقِ ثانی کے بغیر حیاتیاتی تقاضے پورے نہیں کر سکتے نہ مہذب اشخاص عشق کے بغیر جنسی جبلت کی بھرپور تشفی کر سکتے ہیں۔ اس جبلت کی کامل تسکین نہیں ہوتی جب تک کہ انسان پوری خود سپردگی سے فریقِ ثانی سے تعلق پیدا نہ کرے۔ جن لوگوں کو پُرمسرت محبت کی دلی رفاقت اور بے تکلفی کا

---

[1] EVERYDAY PSYCHOLOGY
[2] MARRIAGE AND MORALS

تجربہ نہیں ہوا وہ زندگی کی بہترین نعمت سے محروم رہے ہیں، شعوری طور پر نہ سہی لاشعوری طور پر انہیں اِس محرومی کا احساس ہوتا ہے اس کے نتیجے میں انہیں جو مایوسی ہوتی ہے وہ انہیں رشک وحسد، جور وستم اور جبر وتشدد کی طرف مائل کر دیتی ہے۔"

برٹرنڈ رسل کا یہ خیال نہایت قابلِ قدر اور فکر انگیز ہے کہ انسان عشق کی بدولت اپنے احساسِ تنہائی پر قابو پاکر سچی محبت سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔ عشق کے موضوع پر بات کرتے ہوئے مارسل پروست کہتا ہے کہ ہم کسی حقیقی شخص سے پیار نہیں کرتے بلکہ اُس آدمی سے محبت کرتے ہیں جسے خود ہمارے تخیل نے تخلیق کیا ہو۔ ایک عاشقِ صادق اپنے محبوب کی خامیوں اور کوتاہیوں سے قطع نظر کر لیتا ہے اور اُسے مثالیاتی مقام عطا کرتا ہے۔ والٹیر نے اپنی لغاتِ فلسفہ میں کہا ہے کہ انسان بالطبع ہر شے کو مثالیاتی رنگ دے دیتا ہے چنانچہ اُس نے عشق کو بھی مثالیاتی بنا دیا ہے۔ اودن کہتا ہے کہ محبوب کی صورت میں ہم اپنی ہی ذات سے عشق کرتے ہیں۔ ہماری پہلی اور آخری محبت اپنی ہی ذات کی محبت ہوتی ہے۔ جب کسی عاشق کی محبوبہ اُسے دھتا بتا دیتی ہے تو اس سے جو صدمہ وہ محسوس کرتا ہے وہ اس لئے نہیں ہوتا کہ اُس کی محبوبہ اُسے چھوڑ کر چلی گئی ہے بلکہ اِس لئے ہوتا ہے کہ اُس کی انا کو ٹھیس لگتی ہے اور اُس کا اعتماد اپنی کشش پر سے اُٹھ جاتا ہے۔ حسد عشق کا لازمہ اِسی لئے ہے کہ عاشق کے دل میں یہ شبہ گھر کر لیتا ہے کہ اُس کا رقیب اُس سے زیادہ پُرکشش اور خوبصورت ہے۔ اس احساس سے اَنا کو جراحت ہوتی ہے جو عذاب ناک تلخی کا سبب بن جاتی ہے۔

جن جن لوگوں نے عشق کیا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ عشق کیا ہے اور جو بدنصیب اس سے محروم رہے ہیں اُنہیں سمجھانے کی کوشش بے سُود ہے۔ بہرکیف جیسا کہ ہم نے کہا تھا علمی سطح پر عشق جنسی کشش کی شائستہ اور ارفع صورت ہے۔ ظاہراً ایک مہذب معاشرے میں جنسی جبلت کے اظہار میں شائستگی اور رفعت پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ انسان مہذب معاشرے کا فرد ہونے کی حیثیت سے عشق کا اہل ہوا ہے۔ وحشی قبائل کے افراد جو تہذیب وتمدن کے برکات اور اخلاقی قدروں سے ناآشنا ہیں عشق کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ انسان ذی عقل وذی شعور ہونے کے باعث عشق ومحبت سے روشناس ہوا۔ جب جنسی جبلت میں عقل وشعور کا شمول ہوا تو انسان نے حیوانی جنسیت سے انسانی عشق کی طرف پہلا قدم اُٹھایا تھا۔ اس سے قبل وہ

بھی وحوش کی طرح اپنی جنسی تشفّی کرلیا کرتا تھا گویا جذبۂ عشق عقل و خرد ہی کا پروردہ ہے۔ فرائڈ اور اُس کے پیرو جو انسان کے تمام ذہنی و معاشرتی عوارض کا علاج بے محابا جنسی ملاپ میں تلاش کرتے ہیں یہ نہیں سوچتے کہ بے مہری اور سرد دلی کی مقاربت انسان کو دوبارہ چوپایہ بنادے گی۔ انسانی سطح پر جنسی خواہش کی تسکین کے لئے عشق و محبت ضروری ہے کیوں کہ عشق انسان کو بھرپور مسرّت سے سرشار کردیتا ہے —— ایسی مسرت جو محض جنسی ملاپ سے ارزانی نہیں ہوا کرتی۔

برٹرنڈ رسل نے کہا ہے کہ بہترین زندگی وہ ہے جو علم سے راہنمائی حاصل کرے اور عشق سے فیضان پائے۔ عشق انسان کی اَنا اور نرگسیّت کی بندشوں کو جو کٹر، خود بیں، بے رحم، قنوطی اور خود غرض بنا دیتی ہیں، توڑ پھوڑ دیتا ہے اور عشق کے طفیل وہ ایثار، بے نفسی، مروت، ہمدردی اور انسان دوستی کے خالصتاً انسانی احساسات سے آشنا ہوتا ہے۔ مولانا رومؔ نے نہایت دلکش پیرائے میں عشق کے صالح اثرات کا ذکر کیا ہے ؎

از محبّت تلخ ہا شیریں شود	وز محبت مِسّہا زرّیں شود
از محبّت دُرد ہا صافی شود	وز محبت درد ہا شافی شود
از محبّت خار ہا گُل می شود	وز محبت سرکہا مُل می شود
از محبّت دار تختے می شود	وز محبّت یار بختے می شود
از محبّت سجن گلشن می شود	وز محبت دیو حُورے می شود
از محبّت سنگ روغن می شود	وز محبّت موم آہن می شود
از محبّت خار سوسن می شود	وز محبّت تار روشن می شود

شادی

شادی کا معروف تصوّر یہ ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت باہم مل جل کر ازدواجی زندگی گزارنے پر رضامند ہو جاتے ہیں اور اُن کے مابین چند مذہبی رسوم کی ادائیگی کے ساتھ یا ان کے بغیر ایک معاہدہ ہو جاتا ہے جس کی پابندی دونوں پہ لازم ہوتی ہے۔ تاریخ تمدن میں یہ تصوّر زرعی انقلاب کے بعد رُونما ہوا تھا۔ زرعی انقلاب سے پہلے کی صدیوں سے متعلق اِس کے بارے میں قیاس آرائیاں ہی کی جا سکتی ہیں۔ یا موجودہ وحشی قبائل کے طرزِ بُود و ماند کے مشاہدے سے نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ بہرکیف یہ طے ہے کہ شادی کا تصوّر شروع ہی سے کنبہ کے ساتھ وابستہ رہا ہے۔ کنبے کی تشکیل سے متعلق کئی نظریات ہیں۔ ڈارون اور اَنگلس کے خیال میں کنبے کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک تنومند مرد کئی عورتوں اور بچوں کو ساتھ لئے لئے پھرتا تھا اور ان کی کفالت کیا کرتا تھا۔

ویسٹر مارک[1] نے بھی اس خیال کی تائید کی ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ جنسی حسد مرد کی فطرت میں شامل ہے اس لئے وہ اپنی عورت یا عورتوں میں کسی غیر مرد کا تصرّف گوارا نہیں کر سکتا اِسی بنا پر وہ مادری نظام معاشرہ کی اوّلیت سے انکار کرتا ہے جس میں عورت کو معاشرے کا محور یا مرکز سمجھا جاتا تھا لیکن یہ کہہ کر وہ اپنے نظریے کی نفی بھی کر دیتا ہے کہ بعض اقوام میں ایک عورت کے ساتھ متعدد مرد نکاح کرتے رہے ہیں۔ بریفالٹ[2] کہتا ہے کہ پرندوں اور حیوانات میں ماں بچے کا رشتہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ کنبہ ماں بچوں پر مشتمل ہوتا ہے جس میں باپ کی حیثیت محض ثانوی ہوتی ہے۔ اِس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ انسانی معاشرے کا آغاز مادری نظام سے ہوا تھا۔ ڈاکٹر زوکرمان نے لکھا ہے کہ حیوانات اور پرندے خاص خاص موسموں میں اکھٹے ہو کر بچے پیدا کرتے ہیں کیوں کہ ان کا جنسی اُبال خاص موسموں سے وابستہ ہوتا ہے جب کہ انسان ہر موسم میں جنسی ملاپ پر مستعد رہتا

---

[1] A HISTORY OF HUMAN MARRIAGE. [2] MOTHERS

ہے۔ چنانچہ جنسی ملاپ کے اس تواتر و مداومت ہی نے انسانی کنبے کو جنم دیا تھا۔ باخوفن[1] نے تاریخی شواہد سے ثابت کیا ہے کہ انسانی نظامِ معاشرہ ابتدا میں مادری تھا۔ اُس نے شادی کے ارتقاء کے تین مراحل گنائے ہیں۔ (۱)۔۔۔ جنسی آزادی کا دَور (۲)۔۔۔ شادی جس میں عورت کو مرد پر فوقیت حاصل تھی۔ (۳)۔۔۔ شادی جس میں مرد کو عورت پر برتری حاصل ہو گئی۔ زرعی انقلاب کے بعد مرد کو عورت پر سیادت حاصل ہو گئی اور پدری نظامِ معاشرہ معرضِ وجود میں آیا۔ جو آج بھی اکثر مہذب اقوام میں باقی ہے۔ اگرچہ صنعتی انقلاب کے پھیلنے کے ساتھ اس کی بُنیادیں متزلزل ہو رہی ہیں۔ بعض اقوام اور قبائل میں مادری نظامِ معاشرہ کے آثار صدیوں تک باقی رہے مثلاً مصرِ قدیم میں عورت کو بڑا معزز مقام دیا گیا تھا۔ وہ املاک کی وارث ہوتی تھی اور ورثہ اُس کی طرف سے بیٹیوں کو منتقل ہوتا تھا۔ چنانچہ ورثے کو محفوظ رکھنے کے لئے سلاطین و اُمراء اپنی بہنوں اور بیٹیوں سے نکاح کر لیتے تھے۔ جزائر ٹروبریانڈ میں آج بھی عورت کی سیادت برقرار ہے۔ میلی نوسکی[2] کہتا ہے کہ یالی نیشیا میں مادری نظامِ معاشرہ قائم ہے اور وہاں کے باشندوں میں باپ کے لئے کوئی لفظ موجود نہیں ہے۔ جنسی ملاپ کو مرد کا حق نہیں سمجھا جاتا بلکہ یہ بیوی کا احسان اپنے شوہر پر ہوتا ہے۔ شوہر گھر کے کام کاج میں بیوی کا ہاتھ بٹاتا ہے اور بچوں کی پرورش کرتا ہے۔ بچے اپنے باپ کے بجائے اپنے ماموں کو اپنا سرپرست خیال کرتے ہیں۔ انجلز کے خیال میں شادی ایک بورژوا ادارہ ہے جو اقتصادی ضروریات کے تحت شکل پذیر ہوا تھا۔ جب دوسری اجناس کی طرح عورت کو بھی ذاتی املاک میں شمار کرنے لگے۔ کھیتی باڑی میں مرد کو عورت اور بیٹوں کی امداد کی ضرورت تھی جس کے تحت کُنبے نے واضح صورت اختیار کی اور شادی کا رواج ہوا۔ بمرورِ زمانہ سے عورت مرد کی کنیز بن کر رہ گئی۔ زرعی معاشرے میں عورت ایک ہی مرد سے وابستہ ہو گئی کیوں کہ مرد اپنی املاک اپنے ہی صُلبی فرزندوں کو ورثے میں چھوڑنا چاہتا تھا۔ لیکن مرد خود کئی کئی بیویاں

---

[1] THE RIGHT OF THE MOTHER.

[2] SEX AND REPRESSION IN SAVAGE SOCIETY.

اور کنیزیں رکھنے کا مجاز تھا اور کسبیوں سے بھی جی بہلاتا تھا۔ ان حالات میں عورت کا اصل مقام بحال نہ رہ سکا اور وہ گائے، بیل، بھیڑ بکری کی طرح مرد کی ذاتی املاک بن کر رہ گئی۔ چنانچہ حمورابی کے قوانین میں عورت کو مرد سے فروتر کہا گیا ہے اور مرد کو اس بات کا حق دیا گیا ہے کہ وہ جیسا سلوک چاہے اپنی زوجہ سے کرے۔ بابل میں شوہر اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کے ساتھ ناگفتہ بہ حالت میں پکڑ لیتا تو وہ اُسے جان سے مار دینے کا مجاز تھا۔ رومہ میں کیٹو کے ضابطۂ فوجداری کی رو سے مرد اپنی عورت کو کسی غیر مرد کے ساتھ خلوت میں دیکھ کر اُسے بلا تامل موت کے گھاٹ اُتار دینے کا حق رکھتا تھا لیکن عورت اپنے شوہر کو کسی غیر عورت کے ساتھ اختلاط کرتے ہوئے پکڑ لیتی تو اُسے لب کشائی کی اجازت بھی نہیں تھی۔ بردہ فروشی کا رواج ہوا تو عورت برسرِ بازار بکنے لگی۔ لونڈی خریدتے وقت گاہک اُس کا بدن کھول کر ہر طرح سے اطمینان کر لیتے تھے۔ سلاطین و اُمراء کی حرم سراؤں میں سیکڑوں لونڈیاں رکھی جاتی تھیں اور ان کی تعداد سے کسی بادشاہ یا رئیس کے مرتبے کا تشخص کیا جاتا تھا۔ شاہانِ وقت کے لئے حسین منتخب عورتیں محل میں رکھی جاتی تھیں۔ آزاد لکھتے ہیں[1]

"ترکوں کا تورہ (شاہی قانون) تھا کہ جس عورت پر بادشاہ خواہش سے نظر کرے خاوند پر حرام ہو جاتی تھی۔ آج سے پندرہ یا سولہ برس پہلے میں نے خود دیکھا کہ تورۂ چنگیزی کا اثر باقی چلا آتا تھا۔ شاہانِ بخارا بھی جس عورت پر خواہش ظاہر کرتے تھے اُس کا وارث اُسے آراستہ کر کے حاضر کر دیتا تھا۔ پسند آئی تو حرم میں داخل رہتی ورنہ رخصت ہو جاتی اور جب تک زندہ رہتی اپنے ہم چشموں میں فخر کرتی کہ مجھے یہ برکت حاصل ہوئی تھی۔"

اکبر کے عہد میں بھی تورۂ چنگیزی پر عمل کیا جاتا تھا۔ مُلا عبدالقادر بدایونی کے بقول عبدالواسع کی بیوی نہایت حسین تھی۔ اکبر کو علم ہوا تو کہا اُسے طلاق دے کر میرے پاس بھیج دو۔ اُس نے ایسا

---

[1] دربارِ اکبری [2] منتخب التواریخ

ہی کیا۔ اکبر دلی کے گھر گھر میں خواجہ سرا اور عورتیں بھیج کر حسین لڑکیوں کا کھوج لگایا کرتا تھا اور اُن سے مُتعہ کر کے حرم میں داخل کر لیتا تھا۔ وتسیاین[1] لکھتا ہے کہ برار کے ملک میں لوگ اپنی خوبصورت بیویاں راجہ یا منتری کو بطور تحفہ دیتے تھے۔ ابن بطوطہ[2] لکھتا ہے۔

"سماٹرا میں یہ دستور ہے کہ کسی امیر یا رعیّت یا بازاری کی لڑکی جوان ہوتی ہے تو سلطان کو خبر دی جاتی ہے۔ سلطان عورت کو دیکھنے کے لئے بھیجتا ہے۔ اگر پسند آئی تو اُس کے ساتھ نکاح کر لیتا ہے۔ لوگ تمنا کرتے ہیں کہ ہماری لڑکی سلطان کو پسند آجائے کیوں کہ بادشاہ کے ساتھ نکاح ہوتے ہی اُس کے باپ کا مرتبہ بڑھ جاتا تھا۔"

اقوامِ قدیم میں بادشاہ یا خاقان کی موت پر اُسکی محبوب لونڈیاں اُس کی میّت کے ساتھ زندہ دفن کر دی جاتی تھیں تاکہ اگلے جہان میں وہ اُن سے جی بہلا سکے۔ ہندوؤں کی ستی کی رسم اسی روایت سے یادگار تھی۔ برہمن امیر گھرانوں کی عورتوں کو اُن کے زیوروں کے لالچ میں شوہر کی نعش کے ساتھ آگ میں جھونک دیتے تھے۔ سلاطین اور اُمرا کو حقِ شبِ زفاف حاصل تھا یعنی ہر دلہن کو اپنی عروسی کی رات بادشاہ یا جاگیردار کے یہاں بسر کرنا پڑتی تھی۔ ازمنۂ وسطیٰ کے پادری جاگیردار بھی جو تجرد کے پابند تھے یہ حق باقاعدگی سے وصول کرتے تھے۔ بابل میں شوہر اپنی سرکش بیوی کو لونڈی بنا کر سرِ بازار بیچ دیتا تھا۔ جنگ کی صورت میں مفتوح قوم کی عورتیں فاتحین پہ مباح ہو جاتی تھیں اور وہ اُن سے بلا تکلف فیض یاب ہوتے تھے۔ یہ روایت آج بھی باقی و برقرار ہے۔ نیم مہذب اور مہذب اقوام مثلاً یونانی اور ہندی میزبان اپنی بیوی یا لونڈی کو ازراہِ تواضع رات کے وقت مہمان کے پاس بھیج دیتا تھا۔ ویسٹر مارک کہتا ہے کہ مہمانوں کو عورتیں پیش کرنا آدابِ میزبانی میں شامل تھا۔ حاصل یہ کہ زرعی انقلاب کے بعد پدری نظامِ معاشرہ میں عورت حقیر و ذلیل ہو کر رہ گئی اور اُسے اپنے جائز فطری حقوق سے محروم کر دیا گیا۔ منوسمرتی میں لکھا ہے

---

[1] کام شاستر   [2] سفرنامہ

"عورت، بیٹے، غلام کی کوئی املاک نہیں ہوتی۔"

مُلا محسن فانی لکھتے ہیں[1]

" (مجوسیوں کے یہاں) عورتوں کے واسطے نیایش یا عبادت کا حکم نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ دن میں تین مرتبہ اپنے خاوند کے پاس جاکر اُس کی رضاجوئی کریں۔"

گویا مرد عورت کا خدا بن گیا۔ ہندوؤں کے یہاں آج بھی عورت اپنے شوہر کو "پتی دیو" کہتی ہے۔

علم الانسان کے طلبہ نے شادی کی کئی قسمیں گنائی ہیں جو مختلف قوموں میں رائج رہی ہیں۔ یہودیوں میں یہ رواج تھا کہ کوئی نوجوان کسی شخص کی سات برس تک خدمت کرتا تو وہ شخص اس کے عوض میں اُسے اپنی بیٹی بیاہ دیتا تھا۔ جناب یعقوب نے اپنے ماموں لابان کی سات برس تک خدمت کی تاکہ وہ اُنہیں اپنی بیٹی راخل سے بیاہ دے لیکن اُس نے دھوکے سے دوسری بیٹی بیاہ دی۔ راخل سے بیاہ کرنے کے لئے اُنہیں اپنے ماموں کی سات برس اور خدمت کرنا پڑی۔ عہد نامۂ قدیم سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں دو سگی بہنوں سے نکاح کرنا جائز تھا جس پر عہد جاھلیت کے عرب بھی عمل کرتے رہے حتیٰ کہ اسلام نے اسے ممنوع قرار دیا۔ قدیم زمانے کے یہودی اپنی سوتیلی بہن سے بھی نکاح کر لیا کرتے تھے۔ افریقہ اور آسٹریلیا کے بعض قبائل میں رواج تھا کہ وہ اپنی بہنوں یا بیٹیوں کا تبادلہ کر لیتے تھے۔ بعض اوقات شوہر آپس میں سگے بھائی اور اِن کی بیویاں سگی بہنیں ہوتی تھیں۔ ایتھنز والوں میں سوتیلی بہن سے نکاح کر لیا جاتا تھا۔ بعض وحشی قبائل میں ماں اور بیٹی ایک ہی شخص کی منکوحہ ہوتی تھیں۔ فراعین مصر اور کسرائے ایران اپنی سگی بہنوں اور بیٹیوں سے نکاح کر لیتے تھے۔ راجہ داہر والئ سندھ نے اپنی سگی بہن رانی بائی سے بیاہ رچایا تھا۔ ایک ہی بیوی کے متعدد شوہر ہونے کا رواج بھی عام تھا۔ آج بھی بنگال کے سنتھالوں، جنوبی ہند کے نائروں اور ٹوڈوں میں یہ روائت باقی ہے۔ کئی اقوام میں ایک قبیلے کے مرد دوسرے قبیلے کی لڑکیوں سے گروہی نکاح کر لیتے تھے۔ افریقہ، جاپان قدیم، چین قدیم، ہند اور اسرائیل

---

[1] دبستانِ مذاہب

میں دختر فروشی کا رواج تھا۔ باپ اپنی بیٹی کی قیمت وصول کرتا تھا۔ ایران کے دیہات میں آج بھی ماں شیر بہا یعنی اُس دودھ کی قیمت دُلہا سے وصول کرتی ہے جو اُس نے اپنی بیٹی کو پلایا تھا بروہی قبیلے میں اس قیمت کو شیر پیلی کہتے ہیں اور باپ جو قیمت اپنی بیٹی کی وصول کرے اُسے لب[1] کہا جاتا ہے۔ کالدیوں کے یہاں شادی اپنے ہی کنبے اور ذات میں کرنا پڑتی تھی۔ یہودیوں نے یہ قانون کالدیوں ہی سے مستعار لیا تھا۔ اس کے برعکس بعض اقوام میں اپنے ہی طوطم کے ماننے والوں اور قبیلے والوں میں شادی کرنا ممنوع تھا۔ گوتم بدھ نے رشتے کے چھٹے درجے تک شادی کو ممنوع قرار دیا تھا۔ ادریسی[2] کہتا ہے کہ بلہرا کے ملک میں بیاہی ہوئی عورتوں اور منسوبہ لڑکیوں کے سوا جملہ عورتوں سے عارضی تمتع کی اجازت تھی۔ یہودیوں میں یہی رواج تھا لیکن جو شخص کسی کنواری غیر منسوبہ کی آبرو لیتا اُسے اُس کے ساتھ نکاح کرنا پڑتا تھا۔ سکاٹ لینڈ میں ایک قانون یہ تھا کہ جب ایک نوجوان مرد اور عورت شواہد کے سامنے بیان دیتے کہ وہ میاں بیوی کی طرح مل کر رہتے ہیں تو ان کا نکاح خود بخود ہو جاتا تھا۔ نیوگنی کے ماسم اپنی بیویاں بے تکلف دوسروں سے تبدیل کر لیتے تھے۔ سپارٹا میں شادی کا دستور یہ تھا کہ برابر تعداد میں نوجوانوں اور کنواریوں کو ایک تاریک کمرے میں بند کر دیتے تھے۔ جہاں وہ اپنی زندگی کا ساتھی منتخب کر لیتے تھے۔ اہل سپارٹا کا خیال تھا کہ اس نوع کا انتخاب محبت کی شادی سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔ روما میں شادی تین طرح کی ہوتی تھی۔ پہلی صورت میں سادہ مذہبی تقریب ہوتی تھی۔ دوسری میں باپ جھوٹ موٹ اپنی بیٹی کو داماد کے ہاتھ بیچ دیتا تھا۔ تیسری صورت یہ تھی کہ جو لڑکا اور لڑکی ایک برس تک میاں بیوی کی طرح رہتے ان کا نکاح ازخود ہو جاتا تھا۔ سٹرابو نے ارسٹوبولس کے حوالے سے لکھا ہے کہ ٹیکسلا میں ایک عجیب رسم تھی ، جو لوگ افلاس کے باعث اپنی جوان بیٹیوں کا بیاہ نہ کر سکتے وہ ایک دن انہیں اکٹھا کر کے ڈھول باجے بجاتے ہوئے منڈی میں لے آتے تھے جہاں لوگوں کا جمگھٹ لگ جاتا۔ جو شخص شادی کا خواہش مند ہوتا اُسے مطلوبہ لڑکی

---

[1] قانون اسلام ، جعفر شریف [2] نزھتہ المشتاق

کا بدن کھول کر دکھایا جاتا تھا۔ بعض اقوام میں یہ رواج تھا کہ ایک قبیلے کے مرد مسلح ہو کر اچانک کسی دوسرے قبیلے کی قیام گاہ پہ دھاوا بول دیتے اور کنواری لڑکیاں بھگا لے جاتے تھے۔ رومولس اور اُس کے ساتھیوں نے اِسی طرح ایک تہوار پر سبائن قبیلے کی پانچ سو ستائیس لڑکیوں کو جبراً اغوا کیا تھا۔ اشتمالی انقلاب سے پہلے کرغیزوں میں یہ رواج تھا کہ ایک دوشیزہ اپنے صبا رفتار گھوڑے پر سوار ہو جاتی اور اُس سے نکاح کرنے والے خواہش مند نوجوان گھوڑوں پہ سوار اُسے پکڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ جو نوجوان قریب آتا لڑکی اُسے زناٹے کا چابک رسید کرتی تھی۔ آخر وہی نوجوان کامیاب ہوتا جسے لڑکی چاہتی تھی۔ ہندوؤں میں راجے اپنی بیٹیوں کو بیاہنے کے لئے سوئمبر رچاتے تھے۔ لڑکی جس نوجوان کے گلے میں مالا ڈال دیتی وہی اُس کا شوہر ہو جاتا تھا۔ سیتا اور دروپدی کا بیاہ اِسی طرح کیا گیا تھا۔ محمود شکری آلوسی نے بلوغ الارب[1] میں لکھا ہے کہ ماقبل اسلام کے عربوں میں شادی کی مندرجہ ذیل قسمیں رائج تھیں۔

نکاح الاستبضاع :۔ خاوند اپنی بیوی سے کہتا کہ حیض سے پاک ہو کر فلاں سردار کے پاس جانا اور اُس سے صحبت کرنا اُس کا مقصد یہ ہوتا کہ کسی شجاع اور نجیب کا نطفہ لیا جائے۔ اِن ایام میں وہ خود اپنی بیوی سے الگ رہتا تھا۔ نکاح المتعہ :۔ یعنی ایک مدتِ مقررہ کے لئے عورت سے شادی کرنا۔ مقررہ مدت کے بعد دونوں میں جدائی ہو جاتی تھی۔ اسے نکاح موقت اور صیغہ بھی کہتے ہیں۔ نکاح البدل :۔ دو اشخاص اپنی بیویاں بدل لیتے تھے۔ نکاح الشغار :۔ ایک دوسرے کی بیٹیوں، بھتیجیوں وغیرہ کا تبادلہ کر کے نکاح کر لیتے تھے۔ ایک صورت یہ تھی کہ بہت سارے لوگ مل کر کسی جھنڈے والی (کسبی) کے پاس جاتے۔ وضع حمل کے بعد وہ کسبی کسی قیافہ شناس کو بلاتی اُسے بتاتی کہ اُس نے فلاں فلاں مرد سے ایک ہی بار خلوت کی تھی قیافہ شناس نومولود بچے کے چہرے کے نقوش دیکھ کر بتا دیتا تھا کہ یہ فلاں آدمی کا بیٹا ہے اس پر وہ شخص اُس بچے کو اپنا بیٹا تسلیم کر لیتا تھا۔ نکاح کی اِن مختلف صورتوں میں اسلام نے نکاح المتعہ کو برقرار

---

[1] ترجمہ پیر محمد حسن

رکھا۔ جناب رسالتِ مآب اور شیخِ اول کے زمانے میں صحابہ مُتعہ کرتے رہے۔ بعض اوقات مُٹھی بھر جو کے عوض مُتعہ ہو جاتا تھا۔ شیخِ ثانی نے اسے ممنوع قرار دیا لیکن بعض صحابہ کبار اور تابعین بدستور مُتعہ کے قائل رہے[1]۔ فیروز شاہ بہمنی نے مُتعہ کے مسئلے پر مختلف فرقوں کے علماء سے تبادلۂ خیال کیا تو احناف نے اسے ناجائز قرار دے دیا۔ شیعہ کہنے لگے کہ مُتعہ آنحضرت اور شیخِ اوّل کے زمانے میں ہوتا رہا۔ یہ سُن کر فیروز شاہ مُتعہ کا قائل ہو گیا اور کئی عورتوں سے مُتعہ کیا۔ جلال الدین اکبر نے بھی مُتعہ کا مسئلہ اُٹھایا۔ احناف نے اِس کی مخالفت کی۔ مُلا عبدالقادر بدایونی نے کہا کہ کہ اگر کوئی مالکی فقیہہ مُتعہ کے جواز میں فتویٰ دے تو مُتعہ ایک حنفی کے لئے بھی جائز ہو سکتا ہے۔ اکبر نے مالکی قاضی حُسین عرب مکی سے فتویٰ لیا اور کئی عورتوں سے مُتعہ کر لیا۔ اثنا عشری شیعہ اور مالکی سُنی شروع سے مُتعہ کے جواز کے قائل رہے ہیں۔ جانِ عالم واجد علی شاہ نے بیسیوں عورتوں سے مُتعہ کیا تھا جن میں بقول شرر لکھنوی بھنگنیں بھی شامل تھیں۔ مولوی عبدالرزاق کانپوری لکھتے ہیں[2]

"مٹیا برج میں بھی پریوں کا جمگھٹ ہو گیا اور جُملہ گل اندام کنیزوں اور طوائفوں سے مُتعہ کیا گیا کیوں کہ مُتعہ کے بغیر شاہ ان عورتوں کو دیکھنا حرام سمجھتے تھے۔"

ہندوؤں میں بیاہ کی آٹھ قسمیں ہیں جن کی تفصیل دیانند[3] نے لکھی ہے۔ ـــــ براہم وواہ:۔ دولہا دلہن کا مجرّد رہ کر علم حاصل کرنے کے بعد باہمی رضامندی سے نکاح کیا جائے۔ ـــــ آرش وواہ دولہا سے کچھ لے کر شادی کرنا۔ ـــــ پراجا پتیہ وواہ:۔ دھرم کی ترقی کو مدِ نظر رکھ کر نکاح کرنا۔ ـــــ اُسر وواہ:۔ دُولہا دولہن کو کچھ دے کر شادی کرنا۔ ـــــ سوئمبر:۔ لڑکی کو زیوروں سے آراستہ کر کے کسی بڑے یگیہ میں رتوک کا کام کرتے ہوئے داماد کے سپرد کر دینا دیو وواہ ہے۔ ـــــ گاندھرو وواہ:۔ بغیر کسی قاعدہ یا موقع کے کسی لڑکے لڑکی کا آپس میں مقاربت کر لینا۔ ـــــ راکشس وواہ:۔ جنگ کے ذریعے یا زبردستی یا فریب سے لڑکی حاصل کرنا۔ ـــــ پیشاچ وواہ:۔ سوتی ہوئی یا شراب کے

---

[1] موطا امام مالک۔ [2] یادِ ایام۔ [3] ستیارتھ پرکاش

نشے میں دھت لڑکی سے بالجبر مقاربت کرنا۔ ہندوؤں میں سپارٹا والوں کی طرح نیوگ کا رواج بھی تھا۔ منوسمرتی میں لکھا ہے[1]۔

" عورت کے ہاں شوہر سے اولاد نہ ہو تو وہ دیور یا شوہر کے کسی دوسرے عزیز سے اولاد پیدا کر سکتی ہے۔"

منوجی فرماتے ہیں۔

" جو نیوگ کی رُو سے بیوی سے ہم بستر ہونے پر مامور ہوا ہے وہ اپنے جسم پر مکھن لگا کر رات کے وقت عورت کے پاس جائے اور ایک بچہ پیدا کرے۔ دوسرا بچہ پیدا کرنے کا وہ مجاز نہیں ہے۔"

نیوگ سے جو بچے پیدا ہوتے تھے وہ بیوی کے اصل شوہر کی اولاد سمجھے جاتے تھے۔ عہد نامۂ قدیم میں لکھا ہے کہ جب عیر یہودی مرگیا تو اُس کی بیوہ کو اُس کے دیور اونان کے پاس بھیج دیا گیا تاکہ وہ اولاد پیدا کرے اور اپنے بھائی کی نسل کو جاری رکھے۔ جاہلی عربوں کی طرح سپارٹا والے بھی شجاع اور نجیب جواں مردوں کا نطفہ لینے کے لئے اپنی بیویوں کو اُن کے یہاں بھیجا کرتے تھے۔

آج کل مختلف اقوام میں شادی بیاہ کی تقریب پر جو رسوم ادا کی جاتی ہیں وہ اکثر و بیشتر قدیم زمانے سے یادگار ہیں۔ ہمارے ہاں دولہا کے سہرا باندھنے اور دلہن کے گھونگھٹ نکالنے کا مقصد اُنہیں نظرِ بد سے محفوظ رکھنا ہوتا ہے۔ دُولہا کو جنوں بھوتوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اس کے ہاتھ میں لوہے کی چھڑی دی جاتی ہے۔ دولہا دُلہن کو عروسی کے دن نہلانے کی رسم اکثر اقوام میں پائی جاتی ہے۔ ہمارے یہاں بیاہ سے چند روز پہلے دُولہا دلہن کو مانجھے بٹھایا جاتا ہے۔ اس دوران میں وہ میلے کچیلے کپڑے پہنتے ہیں۔ اس کا ایک مقصد تو اُنہیں نظرِ بد سے محفوظ رکھنا ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ بیاہ کے دن نہا کر وہ عروسی جوڑا پہنیں گے تو ان کا رنگ روپ نکھر آئے گا۔ شادی کے

---

[1] منوسمرتی۔

دوران میں دولہا دلہن سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ خاموش رہیں گے کہ اس دن ان کا باتیں کرنا شرم وحیا کے منافی سمجھا جاتا ہے۔ بعض اقوام میں شادی کے موقع پر دولہا دولہن کے ہاتھ آپس میں ملائے جاتے ہیں۔ آرسی مصحف کی رسم کا مقصد انہیں آپس میں متعارف کرانا ہوتا ہے۔ ہندوؤں میں دُلہا دُولہن کو آگ کے الاؤ کے گرد چکر لگانا پڑتے ہیں۔ ساتویں چکر پہ نکاح محکم ہو جاتا ہے۔ چکروں کے دوران میں دُولہن کا بھائی اُسے کھیلیں دیتا جاتا ہے جو وہ آگ میں پھینکتی جاتی ہے۔ انڈیمان میں دولہا کو دُلہن کی گود میں بٹھاتے ہیں مشرقی افریقہ کے بنیاکول دُلہن کو رسے سے باندھ دیتے ہیں۔ دونوں طرف اُس کے سسرال اور میکے والے کھڑے ہو جاتے ہیں اور رسہ کشی ہوتی ہے۔ یہ کشمکش محض علامتی ہوتی ہے۔ آخر سسرال والے دُلہن کو لے جاتے ہیں۔ افریقہ کے ہیویا قبیلے میں برات آئے تو دُولہا دلہن کو زبردستی اُٹھا کر لے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ دولہن کی سہیلیاں ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہیں۔ آخر دولہا دُلہن کو لے جانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ برات اُس زمانے سے یادگار ہے جب ایک قبیلے والے دوسرے قبیلے پر حملہ کر کے ان کی لڑکیاں لے بھاگتے تھے۔ ایسے موقعوں پر اکثر جنگ ہوا کرتی تھی۔ ہمارے دیہات میں برات آنے پر باجے گاجے کا اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ شادی کی شہرت دور دور تک ہو جائے۔ برات آنے پر عورتیں چھتوں پر بیٹھ جاتی ہیں، براتیوں پر خشک اُپلے پھینکتی ہیں اور انہیں بے تحاشہ گالیاں دیتی ہیں۔ شادی کے دن دُولہا کو سسرال کی عورتیں اندرون خانہ بلاتی ہیں اور طرح طرح سے اُس کی آزمائش کرتی ہیں۔ بعض اوقات دولہا کو دلہن کی بند مٹھی کھولنی پڑتی ہے یا پتھر کی سِل اُٹھانی پڑتی ہے جو دولہا اس کوشش میں ناکام رہے اُس پر عورتیں آوازے کستی ہیں کہ بھلی ڈبوئی تجھے شاید تیری ماں نے دودھ نہیں پلایا۔ دولہا کھارے سے نیچے اُترے تو اُسے چھوہریاں توڑنا پڑتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اسی آسانی سے عورت پر قادر ہو گا۔ مہر اور جہیز کی رسوم بھی قدیم زمانے سے چلی آرہی ہیں جب دُلہن کو خریدا جاتا تھا یا دولہا کو زر و مال دینا پڑتا تھا۔ ایک رومن عورت نے جہیز کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا "عجیب بات ہے کہ ہمیں اپنا آقا بھی خریدنا پڑتا ہے"۔ بنگالی ہندوؤں

میں جہیز کے فراہم نہ ہو سکنے کے باعث کئی لڑکیاں ساری عمر کنوار پنے میں بتا دیتی ہیں کیونکہ ان کے والدین دُولہا خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ رخصتی کے وقت اکثر اقوام میں دُلہن باآوازِ بلند رو کر اپنے غم کا اظہار کرتی ہے کیونکہ وہ ماں باپ اور بہن بھائیوں سے بچھڑ رہی ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں اس موقع پر بابل کے پُر سوز گیت گائے جاتے ہیں جنہیں سُن کر متعلقین کی آنکھیں بھیگ بھیگ جاتی ہیں۔

روما میں شادی کی فال پرندوں کی اُڑان یا قربانی کے بکرے کی انتڑیوں سے لی جاتی تھی۔ آخری رسم یہ تھی کہ دولہا اور دُلہن کو قربانی کے گرد چکر لگانا پڑتے تھے۔ اس کے بعد شادی کا جلوس دُولہا کے گھر روانہ ہو جاتا تھا۔ اس جلوس میں نہایت فحش گیت گائے جاتے تھے جو بکارت کے دیوتا کی حمد میں ہوتے تھے[1]۔ دُولہا کے گھر پہنچ کر دُلہن چوکھٹ پر چربی یا تیل گراتی تھی پھر دُولہا اُسے کولی میں بھر کر اندر لے جاتا تھا اس موقع پر سہیلیوں میں دلہن پر چاول یا گندم کے دانے نثار کئے جاتے تھے تاکہ دلہن کے ہاں کثرت سے اولاد پیدا ہو۔ ہمارے ہاں پالکی پر ٹکے نثار کرتے ہیں جنہیں لوٹنے کے لئے بچے پل پڑتے ہیں۔ حجلۂ عروسی کو اہتمام سے سجایا جاتا ہے۔ دلہن مسند سے لگ کر بیٹھ جاتی ہے اور عورتیں اس کا مکھڑا دیکھنے اور سلامیاں دینے کے لئے ہجوم کر آتی ہیں۔ بعض اقوام میں عورتیں مردِ حجلۂ عروسی کے دروازے پر دھرنا دے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جب دُولہا انہیں بتاتا ہے کہ وہ اپنی دُلہن سے مطمئن ہے تو خوشی کے نعرے بلند کئے جاتے ہیں۔ شبِ عروسی کی صُبح کو سامی اقوام میں بستر کی چادر ملاحظہ کی جاتی تھی۔ دُلہن کی بکارت کا ثبوت ملنے پر یہ چادر برادری کے گھر گھر میں پھرائی جاتی تھی[2]۔

جو شادی مذہبی رسوم کے ساتھ رچائی جائے اُس میں شواہد کا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے لیکن مستثنٰی حالات میں شواہد کے بغیر بھی بیاہ ہو جاتا ہے۔ ہندوؤں میں گندھرو دواہ اس کی مثال ہے۔ دشینت اور شکنتلا کا بیاہ اِسی نوعیت کا ہوا تھا۔ مصر کے دیہات میں کوئی مرد کسی

---

[1] HYMEN

[2] قانونِ اسلام، جعفر شریف

بالغ کنواری سے شادی کا خواہش مند ہو اور وہ عورت کہہ دے وھَبت لکَ نفسی (میں اپنا تن تجھے بخشتی ہوں) تو خواہ گواہ نہ بھی ہوں عورت اُس کے نکاح میں آجاتی ہے۔ پنجاب کے دیہات میں بھی "تن بخشائی" کی شادی کا ذکر کبھی کبھار سننے میں آتا ہے۔ ایران اور افغانستان کے بعض دیہات میں نوجوان اپنی منسوبہ سے نکاح سے قبل جنسی ملاپ کرنے لگتا ہے جسے "نامزد بازی" کہتے ہیں

بعض اقوام میں صغر سنی کی شادی کا رواج بھی رہا ہے۔ اس پہلو سے ہندو رسوائے دہر ہیں۔ منو سمرتی میں ہے۔

"تیس برس کا مرد بارہ برس کی لڑکی سے اور چوبیس برس کا مرد آٹھ برس کی لڑکی سے شادی کرے۔"

اِس نص کی آڑ میں ہندو کمسن لڑکیوں پر بے پناہ ظلم توڑتے رہے ہیں۔ اکبر نے اِس لعنت کو دور کرنے کی کوشش کی اور حکم دیا کہ کوئی لڑکا سولہ برس اور کوئی لڑکی چودہ برس سے پہلے نہ بیاہی جائے لیکن پنڈتوں نے اُس کی ایک نہ چلنے دی۔ آٹھ نو برس کی بیوی پر جو مظالم ڈھائے جاتے تھے ان کی تفصیل مس کیتھرین میو نے لیجسلیٹو اسمبلی کی یادداشتوں کے حوالے سے دی ہے اِن یادداشتوں سے معلوم ہوا کہ سیکڑوں کم سن لڑکیاں اپنے درندہ صفت پتی دیو کی ہوس کا شکار ہو گئیں[1]۔ بے شمار لڑکیاں عمر بھر کے لئے لُولی لنگڑی ہو گئیں یا موت کے گھاٹ اُتر گئیں مس میو نے اپنے اعداد و شمار ہسپتالوں کے رجسٹروں سے حاصل کئے تھے۔ وہ لکھتی ہیں کہ ایک آٹھ سالہ دُلہن کو لہولہان ہسپتال میں لایا گیا۔ وہ درد کی شدت سے رات بھر ایڑیاں رگڑتی رہی۔ دوسرے دن صبح اُس کا "پتی دیو" آیا اور اُسے واپس لے جانے کا مطالبہ کرنے لگا[2]۔ اِن حقائق کے انکشاف سے اقوامِ عالم میں کہرام مچ گیا۔ ہندوؤں نے مسز گاندھی کی قیادت میں مس میو کے خلاف محاذ قائم کر لیا۔ لیکن گرد اُڑا کر حقائق پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ اچھوتوں، بیواؤں اور کم سن دُلہنوں پر جو بے پناہ مظالم ہندوؤں نے روا رکھے ہیں اِن سے ہندوؤں کی ایذا کوشی اور

---

[1] MOTHER INDIA. [2] SLAVES OF GODS

اخلاقی بے حسی کا ثبوت ملتا ہے۔ اسلام میں نابالغ لڑکی کا نکاح جائز ہے لیکن اُسے بلوغت کے بعد ہی رخصت کیا جاتا ہے اور بالغ ہو کر چاہے تو اپنا نکاح منسوخ بھی کر سکتی ہے۔

میاں بیوی میں اکثر موافقت نہ ہونے پر اکثر اقوام میں طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ زرعی معاشرے میں طلاق دینے کا حق صرف مرد کو حاصل رہا ہے۔ وہ جب چاہے اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔ چین قدیم میں طلاق وارد ہونے پر دلہن کا جہیز اُسے واپس مل جاتا تھا۔ رومہ میں شوہر اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا تھا لیکن بیوی شوہر کو طلاق دینے کی مجاز نہیں تھی۔ یہودیوں کے ہاں بھی طلاق کا رواج تھا لیکن جو مرد کسی غیر منسوبہ کنواری کو ورغلا کر اُس سے مقاربت کرتا، اُسے اُس لڑکی سے نکاح کرنا پڑتا تھا اور وہ عمر بھر اُسے طلاق نہیں دے سکتا تھا۔ عربوں میں تین طرح سے طلاق دی جاتی تھی۔ ظہار، ایلاء، طلاق ــــ ظہار یہ کہ کوئی مرد اپنی زوجہ سے کہتا کہ تو میری ماں بہن ہے ــــ ایلاء یہ کہ شوہر قسم کھاتا تھا کہ میں چھ ماہ یا ایک برس تک زوجہ کے ساتھ خلوت میں نہیں جاؤں گا۔ ــــ طلاق تین بار جُدا جُدا دی جاتی تھی۔ تین طلاقیں پوری ہونے سے پہلے شوہر اپنی زوجہ سے رجوع کر سکتا تھا۔ اسلام میں تین طلاق کو طلاق بتّہ (کاٹنے والی) کہا گیا ہے۔ اِس سے بعض کے ہاں ایک طلاق پڑتی ہے اور بعض کے ہاں تین پڑتی ہیں۔ شیخ ثانی نے فیصلہ دیا کہ تین طلاقیں بہ یک نشست یا بہ یک لفظ تین طلاقیں مانی جائیں گی۔ شوہر اپنی زوجہ سے دوبارہ رجوع کرنا چاہے تو اِس صورت میں کر سکتا ہے کہ اُس کی مطلقہ کسی اور شخص سے نکاح کرے اور وہ شخص اُس کے ساتھ خلوت صحیحہ ہونے کے بعد اُسے طلاق دے۔ اسے حلالہ کہتے ہیں اور جو شخص ایسا نکاح کرتا ہے اُسے مستحل یا محلّل کہا جاتا ہے۔ تین طلاق ایک نشست میں بائن قرار دینے میں قباحت یہ ہے کہ اِس میں شوہر کو سوچ بچار کا موقع نہیں ملتا۔ وہ بسا اوقات غیظ و غضب کے عالم میں تین طلاق دے دیتا ہے اور بعد میں پچھتانے پر رجوع نہیں کر سکتا جب تک کہ اُس کی بیوی مستحل سے نکاح نہ کرے اور اُسے طلاق نہ دی جائے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ مستحل اُسے طلاق بھی دے دے گا۔ اِس مشکل سے بچنے کے لیے مصر اور ترکی

کے اُمراء نے بدصورت غلام یا اندھے لُولے نوکر رکھ چھوڑے تھے جن سے حلالے کا کام لیا جاتا تھا۔ اُنہیں معمولی اُجرت دے دی جاتی تھی۔ اس سے ایک ضرب المثل مشہور ہو گئی کہ الف عشق ولا مستحق۔ اسی طرح بعض لوگوں میں طلاق مذاق بن کر رہ گئی۔ بلوچ اور پٹھان تین کنکر زمین پر گراتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں یک طلاق، دو طلاق، سہ طلاق۔ سماٹرا کے مسلمان باتک قبیلے میں شوہر اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے تو یکے بعد دیگرے اُسے تین پان تھما دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یک طلاق، دو طلاق، سہ طلاق۔ عورت غصے میں آجائے تو اپنے شوہر سے کہتی ہے "لاؤ دے دو مجھے تین پان"۔ اس نوع کی طلاق کے خلاف بعض علماء نے سخت احتجاج کیا ہے۔ ابن تیمیہ اِس کے سخت مخالف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ سلف میں سے صحابہ کے ایک بڑے گروہ حضرات علی بن ابی طالب، زبیر بن العوام، عبدالرحمٰن ابن عوف، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس اور دوسرے بہت سے صحابہ کا مسلک تھا کہ ایک نشست میں تین طلاق دی جائیں تو صرف ایک ہی طلاق وارد ہو گی۔ امام داؤد ظاہری کے پیروؤں اور اثنا عشری شیعہ نے بھی یہی مسلک اختیار کیا تھا۔ قاسم امین مصری[1] کے خیال میں طلاق صرف قاضی کے رُوبرُو اور گواہوں کی موجودگی ہی میں ہو سکتی ہے۔ اس کی نواسی باحثہ البادیہ نے روائتی طلاق کے خلاف تحریک جاری کی اور مطالبہ کیا کہ عورت کو بھی طلاق کا حق ویسا ہی ملنا چاہیے جیسا کہ مرد کو حاصل ہے۔ فی زمانہ اکثر مسلم ممالک میں طلاق کی وہی صورت رائج ہے جو عہدِ سعادت میں تھی یعنی ایک ایک ماہ کے وقفے کے بعد طلاقیں دی جاتی ہیں اور طلاق بائن وارد ہونے سے پہلے میاں بیوی ایک دوسرے سے رجوع کر سکتے ہیں۔ اس دوران میں میاں بیوی کو سوچ بچار کا موقع مل جاتا ہے اور وہ ٹھنڈے دل سے جُدا ہونے یا رجُوع کرنے کا فیصلہ کر سکتے ہیں اور حلالے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ طلاق کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ مرد اپنی زوجہ کو زنا کی تہمت کرے تو قاضی کے رُوبرُو دونوں سے قسمیں لے کر تفریق کر دیتے ہیں۔ اسے لعان کہتے ہیں۔ ماقبل اسلام

---

[1] تحریر المراۃ

کے عربوں میں عورت بھی مرد کو طلاق دے سکتی تھی۔ اس کا طریقہ یہ تھا مرد باہر جاتا تو وہ اپنے خیمے کا رُخ بدل لیتی واپس لوٹنے پر مرد جان لیتا کہ عورت اُس سے جُدا ہونا چاہتی ہے اور وہ علیحدہ ہو جاتا تھا۔ اسلام میں عورت کو خلع کا حق حاصل ہے لیکن اِسے حاصل کرنے میں اُسے خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کلیسیائے رومؒ اور ہندو مت میں طلاق ممنوع ہے جس سے بڑی قباحتیں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ میاں بیوی کو طبعی و جسمانی موافقت میسّر ہو یا نہ ہو اُنہیں بہر صورت نبھانا پڑتی ہے۔ ہندو اس معاملے میں مُتشدّد رہے ہیں۔ بیوہ کا سر مونڈ دیا جاتا ہے۔ اُسے پھٹے پُرانے کپڑے پہننا پڑتے ہیں۔ نوجوان بیوائیں ذلت کی زندگی سے تنگ آکر اکثر قحبہ خانوں کا رُخ کرتی ہیں۔ کلیسیائے روم میں مرد ایک ہی عورت سے نکاح کر سکتا ہے۔ جو میاں بیوی ناموافقت کے باعث ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگتے ہیں وہ اِدھر اُدھر جھک مارتے پھرتے ہیں چنانچہ یورپ میں دیوثوں اور زانیوں کی بھرمار رہی ہے۔ عورتوں کی آزادی کی تحریکوں نے ہندوستان اور کیتھولک ممالک کے معاشرے کو بھی متاثر کیا ہے اور سب کہیں طلاق کا حق عورت کو دیا جا رہا ہے۔

شادی ایک عین فطرتی ادارہ ہے جو معاشرۂ انسانی کا مرکز اور تہذیب و تمدن کا محور ہے۔ ایک نوجوان اور ایک دوشیزہ اپنی رضا مندی سے مِل جُل کر زندگی گذارنے کا معاہدہ کرتے ہیں۔ جنسی ملاپ اِن میں یگانگت پیدا کر دیتا ہے۔ دونوں مِل کر اپنے گھر کو سجاتے ہیں۔ خوش آئند مستقبل کے خواب دیکھتے ہیں، ایک دوسرے کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں، ایک دوسرے کا دُکھ درد بٹاتے ہیں۔ بچوں کی پیدائش کے بعد یہ رشتہ اور بھی محکم ہو جاتا ہے۔ اِن کی دلچسپیاں تمام تر بچوں کی پرورش اور تربیت کے لئے وقف ہو جاتی ہیں۔ وہ ایک ساتھ بوڑھے ہوتے ہیں اور بڑھاپے میں ایک دوسرے کا سہارا بن جاتے ہیں۔ غرض کہ ایک خوشگوار شادی سے زیادہ پُرمسرت

لہ مسیح نے کہا (میاں بیوی) دونوں ایک جسم ہوں گے۔ پس وہ دو نہیں بلکہ ایک جسم ہیں اِس لئے جسے خدا نے جوڑا ہے اُسے آدمی جُدا نہ کرے۔ (متی کی انجیل)

زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مسرت جن خوش نصیبوں کو ارزانی ہوتی ہے وہ اسی دنیا میں اپنی جنت بسا لیتے ہیں۔ لیکن افسوس ہزار افسوس! دریغ ہزار دریغ! یہ جنت بہت ہی کم لوگوں کو میسر آتی ہے۔ راقم التحریر نے دو چار ہی کو اس جنت میں بستے دیکھا ہے جب کہ اس کے مشاہدے میں سیکڑوں ایسے میاں بیوی آئے ہیں جن کے لئے ازدواجی جہنم سے بدتر ثابت ہوئی ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

لفظ شادی کا معنیٰ ہے خوشی لیکن شادی کے ابتدائی پُر مسرت ایام اکثر و بیشتر گریز پا ثابت ہوتے ہیں اور اس ابتدائی مسرت کا تاوان عمر بھر کے کرب سے دینا پڑتا ہے۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے سنہرے سپنوں کے تار و پود شادی کے بعد بکھر کر رہ جاتے ہیں اور دو چار برسوں ہی میں وہ ایک دوسرے سے بے زار اور متنفر ہو جاتے ہیں۔ حیاتیات، عمرانیات، نفسیات اور جنسیات کے طلبہ نے اس عقدے کو سلجھانے کے لئے سیر حاصل بحثیں کی ہیں اور قسم قسم کے مشورے دیئے ہیں لیکن یہ عقدہ ہے کہ سلجھنے کی بجائے روز بروز الجھتا جا رہا ہے۔ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ طلاقوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ امریکہ میں ہر چوتھی شادی اور فرانس میں ہر چھٹی شادی کا انجام طلاق پر ہوتا ہے۔ حالاں کہ ان ممالک کو نئی روشنی کے منارے کہا جاتا ہے، جدید تمدن کے گہوارے سمجھا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس صورت حالات سے مایوس ہو کر روائتی شادی کو فرسودہ قرار دے دیا ہے اور متبادل طریقے سوچنا شروع کر دیئے ہیں حالاں کہ مسرت انسانی اور تہذیب و تمدن کی بقا اور ارتقاء کے لئے شادی نہایت ضروری ہے کہ اس کے بغیر بچوں کو پیار اور شفقت کا وہ ماحول نہیں مل سکتا جو ان کی مناسب پرورش اور تربیت کے لئے ضروری ہے۔ ایسے ماحول کے لئے شادی کا پُر مسرت اور خوشگوار ہونا شرط ہے۔ جو میاں بیوی باہمی کشیدگی اور نفرت کی زندگی گذارتے ہیں ان کے بچے بھی دلی مسرت سے محروم ہو جاتے ہیں اور گوناگوں الجھنوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سے عوامل و مؤثرات ہیں جو ازدواجی زندگی کو تلخ اور ناگوار بناتے ہیں اور وہ کون سی تدابیر ہیں جن کے اختیار کرنے سے اُسے پُر مسرت بنایا جا سکتا ہے۔

ان مسائل اور مشکلات کے تجزیے کی ابتداء ہی میں ہمیں ایک اہم حقیقت کا سامنا کرنا ہوگا اور وہ یہ ہے کہ عضویاتی اور نفسیاتی لحاظ سے مرد عورت کی جسمانی وضع قطع، افتادِ طبع اور طرزِ ادراک و احساس میں فرق ہے۔ بے شک مرد عورت کی جبلتیں ایک جیسی ہیں، جذبات و احساسات ایک جیسے ہیں، فطرتی میلانات ایک جیسے ہیں لیکن ان کے اظہار و فعلیّت کی صورتوں میں فرق رونما ہوتا ہے جسے معاشرتی اور اقتصادی عوامل زیادہ نمایاں کر دیتے ہیں۔

جسمانی پہلو سے مرد عورت کی نسبت زیادہ تنومند اور جفاکش ہوتا ہے۔ اُس کے قویٰ زیادہ مضبوط اور اعصاب زیادہ توانا ہوتے ہیں۔ شہ زور ہونے کے باعث وہ مُہم جُو اور دلیر ہوتا ہے، شجاعت اور حوصلہ مندی کو جوان مردی کا جوہر سمجھا جاتا ہے۔ مرد کے اعضا و جوارح میں صلابت پائی جاتی ہے۔ اُس کے جسم کے خطوط اور زاویے سیدھے ہوتے ہیں۔ وہ راستہ چلتے وقت لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہے۔ بلوغت کے وقت اُس کے جسم میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں لیکن یہ مرحلہ اُس کے لئے بالعموم کٹھن نہیں ہوتا۔ عورت کے بدن کے خطوط اور زاویوں میں گولائی اور گدراہٹ ہوتی ہے اُس کی چھاتیوں اور کولہوں کے اُبھار اُس میں رعنائی اور دلکشی پیدا کرتے ہیں۔ اُس کی کلائی، ٹخنے، ہاتھ پاؤں مرد کی بہ نسبت چھوٹے چھوٹے اور گداز ہوتے ہیں۔ سُرینوں اور رانوں کی فربہی کے باعث وہ چھوٹے چھوٹے قدم بناتی ہے اور دائرے بنا کر چلتی ہے۔ بلوغت کا مرحلہ ایک دوشیزہ کے لئے بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ وہ ایام کی آمد سے گھبرا جاتی ہے۔ ایام سے پہلے اور ان کے دوران میں وہ بے چینی اور بے قراری محسوس کرنے لگتی ہے۔ ان میں بے قاعدگی اور ناہمواری پیدا ہو جائے تو اُس کے لئے پریشانی اور تکلیف کا باعث ہوتی ہے۔ مرد کو اِس نوع کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اِس لئے اُس کا مزاج زیادہ ہموار ہوتا ہے۔ مرد کی زندگی میں دو مراحل نازک ہوتے ہیں، بلوغت اور کہولت۔ لیکن عورت کو ایام کے چکر کے باعث ہر ماہ آزمائش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک عورت نے کہا تھا " قدرت نے ایام کی صورت میں ہمیں عمر قید کی سزا دی ہے " اِس پر حمل اور وضع حمل کی کڑیاں مستزاد ہیں۔ مرد جنسی مواصلت کے صرف پُرکشش اور

لذت بخش پہلو سے آشنا ہوتا ہے جب کہ عورت کی حظ اندوزی کے ساتھ حمل اور وضع حمل کی اذیت وابستہ ہوتی ہے۔ وہ مہینوں بچے کو اپنی کوکھ میں لیے لیے پھرتی ہے۔ اُس کا جی اکثر خراب رہتا ہے، چہرے پر زردی کھنڈ جاتی ہے۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نمودار ہو جاتے ہیں، چلنے پھرنے میں دقت ہوتی ہے، دردِ زہ اُسے بھنبھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ وہ راتوں کو جاگ جاگ کر بچے کی خبرگیری کرتی ہے، اُس کے چین پر اپنا چین اور اُس کی نیند پر اپنی نیند قربان کر دیتی ہے۔ مامتا اُس میں ضبط و تحمل اور ایثار و عطا کی وہ صفات پیدا کر دیتی ہے جن کا عشرِ عشیر بھی مرد کو نصیب نہیں ہوتا۔ اِس کے باوجود مرد صدیوں سے برتری کے زعمِ بے جا میں مُبتلا ہے۔ اُس کا یہ احساسِ برتری بسا اوقات ازدواجی زندگی کو تلخ کر دیتا ہے۔ جیسا کہ ہم مختصراً ذکر کر چکے ہیں کہ مادری نظامِ معاشرہ میں عورت کو مرد پر برتری حاصل تھی لیکن زرعی انقلاب کے بعد ریاست کی داغ بیل ڈالی گئی تو پدری نظامِ معاشرہ صورت پذیر ہوا جس میں مرد کو عورت پر سیادت حاصل ہو گئی۔ قانون بنانے والے مرد تھے اس لیے ایسے قوانین وضع کیے گئے جن سے مرد کی برتری کا تحفظ مقصود تھا۔ مثلاً مرد زنا کرتا تو وہ محض گناہ تھا، عورت زنا کرتی تو وہ ایک سنگین جُرم بن جاتا جس کی سزا موت تھی۔ یعنی مرد قانون کی گرفت سے آزاد تھا لیکن عورت کو عبرت ناک سزا دی جاتی تھی۔ مرد خود تو سیکڑوں کنیزوں سے تمتع کرنے کا مجاز تھا لیکن اِن کنیزوں کو ایک ہی مرد پر قناعت کرنا پڑتی تھی۔ اِس حالت میں اُن سے کوئی لغزش سرزد ہو جاتی تو اُنہیں بے دریغ موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا تھا۔ مرد شرمناک ہوس پرستی کے باوجود راست روی اور شرافت کا پُتلا بنا رہا اور عورتوں کو مجبوری کی لغزش کی بنا پر مکّار، شہوت پرست، دغاباز، ہرجائی کے القاب دیئے گئے۔ عورت دشمنی کی روایت مُرورِ زمانہ سے مذہب، فلسفے، اخلاقیات، عمرانیات اور ادب و فن میں بار پا گئی۔ یاد رہے کہ اِن موضوعات پر ساری کتابیں مردوں ہی کی لکھی ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر ہم چند اقوال و اقتباسات ذیل میں درج کریں گے۔

——— خُدایا! تو نے عورت کو کیوں پیدا کیا؟ یہ چمکیلا جال جو اِس خوشگوار دنیا میں

ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ تونے آدمی کو خلق کرنا ہی تھا تو اِسے عورت کے بطن سے اور عشق کے وسیلے سے کیوں پیدا کیا؟" (یوری پیڈیز)

"_____ یہ بات عورت کی سرشت میں ہے کہ وہ مردوں کو گمراہ کرے۔ وہ نہ صرف احمقوں کو ورغلاتی ہے بلکہ پڑھے لکھے لوگوں کو بھی نفس کا غلام بنا دیتی ہے۔" (منو)

"_____ عورت کا خاصہ ہے پلنگ سے محبت، بیٹھنے کی چوکی سے محبت، زیور کا شوق، شہوت، غصّہ، بُرائی کی جانب میلان، ضد اور اذیت رسانی سے رغبت۔" (منو)

"_____ عورت کا دل گائے جیسا ہے جو جنگل میں نت نئی ہری گھاس کی ٹوہ میں رہتی ہے۔ عورت بھی سدا نت نئی چاہت کی تلاش میں رہتی ہے۔" (ہتوپدیش)

"_____ کیا عورت حقیقت میں کسی سے پیار کرتی بھی ہے؟ وہ بہ یک وقت کسی ایک شخص سے باتیں کرتی ہے، دوسرے کی جانب نگاہِ غلط انداز سے دیکھتی ہے اور تیسرے کی یاد کو سینے سے لگائے رکھتی ہے۔" (بھرتری ہری)

"_____ اے بیویو! اپنے شوہروں کی ایسی تابع رہو جیسے خداوند کی کیوں کہ شوہر بیوی کا سر ہے جیسے کہ مسیح کلیسیا کا سر ہے۔" (پال کا خط افیسیوں کے نام)

"_____ ہر عورت کو اِس بات پر شرم آنی چاہیے کہ وہ عورت ہے۔" (ولی کلیمنٹ)

"_____ عورت غلام سے بھی بدتر ہے۔" (ولی طامس اکوئنس)

"_____ عورت مُرغِ باد نُما ہے۔" (ورجل)

"_____ عورت سے راست روی اور دیانت کا برتاؤ کرو تو وہ تمہیں فریب دے گی اور ہٹ دھرمی سے کام لے گی۔ عورتوں کو ہزار تحفے دو اور لاکھ پیار کرو وہ ایک معمولی سے ناگوار لفظ پر روٹھ بیٹھیں گی۔ خود بڑے سے بڑا گناہ کر کے شرمندہ نہیں ہوں گی اور تمہاری معمولی سی لغزش پر تمہیں مجرم ٹھہرائیں گی۔ صبر سے کام لوگے تو تنک مزاج ہو جائیں گی۔ خوشامد کروگے تو بے وفائی کریں گی۔" (خوشحال خان خٹک)

"_____ ہملٹ (اوفیلیا سے) تم نے شادی کرنا ہی ہے تو کسی احمق سے کرنا۔ عقلا جانتے ہیں تم عورتیں اِن کا کیا حشر کرتی ہو۔"   (شیکسپیئر)

"۔ وَمَا كُنْتُ أَدْرِي قَبْلَهَا أَنَّ فِي النِّسَاءِ   جَحِيمًا أَمَا ٱهَا جَهْرَةً وَتَرَابِي
(اِس سے پہلے مجھے معلوم نہیں تھا کہ عورتوں میں جہنم بھی ہوتا ہے جسے میں ظاہری آنکھوں سے دیکھوں اور وہ مجھے دیکھے)"

فلاسفہ میں شوپنہائر، ہاپٹ مان اور نِٹشے معروف عورت دشمن ہیں۔ انگریز فلسفی سی۔ ای۔ ایم جوڈ کہتا ہے کہ میں اتنا بوڑھا ہو گیا ہوں کہ جسمانی لحاظ سے مجھے عورت کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور میں حیران ہوں کہ اِس کے علاوہ بھی عورت کا کوئی مصرف ہو سکتا ہے۔ اُس کے الفاظ میں

" میں عورتوں کی صحبت میں بیٹھنا پسند نہیں کرتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی بھی عورت ایسی نہیں ہے جس کے ساتھ میں اتنی ہی خوشی سے وقت نہ گذار سکوں جتنی مسرّت کے ساتھ میں کسی مرد کی صحبت میں وقت گزار سکتا ہوں۔ جب کبھی مجھے کسی عورت سے محبت ہوئی اُس کی صحبت مجھے بے حد عزیز رہی لیکن مجموعی طور پر عورتیں اتنی اچھی رفیقِ صحبت نہیں ہوتیں۔ وہ معمولی بات پر روٹھ بیٹھتی ہیں، نامعلوم اسباب کی بنا پر خفا ہو جاتی ہیں اور جھگڑالو ہوتی ہیں ..... عورتوں کو مردوں کے ساتھ کھانے کی میز پر نہیں بیٹھنا چاہیے۔ اُن کی موجودگی گفتگو کا سارا لطف کِرکرا کر دیتی ہے کیونکہ وہ عامیانہ اور پامال موضوعات ہی پر بات کر سکتی ہیں۔"

اقوامِ عالم کی داستانوں میں عورت کے مکر و فریب کے قصے مزے لے لے کر بیان کیے گئے ہیں۔ الف لیلہ ولیلہ، سوکا سپ تتی، دکامیرون، کتھا سرت ساگر، پنچ تنتر، بودھوں کی جاتک کہانیوں وغیرہ میں عورت کا نہایت شرمناک روپ دکھائی دیتا ہے۔ اِن داستانوں کی عورت بدچلن ہے سوائے ہوس رانی کے اُسے کوئی کام نہیں ہے خواہ مرد اُسے صندوق میں بند کرکے سر پر اٹھائے اُٹھائے پھرے وہ کسی نہ کسی حیلے سے اپنی ہوا و ہوس کی تسکین کر لیتی ہے اور مرد کو غچہ دینے کے نئے نئے طریقے

اختراع کرتی ہے۔ سکھوں کی دسویں پادشاہی کے گرنتھ میں ایک باب ہے جس کا عنوان ہے 'استری چرتر' اس میں عورتوں کے مکر و فریب کی چار سو چار کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ یہ سب کتابیں مردوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ جو صحیح تاریخ سے عورت سے لطف اندوز بھی ہوتے رہے ہیں اور اُسے پائے حقارت سے ٹھکراتے بھی رہے ہیں۔ جب اِن کے سروں پر ہوس کا بھوت سوار ہو عورت ان کے لئے سراپا راحت اور آسودگی بن جاتی ہے وہ اُس کے جمال جہاں آرا کے گیت گاتے ہیں، اُسے چاند تاروں سے، پھولوں سے تشبیہ دیتے ہیں، اُس سے والہانہ محبت کا اظہار کرتے ہیں، اُس کی ایک ایک ادا پر جاں نثار کرنے کے دعوئے کرتے ہیں لیکن اُس سے فیض یاب ہونے کے بعد بیزار ہو جاتے ہیں اور اُس کے سائے سے بھی دور بھاگتے ہیں۔ بقول شیکسپئر

"مرد اظہارِ عشق کریں تو اپریل ہوتے ہیں، شادی کے بعد دسمبر بن جاتے ہیں۔"

مرد کے اِسی دو رُخے رویے نے اُسے جرم کی اُلجھن میں مُبتلا کر دیا ہے جس کے تحت نفس پرستی، خود غرضی، بے وفائی کے جو معائب خود اُس کی ذات میں موجود ہیں اُس نے عورت سے منسوب کر دیئے ہیں۔ وہ صدیوں سے عورت کو کھلونا بنا کر اُس سے کھیلتا رہا ہے، اُس پر جبر و تشدّد کرتا رہا ہے اور اِس کے ساتھ احساسِ جُرم سے نجات پانے کے لئے عورت ہی کو موردِ الزام ٹھہراتا رہا ہے۔ اُس نے عورت کو ذاتی املاک بنا کر حرم سراؤں میں مُقیّد کیا اور جب کسی عورت نے اِس غیر فطری زندگی سے نجات پانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے تو اس پر مکر و فریب اور ہوس رانی کے الزامات عائد کئے گئے۔ صدیوں کی اِس غلامی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورت کی سیرت اور کردار مسخ ہو کر رہ گئے۔ اُسے علوم و فنون کی تحصیل سے محروم رکھا گیا، اُسے امورِ مملکت سے کوئی دلچسپی نہ رہی، وہ اپنے حقوق کے شعور اور اِن کے حصول کی جد و جہد سے بیگانہ ہو گئی۔ اُس کی دلچسپیاں اندرونِ خانہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں تک محصور ہو کر رہ گئیں۔ اُس کے حوصلہ مندی اور پیش رفت کی قوت سلب ہو گئی اور اُس کی شخصیت پروان نہ چڑھ سکی۔ اِس حالتِ زار و زبوں کو پہنچا کر مرد اُلٹا عورت پر طعن و طنز کرنے لگا اور اس طرح چوٹ پر توہین کا اضافہ کیا۔ مرد کا یہ رویّہ بڑی حد تک آج بھی

باقی ہے اور اُس کا بر خود غلط احساس برتری ازدواجی زندگی میں زہر گھول رہا ہے۔ شوپنہار وغیرہ صاف الفاظ میں عورت دشمنی کا اظہار کرتے تھے۔ آج کل کے ارباب دانش نے زہر خند اور کلبیت کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔

"عورت کے پاس سوائے اپنی ذات کے متعلق باتیں کرنے کے اور کسی کام کے لئے وقت نہیں ہوتا۔" (آلڈس ہکسلے)

"جب تک عورت کا شباب برقرار رہتا ہے اُسے ضمیر کی آواز پریشان نہیں کرتی۔" (سومرسٹ مام)

"عورت کا مرد کے ساتھ کھیل یہ ہے کہ تم میرا تعاقب کرو حتیٰ کہ میں تمہیں پکڑ لوں۔" (جوزف پیک)

"احمق وہ ہے جو شادی کرتا ہے۔ سب سے بڑا احمق وہ ہے جو احمق سے شادی نہیں کرتا۔" (جوڈ)

"عورتیں مردوں کو خوش رکھنے کے لئے لباس پہنتی ہیں اور اپنے آپ کو خوش رکھنے کے لیے اُسے اُتار دیتی ہیں۔" (لن یوٹانگ)

عشق و محبت کے عالم میں مرد بالعموم بے وفائی اور طوطا چشمی سے کام لیتا ہے جب کہ عورت اپنا سارا سرمایۂ حیات پیار کی بازی پر لگا دیتی ہے اور اپنے محبوب کی خاطر ننگ و ناموس، جاہ و حشمت، مال و دولت سب کچھ لٹا دیتی ہے۔ مرد حکومت اور دولت چاہتا ہے، محبت اُس کے لئے محض وقتی سی تفریح ہوتی ہے اِس کے لئے وہ اپنی محبوبہ کے حُسن و شباب سے حظ اندوز ہو کر نہایت سرد مہری سے اُسے ٹھکرا دیتا ہے۔ عورت حیران رہ جاتی ہے کہ کیا یہی وہ شخص ہے جس نے اُس سے عُمر بھر نبھانے کے قول ہارے تھے، قسمیں کھائی تھیں، ازلی و ابدی پیار کا یقین دلایا تھا۔ غرض کہ ازدواجی زندگی کی تلخیوں کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ مرد عورت کو بدستور سابق اپنی کنیز بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ مرد لاکھ روشن خیال ہو اُس کے ذہن کے نہاں خانے میں یہ زعم بے جا مخفی ہے کہ وہ!

بیوی سے برتر ہے۔ اُس کے خیال میں اُس کی زوجہ کی زندگی کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کی دل جوئی میں لگی رہے، اُس کی خدمت میں جُتی رہے۔ پورشیا نے تمام عورتوں کے جذبات کی ترجمانی کی تھی جب اُس نے اپنے شوہر بروٹس سے کہا تھا۔[1]

"بروٹس! مجھے بتاؤ کہ تمہاری منکوحہ ہو کر میں کیوں تمہاری ہم راز نہیں بن سکی۔"

"کیا میرا مصرف یہی ہے کہ میں کھانے میں تمہارے ساتھ شرکت کروں یا بستر میں تمہیں سُکھ پہنچاؤں یا کبھی کبھار تم سے بات کر لیا کروں۔

کیا میرا فرض یہی ہے کہ ہمیشہ تمہارے اشارۂ چشم و ابرو پر رقص کرتی رہوں۔

اگر اس سے زیادہ کا حق مجھے نہیں تو پورشیا بروٹس کی داشتہ ہے اُس کی بیوی نہیں ہے۔"

جدید عورت مرد سے برابری کی مُدعی ہے اور اپنے حقوق کے لئے کشمکش کر رہی ہے۔ مرد سے برابری کا یہ دعویٰ اور اپنے حقوق کا شعور مرد پر بہت کھلتا ہے۔ مرد جان گیا ہے کہ اُس کا صدیوں کا تسلط ختم ہونے والا ہے جسے برقرار رکھنے کے لئے وہ ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ چنانچہ آج کل کے اکثر پڑھے لکھے گھرانوں میں اس کشمکش نے ازدواجی زندگی کو بدمزہ کر دیا ہے۔ جب تک مرد عورت کا اصل مقام دل و جان سے قبول نہیں کرے گا یہ کشمکش جاری رہے گی۔

عشق و محبت کے بارے میں مرد اور عورت کا نقطۂ نظر بھی بعض اوقات شادی شدہ زندگی کو مسموم کر دیتا ہے۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے مرد کے لئے محبت ایک وقتی سی تفریح ہوتی ہے جب کہ عورت کے لئے ایک مستقل قدر کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ عمر کے ہر مرحلے پر عظیم محبت کی تمنا کرتی ہے، اُسے ہمہ وقت اپنے شوہر کے پیار، التفات اور دل سوزی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ شادی سے پہلے جوان لڑکیاں اپنے ذہن و قلب میں ایک مثالی چاہنے والے کا تصور بسا لیتی ہیں اور بڑی حسرت سے اپنے خوابوں کے شہزادے کا انتظار کرتی ہیں۔ جب وہ آتا ہے تو اُسے تمام مردانہ محاسن کا

---

[1] JULIUS CAESAR. SHAKESPEARE

مجسمہ سمجھ لیتی ہیں اور وہ ان کی روز خوابی کا ہیرو بن جاتا ہے۔ مشرقی ممالک میں جہاں نوجوان لڑکوں لڑکیوں کو ملنے جلنے کی عام آزادی نہیں ہوتی، لڑکی اپنے منگیتر سے غائبانہ محبت کرنے لگتی ہے۔ شادی کے بعد یہ خواب حقیقت بن جاتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ چند ہی مہینوں میں یہ طلسم پاش پاش ہو جاتا ہے اور وہ ایک ناگوار جھٹکے سے دوبارہ حقائق کی دنیا میں واپس آ جاتے ہیں۔ آندرے موروا لکھتا ہے۔

"محبت اپنے بچپن ہی میں مر جاتی ہے۔ اسے تر و تازہ اور بحال رکھنے کے لئے بڑی احتیاط اور مسلسل کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔ ابتدا میں دو چاہنے والوں کو ایک دوسرے کی ذات میں نئی نئی باتیں دکھائی دیتی ہیں۔ دونوں کے پاس عنفوان شباب کی یادیں ہوتی ہیں۔ اجنبی اشخاص کے قصے ہوتے ہیں، گانے کے لئے نئے نئے گیت ہوتے ہیں، سنانے کے لئے نئی نئی کہانیاں ہوتی ہیں لیکن افسوس کہ یہ ذخیرہ جلد ہی ختم ہو جاتا ہے اور وہ کہانیاں جو شروع شروع میں بڑی مزے دار لگتی تھیں اب اکتاہٹ کا سبب بن جاتی ہیں پھر دونوں کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی نیا آدمی ملے جسے یہ کہانیاں اور یہ باتیں دوبارہ سنائی جا سکیں۔"

دن رات کا قرب محبت کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ ہر وقت کے قرب کے باعث محبت اُنس میں اور اُنس بے زاری میں بدل جاتا ہے۔ عشق و محبت کا مرکزی نقطہ لعقوں کسا توا نامعلوم کشش ہے ابتدا میں نوجوان لڑکوں لڑکیوں کو ایک دوسرے کی ہستی بڑی پُر اسرار دکھائی دیتی ہے وہ آرزو پروری کے تحت ایک دوسرے کو اپنے ذاتی تخیلات اور توقعات سے متصف کر دیتے ہیں۔ ایک دوسرے کے لب و رخسار، آنکھوں، بالوں، مسکراہٹ اور اندازِ گفتگو میں نامعلوم کشش محسوس کرتے ہیں لیکن دن رات کا قرب ان گھروندوں کو شکست و ریخت کر دیتا ہے، اُن پر ایک دوسرے کی خامیاں اور کوتاہیاں ظاہر ہونے لگتی ہیں جس سے لطفِ صحبت کرکرا ہو جاتا ہے، نگاہیں بے کیف ہو جاتی ہیں اور ہاتھوں کا لمس بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایک ستم ظریف نے کہا ہے کہ شادی ایسا رومان ہے جس کا ہیرو پہلے باب ہی میں مر جاتا ہے۔ میاں بیوی تجدید محبت کی لاکھ کوشش کریں بات نہیں بنتی۔ ایلسن نے کہا

ہے کہ ایک شوہر کا اپنی بیوی سے اظہارِ محبت کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ پالتو مُرغی کا شکار کھیلنا۔
خارج پسند ہونے کے باعث مرد کی دلچسپیوں کا دائرہ وسیع ہوتا ہے جب کہ عورت کی تمام تر دلچسپیاں شوہر اور بچوں کی ذات ہی تک محدود ہوتی ہیں۔ وہ شادی کے ابتدائی ایام کو یاد کر کر کے آہیں بھرتی ہے اور شوہر سے اُس کی سرد مہری کی شکایت کرتی ہے۔ عورت جان لیتی ہے کہ اُس کا شوہر بدل گیا ہے اور اب کبھی بھی اُس سے پہلی سی پُرجوش محبت نہیں کر سکے گا۔ ایک عورت نے اپنے نفسیاتی معالج سے کہا تھا۔

" میرا شوہر میرا بوسہ اس طرح لیتا ہے جیسے وہ اپنی بہن کا بوسہ لے رہا ہو۔"

مرد اپنی اُکتاہٹ اور بے زاری کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ بہت کم مردوں میں برٹرنڈ رسل کی سی جرأت ہوتی ہے کہ وہ برملا اپنی سرد مہری کا اعتراف کر سکیں۔ رسل لکھتے ہیں[1]۔

" ایک دن سہ پہر کے وقت میں سائیکل پر جا رہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں اپنی بیوی ایلس سے محبت نہیں کرتا ..... جب تک میں اور ایلس ایک کمرے میں رہے وہ رات کو شب خوابی کے لباس میں میرے پاس آتی اور میری منت سماجت کرتی کہ میں رات اُس کے ساتھ گزاروں۔ بعض اوقات میں مان جاتا لیکن نتیجہ کچھ بھی نہ نکلتا۔ یہ صورتِ حالات نو برس تک قائم رہی۔ ان برسوں میں وہ میری محبت کو جیتنے کی کوشش کرتی رہی اور کسی دوسرے مرد کی طرف مائل نہ ہوئی۔ میں نے بھی اِس دوران میں کسی دوسری عورت سے جنسی تعلق قائم نہ کیا۔ میں سال میں دو بار اپنی بیوی سے وظیفۂ زوجیت ادا کرنے کی کوشش کرتا رہا تاکہ اُس کی کچھ تالیفِ قلب ہو جائے لیکن میرے لئے اُس کی ذات میں کچھ بھی کشش باقی نہ رہی تھی۔ میری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔"

شادی کا المیہ یہی ہے کہ عورت پیار نبھانے کی کوشش کرتی ہے، شوہر سے محبت کئے جاتی ہے

---

[1] AUTOBIOGRAPHY

لیکن اُس کی محبت کو جیتنے میں ناکام رہتی ہے۔ عورت چاہتی کہ اُس کا شوہر ہمدرد مان پسند ہو، ایثار پیشہ ہو، دوسروں کے جذبات کا احترام کرتا ہو۔ بدقسمتی سے اکثر مرد انانیت کے پُتلے ہوتے ہیں اور اپنی بیوی کو سچا پیار نہیں دے سکتے۔ عورت اپنے شوہر کی بے رُخی اور بے اعتنائی سے دل برداشتہ ہو جاتی ہے اور اُس کے تغافل کو اِعتنا میں بدلنے کے لئے کبھی اپنی علالت کا ڈھونگ رچاتی ہے اور کبھی جان بوجھ کر اُسے اِشتعال دِلاتی ہے۔ مرد شکایت کیا کرتے ہیں کہ عورتیں کسی نہ کسی مرض کا بہانہ کرتی رہتی ہیں یا فضول خرچی سے اُنہیں قرض کے جال میں جکڑ دینا چاہتی ہیں یا طعنوں، مہنوں سے اِن کا ناک میں دم کر دیتی ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ عورتیں یہ سب کچھ اُن کا التفات اور محبت حاصل کرنے کے لئے کرتی ہیں۔ اُسے پیار میسر ہو تو جھگڑا کرنے یا بیماری کا ڈھونگ رچانے یا چیخنے چلانے کا عنوان ہی باقی نہیں رہتا۔ ایک دفعہ ایک عورت نے اپنے شوہر کو سخت اشتعال دِلایا۔ شوہر نے دھکے دے کر اُسے گھر سے نکال دیا۔ وہ اپنی ایک سہیلی کے ہاں گئی اور اُس سے پوچھا کیا تمہارے ساتھ بھی کبھی ایسا ہوا ہے۔ سہیلی نے نفی میں جواب دیا تو وہ بولی "اِسے آزما دیکھو بس خاوند کو خوب مشتعل کر دو۔ ایسے شخص کا سامنا کرنا جو جوشِ غضب میں دیوانہ ہو رہا ہو، جس کے مُنہ سے جھاگ اُڑ رہا ہو، جو چیخ چیخ کر بے تحاشا گالیاں بک رہا ہو، اُف! یہ منظر کیسا شاندار ہوتا ہے؟" ظاہر ہے کہ یہ عورت محرومِ محبت تھی اور شوہر کو مُلتفت کرنے کے لئے یہ ناٹک رچاتی تھی۔ سلاوی ممالک خاص طور پر بلقان کی ریاستوں میں بیوی کو پیٹنا لوازمِ محبت میں خیال کیا جاتا ہے۔ جس بیوی کو اُس کا شوہر کبھی کبھار نہ پیٹے وہ سمجھتی ہے کہ اب وہ اُس سے پیار نہیں کرتا۔ ایک عورت نے فرائڈ کو بتلایا تھا "میرے شوہر نے کئی دِنوں سے مجھے نہیں پیٹا شاید اب وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا۔" گویا مرد کے ہاتھوں پٹنا اُس کے تغافل سے بہتر ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے پیٹنے کے بعد مرد پشیمان ہوگا، بیوی کی تالیفِ قلب کرے گا اور لڑائی جھگڑا ٹکیے، پر طے ہو جائے گا۔ جو میاں بیوی شادی سے زیادہ توقعات وابستہ نہیں کرتے وہ مایوسی سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ ایک خاتون میلا پراپ کا قول ہے "شادی کی زندگی میں نفرت اور محبت دونوں

ہی ختم ہو جاتی ہیں لہذا شادی کا آغاز تھوڑی سی نفرت سے کرنا چاہیئے۔" نفرت سے شادی کا آغاز کرنے کا مشورہ تو خیر نہیں دیا جا سکتا اتنا ضرور صحیح ہے کہ 'دوامی عشق' اور 'ازلی و ابدی محبت' کی توقعات رکھنے والے زیادہ کرب ناک مایوسی سے دوچار ہوتے ہیں۔

جنسی پہلو سے شادی ایک ایسا معاہدہ ہے جس پر ہر دُولہا اور دُلہن آنکھیں بند کر کے دستخط کر دیتے ہیں۔ موریس پوسکو نے کہا ہے "بہترین حالات میں بھی شادی جُوا ہوتی ہے۔" ایک صاحب نے استدلال کیا ہے 'شادی ایک ادارہ ہے، شادی محبت ہے، محبت اندھی ہوتی ہے، لہذا شادی اندھوں کا ادارہ ہے' دولہا اور دلہن نہیں جانتے کہ وہ ایک دوسرے کو کامل حظِ نفسانی بخش سکیں گے کہ نہیں۔ یہ مسئلہ مرد کی نسبت عورت کے لئے زیادہ اہم ہے کیوں کہ جنسی پہلو سے مرد کی کوتاہ ہمتی کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔ وہ دُلہن جس کا دُولہا شبِ عروسی کو کوتاہ ہمت نکلے، زندگی بھر عذاب جھیلتی رہتی ہے۔ شبِ عروسی شادی کی زندگی میں بڑی اہم ہے۔ مغرب میں اِس کی اہمیت ختم ہو چکی ہے کیونکہ بقول کنسے وہاں کی اسی فیصد لڑکیاں شادی سے پہلے ہی دوشیزگی سے محروم ہو جاتی ہیں۔ مغرب کے مرد بھی بکارت کو چنداں اہمیّت نہیں دیتے۔ مشرقی ممالک میں بکارت کی توقع کی جاتی ہے۔ دولہا دلہن جنسی معلومات سے بے بہرہ ہوں تو وہ شبِ عروسی سے کماحقہ لطف اندوز نہیں ہو سکتے بلکہ بعض اوقات گوناگوں اُلجھنوں میں مُبتلا ہو جاتے ہیں۔ پنجاب کے دیہات میں کہا جاتا ہے کہ شبِ عروسی ہی کو اِس بات کا فیصلہ ہو جاتا ہے کہ مرد زن مُرید ہو گا یا عورت اُس کی تابع ہو گی۔ ایسے دُولہا بھی ہوتے ہیں جو ہاتھ جوڑنے لگتے ہیں اور دلہن کے پاؤں پڑنے لگتے ہیں اور ایسے بھی ہوتے ہیں جو درندے کی طرح جھپٹ پڑتے ہیں اور دلہن سوچتی رہ جاتی ہے کہ یہی تھی وہ شادی جس کے سُنہرے خواب اُس نے دیکھے تھے اور یہی ہے وہ شخص جسے اُس نے اپنے سپنوں میں بسا رکھا تھا۔ باکرہ کے لئے یہ وقت بڑی آزمائش کا ہوتا ہے۔ وہ جنسی مواصلت کے بارے میں متجسس بھی ہوتی ہے اور اس سے خوف بھی کھاتی ہے۔ جنسیاتی نفسیات کی اصطلاح میں اِسے "بکارت کی تشویش" کہتے ہیں۔ اُس نے اپنی سہیلیوں سے بہت کچھ سُن رکھا

ہوتا ہے اور وہ ذہنی طور پر جنسی ملاپ کے لئے تیار بھی ہوتی ہے لیکن وہ چاہتی ہے کہ اُس سے اظہارِ محبت کیا جائے، اُس کے کانوں میں پیار بھری باتوں کا رس گھولا جائے، اُس کے حُسن و جمال اور لباس کی تعریف کی جائے، اُس سے نبھانے کے عہد و پیمان کئے جائیں تاکہ وہ ایک اجنبی کی نفسانی خواہش کے سامنے جھکنے پر مجبور نہ ہو بلکہ اپنے آپ کو ایک مخلص جیون ساتھی کے سپرد کرے۔ وہ اپنی سُپردگی کو احسان کا رنگ دینا چاہتی ہے۔ نسوانی حیا کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اُس کا احترام کیا جائے اور اُسے یک بارگی پاؤں تلے کچل کر نہ رکھ دیا جائے۔ اس سے دُلہن کی لطافتِ احساس کو ٹھیس لگتی ہے اور بعض اوقات وہ عُمر بھر کے لئے اپنے شوہر سے مُتنفر ہو جاتی ہے۔ تحلیل نفسی کے دوران میں عام طور سے عورتیں مرد کے ناروا وحشیانہ سلوک کی شکایت کرتی ہیں۔ ایک خاتون نے اپنے نفسی معالج کو بتلایا۔ "میرا شوہر مجھ سے یوں مقاربت کرتا ہے جیسے وہ سوٹ کیس میں کپڑے ٹھونس رہا ہو۔" ایک خاتون نے کہا "میرا بدن اپنے شوہر کے لئے پریڈ کا میدان بن گیا ہے۔" ایک اور خاتون نے تحلیلِ نفسی کے وقت کہا "میرا شوہر دروازہ کھولنے کی بجائے اُسے توڑ کر اندر گھسنے کی کوشش کرتا ہے۔" شادی کی رات کو دُولہا خلوص، شائستگی اور رواداری سے کام لے تو وہ اپنی دلہن کا دل ہمیشہ کے لئے جیت سکتا ہے۔ مرد کو اِس بات کا علم ہونا چاہیے کہ عورت کی جنسی خواہش اور اِس کے اپنے نفسانی اُبھار اور اظہار میں بڑا فرق ہوتا ہے مرد مقاربت کے لئے بے ساختہ تیار ہو جاتا ہے جبکہ عورت کو مساس اور ملاعبت سے آمادہ کرنا پڑتا ہے کیوں کہ نفسانی حظ اُس کے سارے جسم میں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ ہیویلاک ایلس عورت کی جنسی خواہش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔[1]

"(۱) عورت کی خواہش مرد کی جنسی خواہش کی بہ نسبت زیادہ مخفی ہوتی ہے۔ (۲) اُس کی خواہش زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے۔ اس میں اتنی برجستگی نہیں ہوتی جتنی مرد کی خواہش میں ہوتی ہے، یہ دیر سے اُبھرتی ہے اور تدریجاً نقطۂ عروج کو پہنچتی ہے۔

---

[1] PSYCHOLOGY OF SEX

(۳) عورت کی خواہش جنسی ملاپ کے باقاعدہ اور استوار ہونے کے بعد زیادہ قوی ہو جاتی ہے۔ (۴) یہ خواہش عورت کے جسم کے اعضا میں زیادہ پھیلی ہوئی ہوتی ہے اس لیے اس کا حلقۂ اثر زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ (۵) اس کی خواہش ہموار اور یکساں نہیں ہوتی بلکہ مہینے کے مختلف ایام میں گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔"

ایام عروسی میں اکثر نوجوان کثرت سے کام لیتے ہیں۔ عورت بھی اس کی عادی ہو جاتی ہے اور اپنے شوہر سے اسی نوع کی توقعات وابستہ کر لیتی ہے بعد میں مرد ان توقعات کو پورا نہ کر سکے تو وہ بے دل ہو جاتی ہے اسے وہم ہو جاتا ہے کہ شاید اسے مجھ سے محبت نہیں رہی۔ اس لیے مناسب ہوگا کہ شروع ہی سے اعتدال سے کام لیا جائے۔ اعتدال برتا جائے تو صحت پر خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ قویٰ مضبوط اور اعصاب توانا ہوتے ہیں، دماغ روشن اور عزم بیدار ہوتا ہے، جب کہ کثرت مرد کو نڈھال کر دیتی ہے۔ اس کا نظام عصبی ماؤف ہو جاتا ہے۔ عورت مرد کی طرح منزل نہیں ہوتی۔ اس کی اندام نہانی سے ایک قسم کے سیالی مادے کا اخراج ضرور ہوتا ہے لیکن یہ نقاہت کا باعث نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر کسانوا کہتا ہے۔ "جہاں تک جنسی ملاپ کا تعلق ہے، مرد کی بہ نسبت عورت زیادہ توانا ہوتی ہے۔"

زردشت نے کہا ہے کہ مرد اپنی عورت کے پاس ہر نویں دن خلوت میں جائے سولن کہتا ہے کہ مہینے میں تین بار جنسی ملاپ کرنا مناسب ہے۔ تالمود میں ہے کہ ایک عالم کو ہفتے میں ایک بار اور ایک مزدور کو دو بار جنسی ملاپ کرنا مناسب ہے۔ ملکہ زنوبیہ اپنے شوہر کو مہینے میں ایک بار مقاربت کی اجازت دیتی تھی۔ لوتھر نے کہا ہے کہ ہفتے میں دو بار ملاپ کرنا انسب ہے لیکن اس کے بارے میں کوئی قاعدہ کلیہ وضع نہیں کیا جا سکتا۔ اس بات کا تعلق مرد کی جسمانی ساخت اور صحت سے ہے۔ میری سٹوپس لکھتی ہے کہ ان کی ایک سہیلی نے انہیں بتایا کہ اس کا شوہر دن رات میں تین بار اس سے مقاربت کرتا ہے اور یہ سلسلہ سال ہا سال سے جاری ہے۔ دوسری طرف میری سٹوپس نے ایک شخص کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ دو سال میں ایک بار مقاربت کرتا تھا اور اس کی بیوی مطمئن تھی۔ میری سٹوپس نے مشورہ دیا ہے کہ جب عورت کی نفسانی خواہش عروج پر ہو یعنی ایام کے آغاز سے پہلے اور فراغت

کے بعد تو تین چار دن متواتر مقاربت کی جائے اس کے بعد دس دن کا وقفہ دیا جائے۔

دُولہا کو یہ بات یاد رکھنا ہوگی کہ مساس اور ملاعبت ایک فنِ لطیف ہے جس سے بہرہ ور ہونا ضروری ہے۔ بالزاک نے سچ کہا ہے کہ عورت ایک ایسا بربط ہے جس کے تاروں سے کوئی ماہرِ فن ہی دلکش سُر نکال سکتا ہے۔ شبِ عروسی کو خوشگوار یا ناگوار بنانے کی ذمے داری دُولہا پر عائد ہوتی ہے۔ اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرائڈ نے کہا کہ جو شخص احسن طریقے سے دوشیزہ کا ازالۂ بکارت کرتا ہے وہ عمر بھر اُس کی ممنونِ احسان رہتی ہے اور اُس کی یاد کو عزیز رکھتی ہے۔ وین ڈی ویلڈ نے ایک میاں بیوی کی زندگیوں کو محض اس لئے تباہ ہوتے ہوئے دیکھا کہ وہ جنسی ملاپ کے بارے میں مناسب معلومات نہیں رکھتے تھے۔ ان کے المناک انجام سے متاثر ہو کر اُس نے ولندیزی زبان میں اپنی مشہور کتاب "مثالی شادی"[1] لکھی جس کا ترجمہ دُنیا بھر کی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس کا مطالعہ ہر میاں بیوی کے لئے ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر میری سٹوپس کی کتابوں کا مطالعہ بھی مناسب ہوگا کہ ان میں عورت کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی گئی ہے۔

جنسیات کے طلبہ اس بات پر متفق ہیں کہ شادی کی کامیابی یا ناکامی اور ازدواجی زندگی کی مسرت یا الم ناکی کا انحصار بڑی حد تک میاں بیوی کی جنسی اور عضویاتی موافقت یا ناموافقت پر ہوتا ہے۔ جنسی موافقت ازدواجی زندگی کو چٹان کی بنیاد مہیا کرتی ہے جس کے متزلزل ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ جنسی موافقت میسر ہو تو میاں بیوی بامسرت زندگی گزارتے ہیں۔ چھوٹی موٹی رنجشیں یا روزمرہ کی معمولی بدمزگیاں ازخود رفع ہو جاتی ہیں۔ جس عورت کی بھرپور نفسانی تشفی ہوتی ہے وہ اپنے شوہر کی کوتاہیوں اور عیوب سے صرفِ نظر کر لیتی ہے۔ عورت کا ہیرو وہی ہے جو اُسے کامل حظِ نفس[2] بخشتا ہے۔ اُس کے سامنے وہ تمام مردوں کو ہیچ سمجھتی ہے اور ساری عمر اُس کے

[1] IDEAL MARRIAGE [2] ORGASM۔ اطالوی میں اسے GLORIA کہتے ہیں۔ قدماء اسے SPASME GENETIQUE کہتے تھے۔

ساتھ ہنسی خوشی بتا دیتی ہے۔ جنسی موافقت ہو تو میاں بیوی کے کردار میں ثبات اور طبائع میں ہمکلی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں، ایک دوسرے کی عزت کرتے ہیں، ایک دوسرے کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کو مستعد ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں سے بھی نرم روی، موانست اور ہمدردی کا سلوک کرتے ہیں۔ وہ اچھے دوست، اچھے باپ اور اچھے شہری ثابت ہوتے ہیں۔ اِن کی شادی ایک طویل رُومان بن جاتی ہے۔ وہ کبھی جُدائی یا طلاق کا نام نہیں لیتے۔ وہ باوفا ہوتے ہیں اور عمر بھر ایک دوسرے سے نبھاتے ہیں، اُنہیں ایک دوسرے کی صحبت میں بھرپور نفسانی اور جذباتی آسودگی مُیسّر آ جاتی ہے اس لیئے وہ کسی غیر مرد یا غیر عورت کی جانب ملتفت نہیں ہوتے۔ ایسے خوش نصیبوں کی اولاد بھی بیدار بخت ہوتی ہے۔ اس پُر سکون ماحول میں پلنے بڑھنے والے بچے خوش باش ہوتے ہیں۔ زندگی کے بارے میں ان کا زاویۂ نگاہ رجائی ہوتا ہے۔ اِن میں اعتمادِ نفس، حوصلہ مندی اور مہم جُوئی کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔

ہمارے دور کے عُلمائے جنسیات کہتے ہیں کہ بھرپور جنسی موافقت بہت ہی کم عورتوں مردوں کو ارزانی ہوتی ہے۔ عضویاتی ناموافقت، جنسی ملاپ کی تکنیک سے ناواقفیت، جنس سے وابستہ احساسِ گناہ، جنس کے خلاف صدیوں سے راسخ شُدہ تعصبات، مردوں کی کوتاہ ہمتی، عورتوں کی سرد مُہری کے باعث اکثر لوگ بامسّرت جنسی زندگی سے محروم رہتے ہیں۔ بعض میاں بیوی جنسی لحاظ سے پوری طرح صحت مند ہونے کے باوجود جنسی ملاپ کی تکنیک سے بے بہرہ ہونے کے باعث پوری طرح حظ اندوز نہیں ہو سکتے اور گوناگوں غلط فہمیوں اور اندیشوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اکثر مرد مقاربت کو یک طرفہ کاروائی سمجھتے ہیں۔ اُنہیں اپنے حظ سے غرض ہوتی ہے اور یہ نہیں جانتے کہ جب تک وہ فریقِ ثانی کو پوری طرح محظوظ نہیں کریں گے وہ خود بھی بوجہ احسن فیض یاب نہیں ہو سکیں گے۔ جس طرح آدمی دوسروں کو خوش کر کے ہی حقیقی خوشی سے بہرہ یاب ہو سکتا ہے اسی طرح مرد فریقِ ثانی کو پوری طرح محظوظ کر کے ہی کما حقہٗ لذت یاب ہو سکتا ہے۔ یاد رہے کہ مرد اور عورت کی جنسی خواہش کے اظہار اور اُتار چڑھاؤ میں فرق ہے۔ عورت کی جنسی خواہش دیر

سے بیدار ہوتی ہے لیکن ایک دفعہ بھڑک اُٹھے تو اتنی تیز و تند ہوتی ہے کہ آسانی سے اُس کی تسکین نہیں کی جا سکتی۔ مرد ایک بار مقاربت کر کے مطمئن ہو جاتا ہے لیکن عورت اکثر اوقات ناآسودہ رہتی ہے اور اُس کی خواہش بحال رہتی ہے۔ مرد فارغ ہوتے ہی سو جاتا ہے لیکن ناآسودہ عورت دیر تک جاگتی رہتی ہے۔ چنانچہ وہی مرد عورت کی بھرپور تشفی کر سکتا ہے جو ایک تو طویل جنسی ملاپ پر قدرت رکھتا ہو اور دوسرے مساس اور ملاعبت کا فن لطیف جانتا ہو۔ عورتوں کا اِس بات پر اتفاق ہے کہ طویل جنسی ملاپ اُنہیں بیش از بیش حظ بخشتا ہے اور وہ اُس مرد سے پوری طرح فیض یاب ہوتی ہیں جس کی قوت فراغت کے بعد فوری طور پر بحال ہو جائے۔ ہر مرد کا ایک قدیم تعصب یہ بھی ہے کہ عورت کا جنسی حظ اندوزی کا اظہار کرنا نسوانی حیا کے منافی ہے۔ اس تعصب سے خائف ہو کر اکثر عورتیں کامل سپردگی سے قاصر رہتی ہیں لیکن اُنہیں اِس بات کا اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ انہوں نے محظوظ ہونے کا اظہار کیا تو مرد اُنہیں "جنسی چڑیلیں" سمجھنے لگیں گے۔ ظاہر ہے کہ عورت مرد کا ایک کھلونا ہی نہیں ہے بلکہ اُسے بھی حظِ نفسانی سے بہرہ یاب ہونے کا فطرتی حق حاصل ہے۔ جدید دور کی عورت محسوس کرتی ہے کہ حظِ نفسانی کے نقطۂ عروج کو پہنچنا اُس کا حق ہے جس سے مرد اُسے محروم نہیں کر سکتا۔

میکسم ڈیلوی لکھتی ہیں[1]:

"عورت کو اپنے شوہر کو صاف صاف بتا دینا چاہیے کہ اُس کی بھرپور جنسی تشفی بے حد ضروری ہے اور وہ کوئی نیم دِلانہ تسکین قبول نہیں کرے گی۔"

وکٹوریہ کے عہد میں جو عورت جنسی ملاپ میں دلچسپی یا حظ اندوزی کا اظہار کرتی تھی اسے ناشائستہ، بے حیا اور کسبی کے القاب دیئے جاتے تھے۔ اس زمانے کی ایک حکایت مشہور ہے کہ ایک دُولہا حجلۂ عروسی میں داخل ہوا تو اُس نے دیکھا کہ دُلہن کلوروفارم سونگھ کر پلنگ پر بے ہوش پڑی ہے اور بستر پر ایک کاغذ رکھا ہے جس پر لکھا ہے "امی کہتی ہیں کہ تم جو چاہو کر سکتے ہو"

[1] THE SEXUAL RESPONSBILITY OF WOMEN.

ڈاکٹر میری سٹوپس نے عورت کو اُس کے جنسی حقوق دلانے کے لئے سخت جدوجہد کی تھی۔ وہ لکھتی ہیں [1]

"لارڈ ایکس نے بڑی تلخی سے کہا کہ میں نے 'ازدواجی عشق' میں عورتوں کو حظ و وصال کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اُنہوں نے کہا 'یہ آپ نے کیا غضب کیا' عورتوں کو وہ باتیں بتادیں جو صرف کسبیوں کو معلوم ہوتی ہیں اِن باتوں کے علم سے ہماری عورتیں مرد افگن بن جائیں گی اور مردوں کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ عورتوں کو گھر کے نظم و نسق سے غرض ہونی چاہیے۔ جب ہمیں نفسانی حظوظ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو ہم کسبیوں کے یہاں جاتے ہیں۔ آپ کی باتوں سے عورتیں جنسی چڑیلیں بن جائیں گی اور اُن کے جنسی مطالبات کی کوئی حد و غایت نہ رہے گی۔ گھر دوزخ کے نمونے بن جائیں گے اور مرد عورتوں کے اس نوع کے مطالبات پورے نہیں کر سکیں گے۔ لارڈ ایکس کی اِن باتوں سے مرد کی خود غرضی عیاں ہے کہ وہ خود تو نفسانی لذت کے حصول کے لئے کسبیوں کے پاس جاتا ہے اور اپنی عورتوں کو حظِ نفسانی سے محروم رکھتا ہے۔"

مردوں کے لئے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ عورت کی نفسانی خواہش اور مزاج پر ایام اثرانداز ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے اُس میں 'اُتار چڑھاؤ' ہوتا رہتا ہے۔ ایام کے شروع ہونے سے پہلے کے چند روز اور فراغت کے بعد کے ہفتے میں عورت کی نفسانی خواہش عروج پر ہوتی ہے۔ ان دنوں میں وہ سراپا التفات ہوتی ہے یہ دن گذر جائیں تو وہ سرد مہر ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پر عشاق اور شاعر عورت کی متلوّن مزاجی، بے رخی، سرد مہری کا رونا روتے رہے ہیں۔ ینج تنتر میں ہے

"عورت کی طبیعت کا تلوّن جیسے سمندر کی موجیں، اُس کے جذبات بے ثبات جیسے شفق کے بادلوں کی سُرخی۔"

---

[1] ENDURING PASSION.

عشاق حیران ہوتے ہیں کہ چند روز پہلے اِن کی محبوبہ سراپا لطف وکرم تھی اور آج نگاہِ غلط انداز سے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی۔ عُرفی ؎

ازاں بہ دردِ دگر ہر زماں گرفتارم | کہ شیوہ ہائے تُرا باہم آشنائی نیست

فرائڈ جیسے صاحبِ بصیرت نے عورت کی جنسی زندگی کو تاریک براعظم کہا ہے اور اُسے معمہ قرار دیا ہے۔ حالاں کہ بات سیدھی سی ہے اور اِس میں کوئی اچنبھا نہیں ہے۔ عورت کا التفات اور اُس کا رنگِ مزاج اُس کے ایام پر منحصر ہے۔ لاطینی شاعر اووڈ[1] فطرتِ نسوانی کے اس پہلو کا رمز آشنا تھا۔ اُس نے اپنی نظم "فنِ عشق بازی" میں کہا ہے کہ اگر تمہاری محبوبہ تمہارے ساتھ سرد مہری کا برتاؤ کرے تو حوصلہ نہ ہارو، ثابت قدم رہو ایک نہ ایک دِن وہ بالضرور تمہاری جانب ملتفت ہوگی۔ شوہر کے لئے اِس حقیقت کا شعور لازم ہے کہ اِس کے بغیر وہ اپنی زوجہ کی چشم شوق کی زبان سمجھنے سے قاصر رہتا ہے اور بعض دفعہ ایسی حالت میں اُسے مقاربت پر مجبور کرتا ہے جب کہ وہ سرد مہر ہوتی ہے۔ صائب تبریزی نے کہا تھا ؎

کس زبانِ چشم خوباں را نمی فہمد چو من | روزگارے ایں غزالاں را شبانی کردہ ام

زبانِ چشم خوباں کا یہ فہم شوہر کے لئے ضروری ہے۔ عورت لبسا اوقات نگاہِ غلط انداز سے، تبسم زیرِ لب سے، نیا لباس پہن کر، شوہر کے لئے اُس کا مرغوب کھانا پکا کر، اشاروں کنایوں میں پیار کی دعوت دیتی ہے۔ جو مرد اِن اداؤں کو سمجھتے ہیں وہ عمر بھر ایام عروسی کے لُطف و ذوق کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ تاہیتی کی عورتیں نفسانی خواہش محسوس کریں تو وہ اپنے دائیں کان میں سُرخ پھول اُڑس لیتی ہیں اور اس طرح دعوتِ وصال دیتی ہیں۔ افسوس کہ مہذب معاشرے کی عورتیں اِتنی حقیقت پسند نہیں ہو سکیں۔

جنسی موافقت پیدا کرنے کے لئے ملاعبت کے طریقوں کے علاوہ آسنوں کا وقوف بھی لازم ہے۔ ایڈلر کہتا ہے کہ معروف آسن اُس زمانے سے یادگار ہے جب عورت مرد کی لونڈی بن کر

[1] OVID.: THE ART OF LOVE.

رہتی تھی۔ ڈاکٹر میری سٹوپس کہتی ہیں کہ اس آسن میں مرد جلد فارغ ہو جاتا ہے اس لئے اسے ترک کر دینا اَنسب ہے۔ عرب بھی اِسے ناقص قرار دیتے ہیں۔ یونانیوں، چینیوں، عربوں، ہندیوں اور جاپانیوں کے جنسی ادب میں بیسیوں آسن گنائے گئے ہیں اور ان کی تشریح کی گئی ہے۔ فوربرگ نے اپنی کتاب میں نوّے آسنوں کا ذکر کیا ہے جو یونانِ قدیم اور رومہ میں مروج تھے۔ کلیان مل نے ۳۲ اور شیخ نفزاوی[1] نے ۲۵ آسن دیئے ہیں جن میں بعض بڑے پیچیدہ اور تکلیف دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ شیخ نفزاوی نے مشورہ دیا ہے کہ فریقِ ثانی کی رضامندی کے ساتھ مختلف آسن آزمائے جائیں جس آسن کو وہ پسند کرے اُسے مستقلاً اختیار کر لیا جائے۔ یہ مشورہ نہایت قابلِ قدر ہے۔ قدو قامت، لاغری و فربہی، اعضاء کی بناوٹ اور بدن کی خصوصیت کے پیشِ نظر موزوں آسن اختیار کیا جا سکتا ہے۔ دین ڈی ویلڈ نے تیرہ آسن منتخب کئے ہیں جو زیادہ تر کلیان مل اور شیخ نفزاوی سے ماخوذ ہیں۔ اُس نے بھی یہی مشورہ دیا ہے کہ جس آسن سے فریقِ ثانی کی بھرپور تشفی ہو اُسے اختیار کر لیا جائے۔ کلیان مل لکھتا ہے[2]

"شادی شدہ مرد اور عورت کی جدائی اور مرد کے دوسری عورتوں سے رجوع لانے اور عورت کے دوسرے مردوں کے پاس جانے کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ وہ مختلف آسنوں سے کام نہیں لیتے اور اُکتا دینے والی یکسانیت کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اِس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ میاں بیوی کے جھگڑوں اور ان کے اسباب کو بخوبی ذہن نشین کر لینے کے بعد میری سوچی سمجھی ہوئی رائے یہ ہے کہ مرد مختلف آسنوں سے کام لے کر اپنی زوجہ سے جیسی مختلف عورتوں کے ساتھ خلوت میں جانے کا حظ اُٹھا سکتا ہے کہ اس سے اُکتاہٹ اور یکسانیت کا سدباب ہو جاتا ہے۔"

اطالوی شاعر آرمیس نے سولہ آسن نظم کئے تھے جن کی تصویریں ایک مصوّر نے بنائی تھیں لیکن ان میں اکثر جنسی کج روی پر دلالت کرتے ہیں۔ جنسی موافقت کے لئے مناسب آسنوں کا اختیار کرنا ضروری ہے۔

[1] روضۃ العاطر
[2] اننگ رنگ

کہ اِس سے عورت بھی نفسانی حظ اندوزی میں برابر کی شریک ہو جاتی ہے۔

جنسی ناموافقت ازدواجی زندگی کے لئے زہرِ ہلاہل سے کم نہیں ہے۔ میاں بیوی کے آئے دن کے لڑائی جھگڑے، چڑچڑاپن، آشفتہ طبعی، زود رنجی، جسمانی امراض اور نفسیاتی اُلجھنوں کی تہ میں اکثر و بیشتر یہی ناموافقت ہوتی ہے۔ فرائڈ کہتا ہے کہ ایک ضیافت میں وہ اپنے اُستاد ڈاکٹر شارکو کے پاس کھڑا تھا۔ شارکو اپنے ایک رفیقِ کار سے ایک نوجوان شادی شدہ جوڑے کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔ شارکو کا خیال تھا کہ دُلہن عصبی المزاجی اور خبطِ حواس کی مریضہ تھی کیوں کہ اُس کا شوہر کوتاہ ہمت تھا۔ مخاطب حیران ہو کر بولا "شوہر کی جنسی کوتاہ ہمتی کا اُس کی بیوی کی عصبی المزاجی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔" اس پر شارکو کہنے لگا "اِس نوع کے امراض کی تہہ میں ہمیشہ، ہمیشہ، ہمیشہ جنسی سبب ہی ہوتا ہے۔" فرائڈ کہتا ہے کہ وہ شارکو کا یہ جملہ کبھی نہیں بُھلا سکا۔ فرائڈ کا اپنا سوچا سمجھا ہوا عقیدہ یہ ہے کہ ہمارا جنسی عمل ہماری ساری زندگی کو ایک خاص نہج پر موڑ دیتا ہے جو مرد کوتاہ ہمت ہوتے ہیں ان کی بیویاں عصبی المزاجی، تشویش کی اُلجھن، ہسٹریا وغیرہ میں مبتلا ہو جاتی ہیں اور اپنے آپ کو دائم المرض سمجھ کر ڈاکٹروں کے پیچھے بھاگتی پھرتی ہیں۔ فلس بوٹوم لکھتی ہیں [1]

"الفرڈ ایڈلر کی ایک چچازاد بہن مشورے کے لئے آئی اور کہنے لگی مجھے شدید دردِ سر لاحق رہتا ہے۔ ایڈلر نے کہا محض دردِ سر کبھی نہیں ہوتا کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہاری بیاہتا زندگی میں تو کوئی گڑبڑ نہیں ہے؟ اس پر وہ خاتون غصے میں پیچ و تاب کھاتی ہوئی چلی گئی۔ اس کے ایک ماہ بعد اُس نے طلاق کے لئے عدالت میں درخواست دے دی۔"

ہسٹیریا سے بحث کرتے ہوئے یونانی طبیب بقراط لکھتا ہے کہ جنسی فاقہ زدہ عورت کا ذہنی توازن قائم نہیں رہ سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ عورت کے جسم کا اہم ترین عضو ہسٹیر (رحم) ہے۔ فمِ رحم مرد کے عضو کے اتصال سے محروم رہے تو عورت خللِ ذہن میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اسی حالت کو ہسٹیریا کہتے ہیں۔

---

[1] ALFRED ADLER

عربوں نے ہسٹیریا کا ترجمہ بجا طور پر اختناق الرحم کیا تھا۔ بقراط کی دیدہ وری قابلِ داد ہے کہ آج اکثر ڈاکٹر ہسٹیریا کی یہی تشخیص کر رہے ہیں۔ ہیگن اور بالز ہیڈ کے خیال میں ہسٹیریا کے اسباب دو ہیں ــــ (۱) بھرپور جنسی تشفیؔ سے محرومی۔ ــــ (۲) جمالیاتی احساس کی جراحت۔ ایک دوشیزہ کے ذہن میں اپنے ہونے والے شوہر کا مثالی تصوّر ہوتا ہے۔ شادی کے بعد اُسے پیار کرنے والا اور جنسی تسکین کرنے والا شوہر نہ مل سکے تو اس کے تصوّر کو ٹھیس لگتی ہے اور وہ خلل ذہن میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ جنسی مواصلت میں ایک نوع کا جمالیاتی احساس[1] بھی مشمول ہو جاتا ہے جو بعض مردوں کی ٹھس حیوانیت سے مجروح ہو جاتا ہے۔ جو مرد کسبیوں کے پاس جاتے ہیں ان کا جنسی طرزِ عمل بھی جمالیاتی احساس سے عاری ہو جاتا ہے۔ اِسے سچی محبت اور خلوص ہی سے برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

مرد کی کوتاہ ہمتی کے باعث اکثر عورتیں جھگڑالو، سرکہ جبیں اور زود اشتعال ہو جاتی ہیں اور ہر وقت، ہر بات، ہر طریقے سے ہر شخص سے اُلجھنے لگتی ہیں۔ وہ خود غم زدہ ہوتی ہیں اور لئے دوسروں کو بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتیں۔ عام طور سے جنسی ناموافقت کا سبب مرد کی کوتاہ ہمتی ہوتی ہے اِس کی دو صورتیں ہیں۔ ــــ (۱) نامردی۔ ــــ (۲) سرعتِ انزال۔ نامردی کی کئی قسمیں ہیں۔ بعض مرد پیدائشی عنین ہوتے ہیں۔ بعض کسی حادثے کے باعث قوتِ رجولیت سے محروم ہو تے ہیں بعض مردوں کے مادہ منویّہ میں کرمِ حیات نہیں ہوتے اگرچہ وہ جنسی ملاپ پر قادر ہوتے ہیں۔ سدومیّت میں مداومت کرنے والے بھی خیزش سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ خوف، تشویش اور اعتمادِ نفس کا فقدان بھی مرد کو عورت کے ناقابل بنا دیتا ہے۔ اِسے نفسیاتی نامردی کہتے ہیں۔ جنسی کوتاہ ہمتی کی عام صورت سرعتِ انزال ہے جو مرد کو شدید احساسِ کمتری، مریضانہ حساسیت، عصبی المزاجی اور تشویش کی اُلجھن میں مبتلا کر دیتی ہے اور اِس کے ساتھ اُس کی بیوی کی زندگی بھی اجیرن ہو جاتی ہے۔ کِنسے اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے۔

" شاید تین چوتھائی مرد مقاربت کے دو منٹ بعد منزل ہو جاتے ہیں۔ عورتیں جو اکثر

---

[1] لفظ AESTHETICS کا مادہ SEX میں ہے۔ جمالیاتی احساس جنس کا لازمی عنصر ہوتا ہے۔

وبیشتر نامساعد حالات میں جنسی زندگی گزارتی ہیں دس پندرہ منٹ کی ترغیب
وملاعبت کے بعد نفسانی حظ کے نقطۂ عروج کو پہنچ جاتی ہیں۔ ایسی بے شمار عورتیں
ہیں جنہیں عمر بھر اس نقطۂ عروج کا علم تک نہیں ہوتا۔ عورت کو جنسی حظ کی غائت
تک پہنچانے کے لیے مرد کا غیر معمولی طور پر قوی ہونا اور مقاربت کو غیر معمولی
طوالت دینا لازم ہے۔"

ڈاکٹر یوسٹیس چیسر کے خیال میں پچھتر فیصد عورتیں بھرپور جنسی آسودگی سے محروم رہتی ہیں۔ ڈاکٹر ولہلم سٹیکل کہتا ہے کہ بہ مشکل چار فیصد عورتیں جنسی حظ کی انتہا کو پہنچ پاتی ہیں۔ یہ اعداد و شمار مغربی ممالک سے لیے گئے ہیں جہاں سُرعتِ انزال کا مرض وبا کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ ایشیا اور اور افریقہ میں بھی بے پناہ عورتیں شوہروں کی سرعت انزال کے باعث جنسی مسرّت سے محروم رہتی ہیں۔ عُلمائے جنسیات کی تحقیق کے مطابق نوے فیصد طلاقوں کی تہہ میں مردوں کی کوتاہ ہمتی ہی ہوتی ہے۔ عورتیں طلاق لینے کے لئے عجیب وغریب بہانے بناتی ہیں۔ کوئی کہتی ہے کہ میرا شوہر میرے جذبات کی قدر نہیں کرتا، کوئی اُس پر ذہنی اذیت دینے کا الزام لگاتی ہے اور کوئی اُس کی بے وفائی کا رونا روتی ہے لیکن اصل وجہ اکثر و بیشتر یہی ہوتی ہے کہ وہ شوہر کی سُرعتِ انزال سے نالاں ہوتی ہیں۔

آج کل فروعی اسباب کے پردے اُٹھ گئے ہیں۔ فرانس، اطالیہ، سویڈن اور امریکہ میں عورتوں نے طلاق کی درخواستوں میں صاف صاف لکھنا شروع کر دیا ہے کہ شوہر ان کی جنسی تشفی کرنے سے قاصر ہے کیوں کہ وہ وقت سے پہلے فارغ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ولہلم سٹیکل لکھتا ہے۔[1]

"مردوں میں جنسی کوتاہ ہمتی روز افزوں ہے۔ نامردی جدید تہذیب کا کرشمہ
ہے۔ ہر نامرد محبت کے المیے کا مرکزی کردار بن جاتا ہے کیوں کہ نامرد سے شادی
بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس سے عورت کی صحت تباہ ہو جاتی ہے اور
شوہر اور بیوی دونوں کے ذہن و قلب پر اس کے اثرات نہایت ضرر رساں

---

[1] IMPOTENCE IN MALE

ہوتے ہیں۔ آدھے مردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ میرے خیال میں مہذب اشخاص میں بہ مشکل پچاس فیصد پورے مرد ہوں گے۔"

سُرعتِ انزال کے مریضوں کی بیویاں طلاق لے لیتی ہیں یا ادھر اُدھر جھک مارتی پھرتی ہیں۔ ناآسودہ عورت اپنے تخیل میں کسی غیر مرد کو بسا لیتی ہے اور اُس کے وصال کے تصور میں کھوئی رہتی ہے[1]۔

ہیولاک ایلس نے کہا ہے کہ عورت کو جنسی حظ اندوزی کا پورا حق حاصل ہے۔ نامردوں یا آدھے مردوں کی بیویاں اِس حق سے محروم ہو جاتی ہیں اور کسبیاں بن کر رہ جاتی ہیں جو بغیر رغبت کے محض نان نفقہ کی خاطر ایک ایسے مرد کی خلوت میں جاتی ہیں جو اُن کی جنسی تسکین نہیں کر سکتا اور جس سے وہ دل ہی دل میں نفرت کرتی ہیں۔ یہ تکلیف دہ عمل بار بار دھرایا جائے تو عورت کے اعصاب تباہ ہو جاتے ہیں اور وہ زندگی ہی سے بیزار ہو جاتی ہے۔ سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت اُس عورت کی ہوتی ہے جو شرم و حیا کے باعث یا معاشرے کے طعن و طنز کے خوف سے طلاق نہیں لیتی اور اندر ہی اندر گھُل گھُل کر نیم جان ہو جاتی ہے۔

عورت کی سرد مہری بھی زندگی کو ناخوشگوار بنا دیتی ہے لیکن بسا اوقات اِس سرد مہری کی تہ میں مرد کی کوتاہ ہمتی ہی ہوتی ہے۔ جب ایک کوتاہ ہمت بار بار کی کوشش کے باوجود اپنی بیوی کی جنسی تشفی سے قاصر رہتا ہے تو وہ لاشعوری طور پر سرد مہر ہو جاتی ہے۔ اِس کے علاوہ کوئی مرد اپنی بیوی سے بدسلوکی کرئے، اُس کے جذبات کا احترام نہ کرئے، دوسری عورتوں سے برملا معاشقے کرتا پھرے تو بیوی مقاربت میں سرد مہری سے کام لیتی ہے یہ گویا اُس کا انتقام ہوتا ہے۔ اِن مردوں کی بیویاں بھی سرد مہر ہو جاتی ہیں جو مساس اور ملاعبت کے فن سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اور بیوی کی جنسی خواہش کو پوری طرح اُبھارے بغیر مقاربت کرتے ہیں۔ بعض عورتیں شادی کے ابتدائی ایام میں جنسی حظ محسوس نہیں کرتیں اور پہلے بچے کی پیدائش کے بعد ہی اس سے بہرہ یاب ہوتی ہیں۔ عُلمائے نفسیات کہتے ہیں کہ جب تک جنسی خواہش میں مامتا کا جذبہ مشمول نہ ہو عورت

---

[1] اصطلاح میں اِسے HETAERAL PHANTASY کہتے ہیں۔

حظِ کامل سے محروم رہتی ہے۔ تیس اور چالیس برس کی عمر کے درمیان عورت کی نفسانی خواہش عروج پر ہوتی ہے۔ اکثر مرد اس مغالطے میں مبتلا ہوتے ہیں کہ دو چار بچے پیدا ہونے کے بعد عورت کی جنسی خواہش میں زوال آجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑھاپے میں بھی عورت کی جنسی خواہش برقرار رہتی ہے۔ شہزادی میترنخ سے کسی نے پوچھا "عورت کی جنسی خواہش کس عمر میں ختم ہو جاتی ہے۔" اُس نے جواب دیا "میں کیا جانوں میری عمر تو صرف ۶۵ برس کی ہے۔" ایک جاپانی عالم نے کہا ہے کہ عمر کے بڑھنے کے ساتھ بیوی کے مطالبات بدستور قائم رہتے ہیں جب کہ مرد کی توانائی بحال نہیں رہتی۔

اس مقام پر مرد کے ایک تاریخی تعصّب کا ذکر مناسب ہوگا۔ مرد اپنی زوجہ سے کڑی عِفت کی توقع رکھتا ہے لیکن خود ادھر اُدھر جھک مارنے کو اپنا فطری حق سمجھتا رہا ہے۔ یہ تعصّب آج بھی باقی ہے۔ سوڈان، وسطی افریقہ کے قبائل میں لڑکی کی بکارت کے تحفظ کے لئے اُس کی اندام نہانی میں ٹانکے لگا دیئے جاتے ہیں جو شادی کے دن کھولے جاتے ہیں۔ اِس کا رواج مہذب اقوام میں بھی رہا ہے۔ عورتوں کو عصمت کی آہنی پیٹیاں[1] پہنانے کا رواج فلورنس سے شروع ہو کر ۱۵ ویں صدی تک سارے یورپ میں پھیل گیا۔ اُنہیں "وینس کی پیٹی[2]" کہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ عفت شوہر اور بیوی دونوں پر لازم ہے۔ شوہر اس سے آزاد ہوگا تو بیوی سے اس کی پابندی کرانا قرینِ انصاف نہیں رہے گا۔ کامیاب اور بامسرت ازدواجی زندگی گزارنے کے لئے میاں بیوی دونوں کا باوفا رہنا لازم ہے۔ جس بیوی کو یہ معلوم ہو کہ اس کا شوہر کسی غیر عورت سے معاشقہ کر رہا ہے، اُس کے اعتمادِ نفس کو ٹھیس لگتی ہے۔ اُسے اپنی کشش جمال پر شبہ ہونے لگتا ہے اور یہ خیال اُسے ستانے لگتا ہے کہ دوسری عورت اُس سے زیادہ خوبصورت ہوگی۔ باہمی مسرت کی خاطر میاں کے لئے بیوی کی طرح 'باعصمت' رہنا ضروری ہے کہ بدلے ہوئے حالات اور عدل و انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے۔ ایک پاکباز مرد ہی اپنی زوجہ سے عِفت کی توقع رکھ سکتا ہے۔ مرد کی ایک تاریخی غلط فہمی یہ بھی ہے کہ

---

[1] CHASTITY GIRDLES [2] VENUS GIRDLE

حاملہ جنسی خواہش محسوس نہیں کرتی۔ حقیقت یہ ہے کہ حاملہ اپنے بچے کے باپ کی طرف زیادہ کشش محسوس کرتی ہے اور اس سے مقاربت کی خواہاں ہوتی ہے۔ البتہ حمل کے چھٹے مہینے کے بعد مقاربت ضرر رساں ثابت ہو سکتی ہے۔

آج کل پڑھے لکھے طبقے کے افراد شادی سے گریز کرنے لگے ہیں۔ نوجوان عورتیں اور مرد حصولِ تعلیم اور وجہ معاش کے چکر میں شباب کا بہترین حصہ تجرّد میں گزار دیتے ہیں جب ان کی عمر ۲۵ برس سے تجاوز کر جاتی ہے تو وہ ازدواجی زندگی کی ذمے داریاں قبول کرنے سے جی چرانے لگتے ہیں جب کہ بلند معیارِ معیشت کے نام پر اہلِ مغرب شادی سے بے زاری کا اظہار کرتے ہیں۔ شادی سے گریز کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب نوجوان دیکھتے ہیں کہ معمولی وجوہ کی بنا پر دھڑا دھڑ طلاقیں دی جا رہی ہیں اور گھروں میں ازدواجی مسرّت کا فقدان ہے تو وہ شادی سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ عیاش عورتیں اور مرد شادی کو اپنی تفریحات اور مشاغل کے راستے میں رکاوٹ سمجھ کر اس سے دور بھاگتے ہیں۔ ایک حسین ایکٹرس فرماتی ہیں

"میں شادی نہیں کروں گی کیوں کہ مجھے تین باوفا دوستوں کی رفاقت میسّر ہے جو شوہر کے نعم البدل ہیں۔ پہلا کتا جو صبح سے شام تک غوغو کرتا ہے، دوسرا طوطا جو سارا دن گالیاں بکتا ہے، تیسرا بلا جو رات گئے دیر سے گھر آتا ہے۔"

ہمارے معاشرے میں شادی سے گریز کا رجحان حال ہی میں نمو پذیر ہوا ہے اور زیادہ تر پڑھی لکھی خواتین میں ملتا ہے جو اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ ان کا مسئلہ معاشی نہیں نفسیاتی ہے۔ معاشی لحاظ سے وہ خود مکتفی ہوتی ہیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ شادی کے بعد ان کی آزادی سلب ہو جائے گی۔ مجھے کئی ایسی خواتین سے بات کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ جو تیس پینتیس کی ہو چکی ہیں لیکن شادی نہیں کرتیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ترجیح دیتی ہیں جب کہ اس نوع کے نوجوان بالعموم کم تعلیم یافتہ مگر زیادہ خوبصورت لڑکیوں کو ترجیح دیتے ہیں جن پر وہ اپنی برتری جتا سکیں۔ انہیں یہ اندیشہ لاحق ہوتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت سے شادی کی تو وہ اُن کے اشارۂ چشم پر رقص نہیں کرے

گی۔ایک مجرّد نوجوان نے راقم سے کہا کہ جو لڑکی اعلٰے تعلیم یافتہ ہو اور پچیس چھبیس کی ہو چکی ہو ایک
تو وہ خوبصورت نہیں ہو گی کیوں کہ حسین لڑکیوں کو افسر لوگ میٹرک یا ایف اے کی جماعتوں ہی سے
اُچک لیتے ہیں اور دوسرے اِس بات کا قوی احتمال ہوتا ہے کہ وہ اپنی دوشیزگی کھو چکی ہوں کیوں
کہ چھبیس برس کی عمر تک باکرہ رہنا اُس کے الفاظ میں معجزہ سے کم نہیں ہو گا۔میں نے اُسے بتایا کہ
کہ بعض پاک باز لڑکیوں کی بکارت کھیل کود میں زائل ہو جاتی ہے لیکن وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ایک
امریکی نوجوان سے باتیں کرتے ہوئے راقم کو معلوم ہوا کہ وہ شادی کے سخت خلاف تھا۔اُس کے ذہن
میں ایک مثالی بیوی کا تصوّر تھا۔جو صفات اُس نے مثالی بیوی کی گِنائیں اِن سے مفہوم ہوتا تھا کہ وہ ایک
عورت میں پانچ عورتوں کی تلاش کر رہا ہے۔میں نے کہا شادی کا جنسی پہلو ہی سب کچھ نہیں ہوتا
انسان کی پدری اور مادری جبلتّوں کی تسکین بھی ضروری ہے۔جس شخص کے ہاں بچہ نہ ہو وہ بے رحم،
خسیس اور قانوطی ہو جاتا ہے۔اور جو عورت مامتا سے محروم رہے وہ ساری عمر غم زدہ رہتی ہے۔
امریکی نوجوان بولا آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن میں کسی یتیم بچے کو اپنا لے پالک بنا لوں گا اور اپنے پدری
جذبے کی تسکین کر لوں گا۔میں نے کہا ہر نوجوان اِسی طرح سوچنے لگا تو تمہاری نسل معدوم ہو جائے
گی۔اِس پر وہ چُپ ہو رہا۔ ایک دن ایک کنواری خاتون لیکچرر نے شادی کے موضوع پر بات
کرتے ہوئے راقم سے کہا یہ دنیا مصائب کا گھر ہے۔اپنے حظِ نفس کی خاطر میں بچے پیدا کر کے
کیوں اُنہیں مصائب و آلام کی دُنیا میں دھکیل دوں۔گفتگو کے دوران میں راقم نے کہا جب آپ
پچاس ساٹھ برس کی ہو جائیں گی اور ماں باپ بچھڑ چکے ہوں گے تو اِس اتھاہ خوفناک تنہائی اور
اُکتاہٹ کا سامنا کیسے کر سکیں گی؟ جو آپ کو چاروں طرف سے گھٹاٹوپ اندھیرا بن کر گھیرے گی۔بچے مامتا
ہی کی تسکین نہیں کرتے بلکہ بڑھاپے کا سہارا بھی بن جاتے ہیں۔اس پر وہ سوچ سوچ کر کہنے
لگیں شاید آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں لیکن ایک بات اور بھی ہے۔جو لوگ مجھ سے شادی کرنے کے
آرزومند ہیں اِن کی نظر میری تنخواہ پر ہے۔میں نے کہا آپ شائستہ، پڑھی لکھی، خوش شکل ہیں۔
ایک پڑھے لکھے، کھاتے پیتے نوجوان کے لئے آپ کی تنخواہ کی نسبت آپ کی ذات زیادہ پُرکشش

ہو گی۔ اس پر وہ بولیں سب مرد خود غرض اور ہوس پرست ہوتے ہیں، مجھے مرد کی ذات ہی سے نفرت ہے۔ پھر خفیف ہو کر کہنے لگیں میری مراد آپ جیسے بزرگوں سے نہیں ہے بلکہ نوجوانوں سے ہے۔ راقم الحروف نے کہا آپ تجرّد کی جو بھاری صلیب اُٹھا رہی ہیں اُس سے آپ کے کندھے شکستہ ہو جائیں گے اور یہ صلیب عمر بھر اُٹھانا پڑے گی۔ وہ ہنس کر بولیں میرے کندھے خاصے مضبوط ہیں۔ میں نے کہا افسوس کہ یہ کندھے ہمیشہ اتنے مضبوط نہیں رہیں گے۔ آخر میں وہ کہنے لگیں، میں محسوس کر رہی ہوں کہ میرے پاس آپ کے دلائل کا کوئی معقول جواب نہیں ہے لیکن بات یہ ہے کہ میں کسی مرد کی ـــــ کی محکوم ہو کر نہیں رہ سکتی، آپ جانتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں مرد اپنی زوجہ کو مساوی حقوق دینے پر آمادہ نہیں ہے۔ اِس پر بات ختم ہو گئی۔

تجرّد کی زندگی غیر فطری ہے اور ظاہراً غیر فطرتی چیز بامسرت نہیں ہو سکتی۔ فطرت کے خلاف چلنے کا سخت تاوان دینا پڑتا ہے۔ جنسی جبلّت کی قہرمانی سے کسی صورت بھی پیچھا چھڑایا نہیں جا سکتا کہ یہ اپنے اظہار کے لئے کوئی نہ کوئی راہ تلاش کر ہی لیتی ہے۔ فطرتی طریقے سے اس کا اظہار نہیں ہو گا تو غیر فطرتی طریقے اختیار کرنا پڑیں گے۔ اسے دبانے کی کوشش کی جائے تو آدمی خلل ذہن کا شکار ہو جاتا ہے اور تشویش کی اُلجھن، عصبی المزاجی اور مالیخولیا میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جنسی انحرافات میں پناہ لی جائے تو جرم کی اُلجھن لاحق ہو جاتی ہے۔ مرد کسبیوں کے پاس جاتے ہیں یا سدومیّت اور خود کاری سے رجُوع لاتے ہیں۔ عورتیں معاشقے کرتی ہیں یا ہم جنسی اختلاط اور خود لذتی کا سہارا لیتی ہیں۔ میں نے دو لیکچرر خواتین کے بارے میں سُنا ہے کہ ان میں لزبائی تعلق ہے[۱]۔ مجرّد لبسا اوقات جنس زدہ ہوتے ہیں[۲]، سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے نا آسودہ جنسی خواہش کا بھوت ان کے اعصاب پر سوار رہتا ہے۔ اس قسم کی کسی عورت سے کوئی بھی مرد بات کرے، وہ اس واہمے میں مُبتلا ہو جاتی ہے کہ یہ مجھ سے معاشقہ کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح کسی مجرّد سے کوئی عورت مخاطب ہو تو وہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ مجھ پر عاشق ہو گئی ہے۔ ایک مجرّد نے مزاحاً راقم

---

۱ LESBIANS　　　۲ EROTOMANIAC

الحروف سے کہا میں سوتا ہوں تو میری خواہش ہوتی ہے کہ کاش کمرے کی چھت پھٹ پڑے اور ایک پری وش نازنین پکے ہوئے پھل کی طرح میرے بستر میں آ گرے۔ پال ولی نے بھی جو تجرّد کا حامی تھا یہ کہہ کر حقیقت پسندی کا ثبوت دیا تھا کہ "جلتے رہنے سے شادی کرنا بہتر ہے"

تجرد مردوں عورتوں کے لیے زہر ہے۔ خاص طور سے عورت کی زندگی کا بہت بڑا المیہ ہے۔ وہ بڑھاپے کی آمد سے لرزاں و ترساں رہتی ہے اور اُسے اپنی تنہائی اور بے بسی کا غم کھائے جاتا ہے۔ میں ایک معزز گھرانے کی ایک خاتون کو جانتا ہوں جس نے ساری عمر کنوارپنے میں گذار دی تھی کیوں کہ اُس کا منگیتر اوائل شباب میں فوت ہو گیا تھا۔ وہ بڑھاپے میں عورتوں سے کہا کرتی تھی "شادی نہ کر کے میں نے سخت غلطی کی، اپنے آپ پر ظلم کیا، ایسی کرب ناک زندگی گزارنے سے بہتر تھا کہ میں دنیا کے بدترین مرد سے شادی کر لیتی" کسانوا اپنے سوانح میں لکھتا ہے۔

"میں نے شادی نہیں کی کیوں کہ ایک عورت سے وابستگی مجھے پسند نہیں تھی لیکن اب یہی خود مختاری میرے لئے غلامی بن گئی ہے۔ اگر میں نے ایک ہوشمند عورت سے شادی کی ہوتی جو مجھے اپنے قابو میں رکھ سکتی تو میری دولت محفوظ رہتی، میرے ہاں بچے پیدا ہوتے اور میں بڑھاپے کی تنہائی اور افلاس سے محفوظ رہتا۔"

تجرّد سے بحث کرتے ہوئے 'میری مخفی زندگی' کا مصنف لکھتا ہے۔

"متوسط یا اعلٰے طبقے کی جو نوجوان عورتیں اپنی دوشیزگی کو محفوظ رکھتی ہیں اس سے اِن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی قدر و قیمت میں اضافہ کر سکیں۔ لبا اوقات وہ وقت پر شادی نہیں کر پاتیں اور گوناگوں نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتی ہیں کیوں کہ عالم شباب میں حظ نفسانی سے محرومی سخت اندیشہ ناک اور ضرر رساں ہے۔ وہ خود کاری سے کام لیتی ہیں لیکن خود کاری جنسی ملاپ کا بدل نہیں بن سکتی۔

جنسی ملاپ کے بغیر عورت کی بھرپور نفسانی تشفی نہیں ہو سکتی۔ ان کے برعکس
وہ غریب عورتیں زیادہ آسودگی کی زندگی گزارتی ہیں جو جنسی ملاپ سے بلا تکلف
فیض یاب ہوتی ہیں۔"

شادی کا حامی ہونے کے باوجود راقم الحروف کے خیال میں بعض مردوں اور عورتوں کو شادی نہیں کرنا چاہیئے۔ میری مراد اِن مردوں اور عورتوں سے ہے جو مزمن جسمانی عوارض میں مبتلا ہوں یا نفسیاتی لحاظ سے شادی کے ناقابل ہوں۔ ہیولاک ایلس کہتا ہے کہ زہّاد، فلاسفہ، فن کار اور عیاش شادی کے قابل نہیں ہوتے۔ اُنہیں اوائل شباب ہی سے اِس بات کا علم ہو جانا چاہیے کہ وہ شادی کی ذمے داریاں نہیں سنبھال سکیں گے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ اپنی بیویوں کے لئے عذاب بن جاتے ہیں اور اپنے بچوں کی مناسب تربیت کرنے کے اہل نہیں ہوتے۔ یہ رائے شائبۂ صداقت سے خالی نہیں ہے۔ گلیلیو، نیوٹن، لائب نٹز، کانٹ، افلاطون، ابیقورس، فلاطینوس اور شوپن ہائر مجرّد تھے۔ سسرو نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی جب اُسے دوسری شادی کرنے کو کہا گیا تو اُس نے جواب دیا "کوئی شخص بہ یک وقت ایک اچھا شوہر اور ایک اچھا فلسفی نہیں بن سکتا۔" گبن نے تاریخ ہبوط و زوالِ روما لکھنے پر کمر باندھی تو اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور کہا کہ اِس کے لکھنے میں مجھے کئی سال لگ جائیں گے اور انہماک کے باعث میں تمہارے حقوق ادا نہیں کر سکوں گا۔ بڑے بڑے فلاسفہ اور فن کاروں پر استغراق اور تخلیقی شورش اِس قدر غالب ہوتی ہے کہ اِن کی ساری قوتیں تفکر و تعمق پر مرکوز ہو کر رہ جاتی ہیں اور وہ اپنی بیوی کی تالیفِ قلب اور بچوں کی تربیت سے غافل ہو جاتے ہیں۔ جن عظیم فلاسفہ اور فن کاروں نے شادی کی اور اِن کی ازدواجی زندگی المیہ بن کر رہ گئی۔ سقراط، سعدی، غالب، بائرن، بالزاک، لیوٹالسٹائے کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ عیاش ڈان لیوان بھی اچھے شوہر ثابت نہیں ہوتے نہ اچھے باپ بن سکتے ہیں۔ انہیں اپنی ہوا و ہوس سے غرض ہوتی ہے اس لئے وہ بیوی بچوں سے تغافل برتتے ہیں۔ اِن کی بے راہ روی بیوی کے جذبات کو مجروح کر دیتی ہے جس سے وہ سرد مہر ہو

جاتی ہے۔ ڈان یوان اِس سرد مہری کو بہانہ بنا کر غیر عورتوں کے پیچھے بھاگتے پھرتے ہیں۔ ان کی زندگی کا مقصدِ واحد نفسانی لذت کا حصول ہوتا ہے اور وہ لطافتِ احساس سے قطعی بے بہرہ ہوتے ہیں۔ 'ازلی بچے' بھی شادی کے ناقابل ہوتے ہیں۔ 'ازلی بچہ' نفسیاتی پہلو سے ساری عمر نابالغ رہتا ہے اور اپنی بیوی کے لیے بلائے بے درماں بن جاتا ہے۔ وہ جیا یا ہوا مجرد ثابت ہوتا ہے۔ وہ اپنی بیوی میں ماں یا نوکرانی کی تلاش کرتا ہے اور اسے مساویانہ حیثیت دینے پر آمادہ نہیں ہوتا اِس کے علاوہ ایسے نوجوان جو اوائلِ شباب میں کئی سال تک بکثرت و تواتر جلق لگاتے رہیں پورے مرد نہیں بن سکتے نہ اِن کے اعضائے تناسل نشوونما پا سکتے ہیں جس کے سبب وہ فریقِ ثانی کی تشفی نہیں کر سکتے۔ وہ مستقلاً ذکاوتِ حس اور سرعتِ انزال میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ نیم حکیم اور عطائی ماہرینِ طبِ یونان و چین و فرانس اُنہیں جواں مرد بنانے کے نام پر دونوں ہاتھوں سے لوٹتے رہتے ہیں۔ اس قسم کے آدھے مردوں کے ہاں اولاد بھی ہو سکتی ہے لیکن وہ فریقِ ثانی کی بھرپور جنسی تسکین پر قدرت نہیں رکھتے۔ اِن میں اور اُن کی بیویوں میں وہ عضویاتی اور جنسی موافقت پیدا نہیں ہو سکتی جو شادی کی ٹھوس بنیاد ثابت ہوتی ہے۔ اِسی طرح بعض عورتیں کثرتِ خودکاری اور لیزبائی اختلاط کے باعث شادی کے ناقابل ہوتی ہیں۔

ازدواجی زندگی کو کامیاب اور بامسرت بنانے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ مرد عورت کا صحیح جوڑ تلاش کیا جائے۔ 'مردانہ عورتیں'، 'زنخے مردوں' کے ساتھ گزر بسر کر لیتی ہیں کیوں کہ وہ اِن کے بندۂ بے دام بن جاتے ہیں لیکن ایک زنخے کو ایک نارمل عورت سے بیاہنا نامناسب ہو گا کیوں کہ وہ اُس سے تسکین نہیں پا سکے گی۔ اسی طرح ایک غیر معمولی جنسی خواہش رکھنے والے مرد کا ایک غیر معمولی جنسی خواہش رکھنے والی عورت سے نباہ ہو سکتا ہے لیکن ایک سرد مزاج عورت کا نباہ ایک گرم جوش مرد سے نہیں ہو سکتا، نہ گرم جوش عورت ایک سرد مزاج کوتاہ ہمت سے آسودگی پا سکتی ہے۔ مغربی ممالک میں شادی کے لیے مشاورتی ادارے قائم کیے جا رہے ہیں جن میں عضویات، جنسیات اور نفسیات کے ماہرین ہونے والے میاں بیوی کو مناسب مشورے دیتے ہیں۔ اِس نوع کا

پہلا ادارہ ہرش فیلڈ نے برلن میں قائم کیا تھا۔ اِن اداروں کی افادیت روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔
افلاطون نے کہا تھا کہ شادی ایک تنومند صحیح القویٰ مرد کی ایک صحت مند عورت سے ہونا ضروری ہے
تاکہ وہ صحت مند اولاد پیدا کر سکیں۔ یہ ایک ایسی صداقت ہے جو کبھی فرسودہ نہیں ہو گی۔
آج کل مغرب اور امریکہ میں یہ بحث جاری ہے کہ موجودہ صورت میں شادی کا ادارہ باقی رہے
گا یا ختم ہو جائے گا۔ وینس پیکارڈ نے لکھا ہے کہ مستقبل میں شادی مندرجہ ذیل صورتیں اختیار کرے
گی۔

(۱)۔۔۔ عارضی شادی: مثلاً پانچ برس تک شادی کا معاہدہ کیا جائے۔ بعد میں ان میں جدائی ہو سکتی
ہے یا معاہدے کی تجدید کی جا سکتی ہے۔ ایک لڑکی نے کہا "جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے، ہم جانتے
ہیں کہ ہم ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے پیار نہیں کر سکیں گے۔"
(۲)۔۔۔ نوجوان مرد عورتیں خاصے طویل عرصے تک مل جل کر زندگی گزاریں بغیر اس خیال کے کہ اُن کی
آپس میں شادی ہو جائے گی۔ اس قسم کے تعلقات یونیورسٹی کے طلبا میں رواج پا رہے ہیں۔
(۳)۔۔۔ شوہر اور بیوی معاشقے کرنے میں آزاد ہوں اور ایک دوسرے سے باز پُرس نہ کریں۔
(۴)۔۔۔ ایک بچہ ایک باپ یا ایک بچہ ایک ماں کا عائلی نظام ظہور میں آئے جیسا کہ سویڈن میں رواج
پا رہا ہے۔
(۵)۔۔۔ تمام مرد عورتیں جنسی ملاپ میں آزاد ہوں لیکن بچے پیدا کرنے کی اجازت صرف منتخب
نوجوانوں اور لڑکیوں کو دی جائے جو ہر لحاظ سے صحت مند ہوں۔
(۶)۔۔۔ گروہی شادیاں جیسا کہ سویڈن میں رواج پا رہی ہیں: آٹھ آٹھ دس دس نوجوان لڑکے
لڑکیاں مل کر رہیں اور آزادانہ جنسی ملاپ کریں۔ بچوں کی کفالت سب پر ایک جیسی لازم ہو۔
(۷)۔۔۔ ایک مرد بہت سی عورتوں سے اور ایک عورت بہت سے مردوں سے اختلاط کر سکے۔
(۸)۔۔۔ شادی کے مختلف طریقے آزمانے کی اجازت دے دی جائے۔
شادی بہر صورت عین فطرتی ادارہ ہے جس کے بغیر مرد یا عورت کی زندگی کی تکمیل نہیں ہو سکتی نہ وہ

سچی مسرت سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔ بچوں کی مناسب تربیت اور رہنمائی کے لئے بچپن گھرنے والے ماں باپ کا وجود ضروری ہے۔ جن 'حرامی بچوں' کو طفل کدوں' میں پالا گیا ہے ان کی تربیت ناقص رہی ہے۔ ان کی شخصیت و کردار میں محکمی و وابستگی پیدا نہیں ہو سکی نہ ان کے دلوں میں ہمدردیٔ انسانی کا جذبہ راہ پا سکا ہے۔ شادی ایک انسانی ادارہ ہے جو ہزاروں برسوں میں صورت پذیر ہوا ہے اسے ترک کر دیا گیا یا 'گروہی شادیوں' اور 'رفاقت کی شادی' کے نام پر اسے منسوخ کر دیا گیا تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ تہذیب و تمدن کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی، انسان دوبارہ وحوش کی صف میں شامل ہو جائے گا اور صالح، مثبت، تعمیری معاشرتی قدروں سے محروم ہو جائے گا۔ مرد عورت کو مذہبی رسوم کی پابندی سے رشتۂ ازدواج میں منسلک کیا جائے یا سول رجسٹریشن کے ذریعے میاں بیوی قرار دیا جائے۔ شادی کے ادارے کو بہر نوع باقی و برقرار رکھنا قرینِ دانش ہو گا۔

ہم جنسیّت

ہم جنسیّت[1] یعنی مرد کی مرد سے اور عورت کی عورت سے جنسی محبت کا کھوج قدیم ترین اقوام میں بھی ملتا ہے البتہ اِس کے آغاز کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض مورخیّن کی رائے میں اِس کی اِبتداء مصرِ قدیم سے ہوئی جہاں دیوی ماتا آئسس کے معبد میں ہیجڑے پجاری رہتے تھے جن سے زائرین تمتع کرتے تھے۔ مصرِ قدیم کی ایک تحریر سے جو ساڑھے چار ہزار برس کی پُرانی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں اَمرد پرستی کا عام رواج تھا۔ مصر سے یہ علّت جزیرہ کریٹ اور فنیقیہ (کنعان، فلسطین، آج کل لبنان اِس میں شامل تھا) میں پھیل گئی۔ سدوم (لفظ سدومیّت[2] اِسی سے یادگار ہے) اور گمورہ (عامرہ بہ معنی 'آباد') میں اُمردوں کے قحبہ خانے موجود تھے جن کی سرپرستی کو اُمراء لازمۂ نجابت سمجھتے تھے۔ عہد نامۂ قدیم کے باب پیدائش میں لکھا ہے کہ جب دو فرشتے سدوم کو آگ اور گندھک برسا کر تباہ کرنے کو آئے تو جناب لُوط کے گھر ٹھہرے جہاں سدومیوں نے اُنہیں گھیر لیا اور شور مچانے لگے کہ اے لُوط! اِنھیں باہر بھیجو۔ فرشتوں نے اُنہیں اندھا کر دیا اور اِس طرح اپنے آپ کو بچایا۔ فنیقی جہازران تجارت کے سلسلے میں دُور دراز کے بحری سفروں پر جاتے تھے اور غیر اقوام کے بچوں کو خرید کر یا بھگا کر لے آتے تھے۔ اُنہیں آختہ کر کے اُمرا کی حرم سراؤں یا مندروں میں رکھا جاتا تھا۔ جہاں یاتری اپنی سدومی ہوس کی تسکین کرتے تھے۔ فنیقیوں نے شمالی افریقہ کے ساحل پر کارتھیج کا شہر بسایا تو وہاں بھی اَمرد

---

[1] HOMOSEXUALITY اور SODOMY اور LESBIANISM سے زیادہ وسیع المفہوم ترکیب ہے۔ لواطت کی ترکیب غلط ہے۔

[2] سدوی کو اطالوی میں BUGIARDO فرانسیسی میں BOUGRE انگریزی میں BUGGER کہتے ہیں۔ یہ الفاظ BULGAR کی بدلی ہوئی صورت ہیں جو سدومیت کے لیے ہمیشہ سے بدنام رہے ہیں۔

پرستی رواج پاگئی ۔ سدوم کی طرح یونان کا شہر کورنتھ سدومیت کا بہت بڑا مرکز تھا ۔ بابل میں عشتار کے معبد میں ہیجڑے پجاری رہتے تھے جنہیں کدیش (مقدس) کہا جاتا تھا ۔ ان کا پروہت اکو درم کہلاتا تھا ۔ چین قدیم اور جاپان میں امردوں کے قحبہ خانے موجود تھے ۔ فینیقیوں کی طرح جاپانیوں کا بھی خیال تھا کہ سدومی دلیر اور شجاع ہوتے ہیں ۔ اہل یونان نے امرد پرستی کو قومی اور تعلیمی ادارہ بنا لیا اور ہم جنسیت اُن کے معاشرے ، مذہب ، فلسفہ ، اخلاق ، قانون اور شعر و ادب میں نفوذ کر گئی ۔ لائی کرگس اور سولن نے اپنے اپنے ضابطۂ قوانین میں سدومیت کو مباح کر دیا لیکن ایک شرط عائد کی کہ صرف آزاد لڑکوں سے اظہارِ عشق کیا جائے ، غلام ہم جنسی محبت کے اہل نہیں سمجھے ۔ ہومر نے کہا ہے

" سبزہ آغاز نوجوان دُنیا کی حسین ترین مخلوق ہے ۔"

قدمائے یونان امردوں کے حسن و جمال کے شیدائی تھے اور خوش رُو نوجوانوں سے عشق کرتے تھے وہ نوخیزوں کی آنکھوں ، سنہرے بالوں ، اور گلگوں رُخساروں کی تعریف میں رطب اللساں ہیں ۔ ارسطو کہتا ہے ۔

" عشاق اپنے محبوب لڑکوں کے حُسن و جمال کا نظارہ صرف اُن کی آنکھوں میں کرتے ہیں کہ انہی میں لڑکوں کے محاسن کی جھلک دکھائی دیتی ہے ۔"

سقراط ایک حسین لڑکے آٹو لیکس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے ۔

" جس طرح اندھیری رات میں آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں پر سب لوگوں کی نگاہیں جم کر رہ جاتی ہیں اسی طرح آٹو لیکس کے چہرے کی طرف تمام لوگوں کی نگاہیں اُٹھ جاتی ہیں ۔"

افلاطون نے جب حسین جسم میں حسین روح کی تلاش کی تھی تو اس سے اُس کی مراد حسین لڑکے ہی کی روح تھی ۔ یونانیوں کے خیال میں عشق وہ جذب و کشش ہے جو حُسن و جمال کی طرف مائل کرے اور حسن و جمال لڑکوں ہی میں ہوتا ہے چنانچہ وہ حسین لڑکوں کے مجسمے تراش کر اپنے معبدوں میں

رکھتے تھے۔ اعلیٰ طبقے کے لوگ اُمردوں کے قحبہ خانوں میں جانا اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم جنسی عشق کا معاوضہ طلب کرنا یا ادا کرنا مردانِ فرومایہ کا شیوہ ہے۔ یونان کے دیوتا بھی ہم جنسی تھے۔ خداوند خدا زیس کا گینی میڈ سے، اپالو کا ہیاسنتھ سے اور ہرکولیز کا ہائی لیز سے معاشقہ مشہور ہے۔ ارسطو 'جمہوریہ' میں لکھتا ہے کہ جزیرۂ کریٹ میں لڑکوں سے عشق کرنا نہ صرف جائز تھا بلکہ مملکت بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتی تھی تاکہ آبادی میں اضافے کو روکا جا سکے۔ معلوم ہوا کہ مالتھس کا نظریہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔

یونانِ قدیم کے فلاسفہ نے ہم جنسی عشق کی تعریف و توصیف میں منطقی دلائل دیئے ہیں اور شاعروں نے اس کی کشش کے گیت گائے ہیں۔ سقراط سمپوزیم کے مکالمے میں کہتا ہے کہ عشق حصولِ دوام کی آرزو کا نام ہے جو عورتوں کو حاملہ کرتا ہے اور حسین لڑکوں کی عقل و خرد کو جلا دیتا ہے۔ عشقِ افلاطونی سے بالعموم مرد عورت کی پاکیزہ محبت مُراد لی جاتی ہے لیکن یہ درست نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے مرد کی مرد سے سچی اور پُرجوش محبت۔ اہلِ یونان کا خیال تھا کہ نوجوانوں کی باہمی محبت اُن میں عزم و حوصلہ، شجاعت و شہامت اور دوسرے اخلاقی محاسن پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ ہم جنسیت یونانیوں کی تعلیم و تربیت کا جزوِ لازم بن گئی۔ سپارٹا میں نوخیز لڑکوں کو اپنی عمر سے بڑے نوجوانوں سے وابستہ کر دیا جاتا تھا جو اُن کی تربیت کے ذمے دار ہوتے تھے۔ دونوں میں پُرجوش محبت کا ہونا لازم تھا۔ بڑی عمر کے نوجوانوں کو مُصلح اور چھوٹی عمر کے لڑکے کو سامع کہتے تھے۔ جب کسی 'سامع' سے میدانِ جنگ میں بزدلی کا اظہار ہوتا تھا تو 'مصلح' کو سزا دی جاتی تھی کہ تم نے اس کی مناسب تربیت کیوں نہیں کی۔ یونانی ریاست تھیبا کا دستۂ مقدس اس ادارے کی معروف مثال ہے۔ یہ دستہ ایپامانناداس نے مُرتب کیا تھا۔ پلوٹارک لکھتا ہے۔

"یونانِ قدیم کی ریاست تھیبا کا دستۂ مقدس شجاعت و بسالت کے لئے مشہور تھا۔ اسے اُن نوجوانوں سے ترتیب دیا گیا تھا جو ایک دوسرے سے دلی محبت کرتے تھے اور اپنے محبوب کے دوش بدوش لڑ کر جان دینا اپنے لئے باعثِ فخر خیال

کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دستہ ہر لڑائی میں فتحیاب ہوتا رہا۔ جنگ قیرونیہ میں جس میں فلپ شاہ مقدونیہ نے یونانی ریاستوں کی متحدہ فوج کو شکست فاش دی تھی، یہ دستہ بھی شریک تھا۔ اس دستے کے رفقا اس پامردی سے جم کر لڑے کہ شکست کے بعد اس کا ایک سپاہی بھی زندہ گرفتار نہ کیا جا سکا۔ فتح کے بعد شاہ فلپ میدان جنگ کا چکر لگاتا ہوا اُس جگہ پہنچا جہاں اس دستے کے نوجوانوں کے خون آغشتہ لاشے پڑے تھے۔ اُس نے دیکھا کہ تمام مقتولین نے سینے میں زخم کھائے تھے اور ہر ایک کی نعش اپنے رفیق کی نعش کے پاس پڑی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔"

یونان قدیم کی غنائی شاعری فارسی غزل کی طرح خالصتاً ہم جنسی عشق پر مبنی ہے۔ اس میں امردوں سے اظہارِ عشق کیا گیا ہے۔ ایک شاعر سٹریٹون کہتا ہے

"شدید گرمی میں ایک حسین پھول کملا کر رہ جاتا ہے اسی طرح خط کا ایک بال لڑکے کے حسن کو تباہ کر دیتا ہے۔"

ایبی کس حسین لڑکوں کی آنکھوں کو ستاروں سے تشبیہ دیتا ہے جو اندھیری رات میں چمک رہے ہوں۔ ایک یونانی شاعر کہتا ہے

"میرے پیارے تری آنکھیں تو بہروں سے بھی باتیں کرتی ہیں۔"

فلوسٹریٹس اپنے محبوب لڑکے کو مخاطب کر کے گویا ہوتا ہے۔

"میں نے تمہیں گلاب کے پھولوں کا ایک گلدستہ بھیجا ہے اس لئے نہیں کہ تم ان سے لطف اُٹھاؤ بلکہ اس لئے کہ تمہارے ہاتھ میں وہ تر و تازہ رہیں گے۔" [1]

"یہ پھول تمہارے لئے زیب و زینت کا باعث نہیں ہوں گے بلکہ تم ان کی زیبائش کا موجب ہو گے" [2]

---

[1] ز غارتِ چمنت بر بہار منت ہاست ۔۔۔ کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

[2] بزیورہا بیارایند وقتے خوب رویاں را ۔۔۔ تو سیمیں تن چناں خوبی کہ زیورہا بیارائی

" تم نے مجھے ملامت کی ہے کہ میں تمہیں گلاب کے پھول نہیں بھیجتا۔ تمہیں ان کی ضرورت بھی کیا ہے۔ تمہارے اپنے رخساروں پر گلاب کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔" [1]

شاعر لکم تیس نے ایک شخص ہپیاس کا ذکر کیا ہے جو اپنے محبوب اندی مین کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکنے کا ایسا مشتاق تھا کہ اُسے سونے نہیں دیتا تھا۔ یوری پیڈیز اپنے ایک المیے میں کہتا ہے

" نوخیز لڑکے مردوں کے لئے تسکین خاطر اور تفریح طبع کا باعث ہوتے ہیں۔"

شاعر اناکریون شاہ پالی کریٹس کے ایک حسین غلام سمرولیس پر فریفتہ ہو گیا اور اُس کی زلف پیچاں کی تعریف میں نظم کہی۔ بادشاہ نے جھلا کر سمرولیس کے بال کٹوا دیئے۔ دیوتا ایراس کے تہوار پر لڑکوں کی محبت کے گیتوں کا مقابلہ ہوتا تھا اور منتخب گیتوں پر انعامات دیئے جاتے تھے۔ عاشق کو 'بھیڑیا' اور محبوب کو 'میمنہ' کہتے تھے۔ جس شریف زادے کا کوئی عاشق نہ ہوتا وہ اِسے اپنے لئے باعثِ ننگ و عار سمجھتا تھا۔ زینوفن کے بقول مرد اور اُمرد کے تعلق کو ازدواجی نوع کا خیال کرتے تھے۔ عورتیں اُمردوں سے جلتی تھیں۔ ایک عورت نے طنزیہ کہا " مجھے ایسے مرد کی ضرورت نہیں ہے جسے بذاتِ خود ایک مرد کی ضرورت ہو۔" لوکین نے اپنے ایک رسالے میں عورت کی محبت پر اُمرد کی محبت کو ترجیح دی ہے۔ افلاطون نے اپنے مکالمے " فیدرس " میں ہم جنسی عشق کی تعریف پرجوش انداز میں کی ہے۔ یونانی زبان میں ہم جنسی عشق کے بارے میں کئی اصطلاحات پائی جاتی ہیں مثلاً " نوخیزوں کا عاشق"، 'خوبصورت لڑکوں کا عاشق'، 'نوخیز لڑکوں کو تاڑنے والا'، 'لڑکوں کو آنکھ سے اشارے کرنے والا'، 'سنہری زلفوں والے لڑکے سے پیار کرنے والا'، وغیرہ۔ جو اُمرد عورتوں کی طرح بناؤ سنگھار کرتے تھے اور زنانہ ادائیں دکھاتے تھے انہیں کینڈس کہتے تھے۔ گھٹیا قسم کے لونڈوں کو ہیٹریا کہا جاتا تھا اور اُنہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا کیوں کہ وہ خرچی وصول کرتے تھے جسے باذوق یونانی آدابِ عشق کے منافی خیال کرتے تھے۔ پیشہ ور اُمردوں کے قحبہ خانوں پر محصول عائد کیا جاتا تھا۔ ہیولاک ایلس لکھتا ہے کہ قدمائے یونان کے خیال میں سچی محبت صرف مرد ہی مرد سے کر سکتا ہے۔ عورت سے عشق کرنے کو وہ جنون خیال کرتے

---

[1] اسے تماشا گاہِ عالم روئے تو   تو کجا بہرِ تماشا مے روی

تھے۔ عورت اُن کے یہاں بچے جننے کے لیے تھی اور بس۔ ہر خاندانی شخص اعلانیہ ایک نوخیز محبوب رکھتا تھا اور اس بات پر فخر کرتا تھا۔ ڈیماس تھینز کے پاس ایک حسین اُمرد تھا جس پر اُس کی بیوی لڑائی جھگڑا کیا کرتی تھی۔ زینوفون کو ایک لڑکے کلنیاس سے عشق تھا۔ ارسطو ہرمیاس پر فدا تھا، زینو رواقی عورتوں کی کشش سے بے نیاز تھا اور صرف اُمردوں سے پیار کرتا تھا۔ مشہور موسیقار عارفیوس خوبصورت لڑکوں کا شیدائی تھا۔ بعض اوقات حسین اُمردوں سے باقاعدہ شادیاں رچائی جاتی تھیں جن کی رُسوم دھوم دھام سے منائتے تھے۔ تھیوکریتس اِس ہمہ گیر شوق پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے۔

" نوجوان دلفس عشق میں مبتلا ہے، میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کسی عورت پر عاشق ہوا ہے یا کسی مرد پر فدا ہے۔"

لکنیس ہم جنسی عشق کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے

" عورتوں سے سبھی شادیاں کرتے ہیں، لڑکوں سے عشق کرنا صرف دانشوروں کا شیوہ ہے کیوں کہ عورت میں نیکی کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔"

افلاطون سمپوزیم میں کہتا ہے

" وہی نوجوان جو ہم جنسی عشق کا تجربہ رکھتے ہوں اچھے سیاستدان بن سکتے ہیں۔"

عورتوں کی ہم جنسی محبت کی روایت بھی یونان قدیم سے یادگار ہے۔ جزیرہ لزباس کی مشہور و معروف شاعرہ سیفو سے اِس کا آغاز ہوا تھا۔ اُس کے وطن کی رعایت سے عورتوں کی ہم جنسی محبت کا نام 'لزبائی عشق'[1] پڑ گیا۔ سیفو نے نوجوان لڑکیوں کو ادب و شعر اور رقص و موسیقی کی تعلیم دلانے کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا۔ وہ اپنی طالبات کو 'رفیقہ' کہا کرتی تھی اور اِن سے اظہار عشق کیا کرتی تھی۔ گورگو، نومیس، انڈرومیڈا، اناگورا، گلیسی اور اٹیس اُس کی محبوب لڑکیاں تھیں۔ اٹیس پر تو وہ جان و دل سے فدا تھی۔ سوءِ اتفاق سے اٹیس ایک نوجوان سے محبت کرنے لگی۔ سیفو نے اپنے سوزِ دروں، آشفتہ خاطری اور یاس و حرماں کا اظہار اِس نظم میں کیا ہے۔

---

[1] LESBIAN LOVE اِس کی دو صورتیں ہیں SAPPHISM (مساحقہ)، TRIBADISM (چپٹ بازی، طبقازنی)

"وہ شخص دیوتاؤں کا مثیل ہے جو تیرے قریب بیٹھا تیری نقرئی سُریلی آواز کو سُنتا ہے
اور پیار کی ہنسی ہنستا ہے۔
یہ دیکھ دیکھ کر میرا جی حیران و لرزاں ہوتا ہے کیوں کہ جب کبھی
میں تمہارے قریب بیٹھوں میری زبان گُنگ ہو جاتی ہے اور مجھ پر سکتہ طاری ہو
جاتا ہے۔
میرے رگ و پے میں آگ کے شعلے بھڑک اُٹھتے ہیں، میری نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں
اور یوں لگتا ہے جیسے سمندر کی موجوں کی آواز میرے کانوں میں آ رہی ہے۔
مجھے پسینے چھوٹ جاتے ہیں اور میرے دست و پا کپکپانے لگتے ہیں، میرا چہرے کا
رنگ خزاں زدہ
گھاس کی مانند پیلا پڑ جاتا ہے۔
مجھ پر سکرات کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور میں وارفتگی کی رَو میں بے اختیار
بہہ جاتی ہوں۔"

ایک اور شعر پارے میں وہ عشق کے "تلخ شیریں عذاب" کا ذکر کرتی ہے۔ افلاطون کہا کرتا تھا کہ "ادب و فن کی نو دیبیاں مانی گئی ہیں۔ میرے خیال میں سیفو دسویں دیبی تھی۔"
سیفو کے علاوہ میجلا اور فیلینس مشہور ہم جنسی عورتیں تھیں جو لزبانی اختلاط کرتی تھیں۔

یونانیوں کی طرح رومیوں کے یہاں بھی ہم جنسی عشق اور سدومیت کا عام رواج تھا۔ سلاطین و اُمراء سب اِس رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ سدومیوں کی اپنی دیوی تھی جسے کاسٹینا کہتے تھے اور اُس کی پوجا ذوق و شوق سے کرتے تھے۔ روما کے امرد عورتوں کی طرح زلفیں بڑھاتے تھے اور ہار سنگھار کرتے تھے۔ اَمردوں کے ساتھ شادیاں بھی رچائی جاتی تھیں۔ قیصرِ روم نیرو کی ملکہ پوپیا مرگئی تو اُس نے ایک لڑکے سپورس سے نکاح کر لیا کیوں کہ اُس کی شکل و صورت پوپیا سے ملتی جلتی تھی۔ قیصر ہیلیو گابولس ایک نوجوان ہاروکلیز پر مرتا تھا۔ اُس نے ہاروکلیز سے باقاعدہ شادی رچائی اور زوجہ کی طرح اُس کی خدمت کیا کرتا تھا۔ کالی گولا

کا محبوب اُمرد امفسٹر تھا جو سیاہ و سفید کا مالک بن گیا تھا۔ رومہ کے حماموں میں خوش رو لڑکے ملازم رکھے جاتے تھے جو یونانی ذوق کی تسکین کرتے تھے۔ رومہ کے شاہی خاندان میں اگرپینیا اور لیویا لذبانی اختلاط کے لئے بدنام تھیں۔ سدومیوں کو کنیدی اور زنانوں کو چھیسی کہتے تھے۔ شریف زادے نامور شہریوں سے برملا سدومی تعلق رکھتے تھے۔ جولیس سیزر اپنے لڑکپن میں تھینیا کے بادشاہ نکومیدس کا محبوب رہ چکا تھا۔ اُس کا جانشین آگسٹس سیزر بھی نوخیزی کے ایام میں کئی لوگوں کا محبوب رہ چکا تھا۔ لاطینی شاعر مارشل نے اپنی عشقیہ نظموں میں لڑکوں ہی سے اظہار محبت کیا ہے اور اپنے محبوب کے معطر بوسوں کا ذکر کیا ہے۔[1]

رومۃ الکبریٰ کے زوال اور عیسائیت کے فروغ کے ساتھ جنسی قدریں بھی متاثر ہوئیں۔ مجوسیت، یہودیت اور اسلام میں ہم جنسی اختلاط اور سدومیت کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ عہد نامہ قدیم میں لکھا ہے

"تو مرد کے ساتھ صحبت نہ کرنا جیسے عورت سے کرتا ہے۔ یہ نہایت مکروہ کام ہے" (احبار)

قسطنطین نے سدومیت کی سزا موت قرار دی اور حکم دیا کہ سدومیوں کو سولی پر گاڑنے سے پہلے سخت عذاب دیا جائے۔ یہ شق یورپی اقوام کے ضابطۂ فوجداری میں شامل کر لی گئی۔ آلڈس ہکسلے[2] نے لکھا ہے کہ لندن کے میوزیم کی دیوار پر ایک تحریر آویزاں ہے جس میں دو آدمیوں کے مقدمے کی تفصیل درج ہے جنہوں نے ۱۸۳۰ء میں سدومیت کا ارتکاب کیا تھا۔ اُنہیں سزا کا حکم سُناتے وقت منصف نے لکھا کہ سدومیت کے اس ارتکاب نے ان اشخاص کے ساتھ سارے ملک کی سلامتی کو معرض خطر میں ڈال دیا ہے کیوں کہ سدوم کا شہر اسی گناہ کی پاداش میں تباہ کیا گیا تھا۔ فیصلہ میں یہ بھی لکھا گیا کہ ان مجرموں کو دوسرے قاتلوں کے ساتھ سُولی پر نہ گاڑا جائے مُبادا ان کے قُرب سے "معصوم قاتل" ملوث ہو جائیں۔

ہندوؤں میں ہم جنسی اختلاط ممنوع تھا۔ منوسمرتی میں عورتوں کے ہم جنسی اختلاط کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے

"اگر کوئی کنواری کسی دوسری کنواری کو آلودہ کرے تو اُسے دو سَو پانسی جُرمانہ کیا

---

[1] SEXUAL LOVE IN ANCIENT ROME.

[2] ENDS AND MEANS

جائے اور دس بید مارے جائیں۔ اگر کوئی عورت کسی کنواری کو خراب کرے تو اُس
کا سر مونڈ دیا جائے یا اُس کی دو انگلیاں کاٹ دی جائیں اور اُسے گدھے پر بٹھا کر
سارے شہر میں پھرایا جائے۔"

مجوسیوں کی شریعت میں سدومی کی سزا موت تھی اوستا میں سدومیت کو سنگین جرم قرار دیا گیا کیونکہ اس سے افزائش نسل پر برا اثر پڑتا ہے۔ مذہب کے زوال کے ساتھ مذہبی اخلاق سے بھی روگردانی کی گئی اور مرورِ زمانہ سے یورپ اور دنیائے اسلام میں بھی ہم جنسیت رواج پا گئی۔ دسویں صدی عیسوی میں نارمن حملہ آوروں نے سدومیت کو دور دور تک پھیلا دیا۔ لوئی چہار دہم کے عہدِ حکومت میں ورسائی کے دربار میں ہم جنسی عشاق نے ایک خفیہ انجمن قائم کی جس میں ڈیوک گرامون، شہزادہ کانٹی اور مارکی دبیراں جیسے روساء شامل تھے۔ انجمن کے ارکان نے عہد کر رکھا تھا کہ وہ زندگی بھر عورت کے قریب نہیں پھٹکیں گے۔ وہ اپنے لباس کے نیچے سونے کی صلیب پہنتے تھے جس میں ایک مرد کے ایک عورت کو پامال کرنے کا نقش کندہ تھا۔ اسے سدومیوں کی انجمن کہنے لگے۔ لوئی نے سختی سے اس کا استیصال کر دیا۔ والٹیر نے فریڈرک اعظم شاہ پرشیا کے دربار کی سدومی فضا کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس سے یورپ بھر کی عورتوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی ہے۔ فریڈرک اعظم نوخیز کیڈٹوں سے جی بہلاتا تھا۔ اس کے عہد سے سدومیت جرمن فوج کی ایک محکم روایت بن گئی اور اسے لازمۂ جوانمردی سمجھا جانے لگا۔

ایڈورڈ دوم شاہ انگلستان سدومی تھا اور اپنے لونڈے پائرس گیوسٹن پر جان چھڑکتا تھا۔ رچرڈ شیردل اپنے یونانی ذوق کے لئے بدنام تھا۔ جیمز اول سٹوارٹ امرد پرست تھا اور اپنے محبوب جارج ولیئرز سے والہانہ عشق کرتا تھا۔ اس نے جارج ولیئرز کو ڈیوک بنا دیا اور وہ ملک کی سیاسیات پر حاوی ہو گیا۔ روم میں ہر سال پوپ کے حکم سے سیکڑوں لڑکوں کو آختہ کیا جاتا تھا تاکہ بڑے ہو کر بھی ان کی آواز کی دلکشی برقرار رہے اور وہ مذہبی سنگیت منڈلیوں[1] میں گا سکیں۔ پادری انہیں ہوا و ہوس کا نشانہ بناتے تھے۔ ان ہجڑوں[2] کے باعث روم سدومیت کا مرکز بن گیا۔ کسانووا نے اپنی خودنوشت سوانح حیات

---

[1] CHOIR · [2] CASTRATE

میں لکھا ہے کہ کارڈینل بورجیس کا محبوب بیجیرا اتنا حسین و جمیل تھا کہ لوگ دُور دُور سے اُسے دیکھنے کے لئے آتے تھے۔ راہبوں اور راہبات کے اقامت خانے سدومیت اور لزبانی اختلاط کے لیے رُسوائے دہر تھے۔ روسو کے اعترافات میں اُن کی اُمرد پرستی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ روسو نوخیزی کے عالم میں تحصیلِ علم کے لئے ایک خانقاہ میں داخل ہوا۔ وہاں اُس پر جو گذری اُسی کی زبانی سُنیئے

"اُن دو بدقماشوں میں سے جو مُور کہلاتے تھے ایک مجھ پر عاشق ہو گیا۔ وہ بڑے اشتیاق سے مجھ سے باتیں کرتا اور میری چھوٹی موٹی ضروریات پوری کرنے پر ہمیشہ مستعد رہتا۔ وہ مجھے اپنے کھانے سے حصّہ بھی دیتا تھا۔ وہ اس ذوق و شوق سے میرا مُنہ چُوما کرتا کہ مجھے گھِن آتی تھی۔ مجھے اُس کے بدوضع چہرے سے جس پر کسی زخم کا گہرا نشان تھا اور جس پر پیار کی بجائے خشمناکی کا گمان گذرتا تھا، خوف محسوس ہوتا لیکن میں چپ چاپ اُس کے بوسوں کو برداشت کر لیتا تھا اور اپنے آپ سے کہتا کہ آخر وہ مجھ سے پیار کرتا ہے اُسے دھتکار دینا نامناسب ہو گا۔ شُدہ شُدہ وہ دست درازی پر اُتر آیا۔ وہ بعض اوقات ایسی عجیب و غریب خواہشات کا اظہار کرتا کہ مجھے شُبہ ہونے لگتا کہ وہ پاگل ہے۔ ایک رات کو اُس نے میرے ساتھ سونے کی خواہش ظاہر کی لیکن میں نے انکار کر دیا اور عُذر کیا کہ میرا بستر بہت چھوٹا ہے۔ اُس نے اصرار کیا کہ میں اُس کے بستر پر چلوں لیکن میں نے پھر انکار کر دیا کیوں کہ اُس کے کپڑے گندے تھے اور اُن سے تمباکو کی غلیظ بدبُو آتی تھی۔ اگلی صبح کو جب ہم ملے تو اُس نے مُجھ سے پھر بوس و کنار کا آغاز کیا اور اس انداز سے کیا کہ میں ڈر گیا ......"

روسو نے خانقاہ کے منتظم سے اُس کی شکایت کی تو وہ فرمانے لگے "واہ! یہ بھی کوئی بات ہے اوائلِ عمر میں ایسے کئی واقعات خود مجھ پر گذر چکے ہیں، میں ذاتی تجربے کی بنا پہ کہتا ہوں کہ یہ تجربہ چنداں ناخوشگوار بھی نہیں ہوتا۔ تم خانقاہ کو خواہ مخواہ بدنام کرنا چاہتے ہو۔" یہ سُن کر روسو سنّاٹے میں آ گیا اور اُسی روز خانقاہ سے بھاگ گیا۔ روسو کے معاصر دیدیرو نے اپنے ناول 'راہبہ کی سرگذشت'

میں لذبائی عشق کا اُستادانہ نقشہ کھینچا ہے۔

قدیم چین میں والدین اپنے خورد سال بیٹوں کو قحط کے ایام میں بیچ دیتے تھے۔ جب وہ بڑے ہو جاتے تو اُنہیں لبسا اوقات اُمردوں کے قحبہ خانوں میں رکھا جاتا تھا۔ جاپان میں یونان کی طرح اُمرد پرستی کو لازمۂ شجاعت سمجھا جاتا تھا اور سمورائی سردار خوبصورت نوخیزوں کو اپنی مصاحبت میں رکھتے تھے جہاں وہ آداب مردانگی سیکھتے تھے اور سرداروں کی سدومی ہوس کی تسکین بھی کرتے تھے۔ رچرڈ برٹن[1] نے ہم جنسیت کا ایک خطہ[2] قرار دیا ہے جو ایک طرف فرانس، سپین، اطالیہ، یونان، مراکو، مصر، ایشیائے کوچک، عراق، افغانستان، کشمیر، پنجاب، چین اور جاپان تک پھیلا ہوا ہے اور دوسری طرف جزائر غرب الہند اور امریکہ پر محیط ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اِس خطے میں ہم جنسیت قدیم ایام سے پنپتی رہی ہے۔ برٹن نے صرف دو اقوام کو ہم جنسیت اور سدومیت سے مُبرّا قرار دیا ہے، عرب اور حبشی، باقی سب اقوام اِس میں ملوث رہی ہیں۔

یونان کے بعد ایران کو ہم جنسیت کا سب سے بڑا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ ہیروڈوٹس کے خیال میں ہم جنسیت یونان ہی سے ایران میں پھیلی تھی۔ یہ بات قرین قیاس ہے کیوں کہ مجوسیت میں اسے نہایت قبیح فعل اور سنگین جُرم سمجھا جاتا ہے۔ ساسانیوں کے عہد حکومت میں ہم جنسیت ایرانی معاشرے کا ایک اہم ادارہ بن گئی تھی۔ خسرو پرویز کے دربار میں نوخیز خوبرو غلام قیمتی لباس پہنے، زُلفیں بڑھائے، سروں پر سونے کے تاج سجائے موجود رہتے تھے۔ ساقی گری کا کام بھی خوش شمائل ہیجڑوں کے سپرد تھا۔ بنی بُویہ کے اقتدار کے ساتھ ہم جنسی عشق فارسی شاعری میں نفوذ کر گیا۔ معتضد دیلمی اُمرد پرست تھا۔ ایک دفعہ ایک جنگ کے دوران میں اُس کا ایک محبوب غلام دشمنوں نے گرفتار کر لیا۔ معتضد نے مارے غم کے کپڑے پھاڑ ڈالے، کھانا پینا چھوڑ دیا اور کئی روز محل سے باہر نہ نکلا۔ یہی حالت شاہان صفوی کی تھی۔ شاہ عباس کبیر کے دربار میں حسین اُمرد زرق برق کپڑے پہنے موجود رہتے تھے۔ تصوف کی تحریک کا آغاز تصفیۂ اخلاق سے ہوا تھا لیکن سیاسی اور اخلاقی تنزل کے ساتھ ہی وہ بھی

---

[1] TERMINAL ESSAY　　[2] SOTADIC ZONE

زوال پذیر ہو گئی۔ غلط کار صوفیوں نے امردوں سے برملا عشق کرنا شروع کیا۔ مولانا رومؔ نے اپنی مثنوی میں ان ریا کار صوفیوں کا پردہ بڑی بے رحمی سے چاک کیا ہے۔ صوفیوں میں عشق ہم جنسی وبا کی صورت اختیار کر گیا حتیٰ کہ سدومیّت کو علتّ المشائخ کہنے لگے۔ فارسی غزل کا محبوب امرد ہی ہے۔ ترسا بچہ، مغ بچہ، ترک بچہ، خط و دستار کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں۔ شعرا امردوں سے عشق کرتے تھے اور اس بات پر فخر کرتے تھے مستشرق براؤن ایران گیا تو اُس نے دیکھا کہ لوگ بے محابا خوش گُل لڑکوں سے اظہارِ عشق کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔

"رات کے کھانے کے بعد نوخیز لڑکے رقص و سرود سے مہمانوں کی تفریح کا سامان کرتے ہیں۔ جب کوئی لڑکا حسین ہونے کے ساتھ خوش گلو بھی ہو تو سامعین پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ مجھے ایک محفل میں شرکت کرنے کا اتفاق ہوا جہاں سامعین گانے والے لڑکے کی آواز اور اُس کے حُسن و جمال سے ایسے متاثر ہوئے کہ بے اختیار اُٹھ کھڑے ہوئے، ہاتھ میں ہاتھ ملا کر اُس کے گرد حلقہ بنا لیا اور لگے مستانہ وار ناچنے۔ وہ ناچتے جاتے اور آواز ملا کر نعرہ لگاتے "بارک اللہ کچلو! بارک اللہ کچلو" (ننھے خدا تمہیں برکت دے)

ایرانی تہذیب و تمدن کے اثرات دُنیائے اسلام پر بڑے گہرے اور دُور رس ہوئے۔ ان اثرات کا کھوج عہدِ بنو عباس، ترکوں کے معاشرے، مصر کے بنو فاطمہ اور ممالیک اور ہندوستان کے غلام اور مُغل بادشاہوں کی زندگیوں میں لگایا جا سکتا ہے۔ ایرانی طرزِ معاشرت اور فنونِ لطیفہ کے ساتھ ساتھ ہم جنسی میلان بھی ہر کہیں رواج پا گیا۔ بنو عباس کے عہد کا تمدن ایرانی ہی تھا۔ ہارون اور جعفر برمکی کی محبت کا ذکر تاریخوں میں محفوظ ہے۔ ہارون ایک لمحہ کے لئے بھی جعفر کو اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا تھا۔ اُس نے ایک ایسا فرغل بنوا رکھا تھا جس کے دو گریبان تھے۔ اسے پہن کر وہ ایک جان دو قالب بن جاتے تھے۔ ہارون کا بڑا بیٹا امین صبح و شام امردوں میں گھرا رہتا تھا۔ اُس نے اپنے محبوب غلاموں کو دو جماعتوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ سفید لباس پہننے والوں کو "ٹڈے" کہتا تھا اور سیاہ پوشوں

کو "کوسے" کہا کرتا تھا۔ یہ عادت چھڑانے کے لئے اُس کی ماں زبیدہ نے حسین وجمیل کنیزیں مردانہ لباس پہنا کر اُس کے پاس بھیجیں۔ اُنہیں غلامیہ کہتے تھے۔ امین اپنے ایک غلام کوثر پر جان چھڑکتا تھا۔ خانہ جنگی کے دوران میں جب مامون کے سپہ سالار طاہر بن حسین کی فوج بغداد میں گھس آئی اور امین کی سپاہ شکست کھا کر تتر بتر ہو گئی تو ایک شخص دوڑتا ہوا امین کے پاس پہنچا جو اُس وقت دریا کے کنارے بیٹھا اپنے محبوب کوثر کے ساتھ مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ اُسے شکست کی خبر دی گئی تو وہ بدمزہ ہو کر کہنے لگا "خدا تمہیں غارت کرے! دفع ہو جاؤ یہاں سے! دیکھتے نہیں کہ کوثر نے دو مچھلیاں پکڑ لی ہیں اور میرے ہاتھ ایک بھی نہیں لگی۔" خلیفہ الحاکم فاطمی کا معاشقہ خواجہ سراعین کے ساتھ مشہور ہے۔

سلاطین اور اُمراء کے حرم سراؤں میں لزبائی عشق کا رواج عام تھا۔ ایک شخص قدرتاً سیکڑوں لونڈیوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا اِس لئے کنیزیں ایک دوسری سے لزبائی اختلاط کر کے اپنی محرومی کا مداوا کر لیتی تھیں۔ طبری لکھتا ہے کہ ایک دن ہادی عباسی اپنے ندیموں کی صحبت میں بیٹھا تھا کہ ایک غلام باریاب ہوا اور اُس نے جھک کر خلیفہ کے کان میں کچھ کہا۔ ہادی نے حاضرین سے کہا تم بیٹھو میں ابھی آتا ہوں اور اُٹھ کر چلا گیا۔ وہ کافی دیر کے بعد واپس لوٹا۔ اُس کا رنگ فق تھا اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ مسند سے لگ کر بیٹھ گیا اور ایک ساعت چپ چاپ بیٹھا رہا۔ حاضرین حیران و ششدر تھے اور بُت بنے بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک غلام آیا۔ وہ ایک طشت اُٹھائے ہوئے تھا جو رومال سے ڈھکا تھا۔ ہادی نے غلام کو حکم دیا کہ رومال ہٹا دے۔ یہ دیکھ کر سب دہشت زدہ رہ گئے کہ طشت میں دو حسین کنیزوں کے کٹے ہوئے سر رکھے تھے اور اُن سے عطر اور لہو کی ملی جلی بُو آ رہی تھی۔ ہادی نے اپنے ندیموں سے کہا جانتے ہو اِن کا قصور کیا تھا؟ اُنہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو ہادی کہنے لگا "مجھے علم تھا کہ یہ کنیزیں ایک دوسرے سے عشق کرتی ہیں۔ میں نے اُن پر مخبر لگا دیئے کہ جب یہ محوِ اختلاط ہوں تو مجھے خبر کر دی جائے۔ آج میں نے اُنہیں عین ناگفتہ بہ حالت میں پکڑ لیا اور اپنے ہاتھ سے دونوں کا سر قلم کر دیا۔" یہ کہہ کر بدستور ہنسی مذاق کی باتیں کرنے لگا۔

مرورِ زمانہ سے مسلمان میں اُمرد پرستی اِس قدر عام ہو گئی کہ غیر مذاہب کے لوگ اسے

اسلام کا جزو سمجھنے لگے۔ البیرونی کے بقول کابل کے ہندو راجہ نے اسلام قبول کیا تو یہ شرط لگائی کہ وہ نہ گائے کا گوشت کھائے گا اور نہ لونڈوں سے عشق بازی کرے گا۔ سلطان محمود غزنوی کا معاشقہ اپنے غلام ایاز سے مشہور ہے۔ سلطان کے بارے میں خوندمیر لکھتا ہے[2]

"سلطان محمود غزنوی کو مشتری چہرہ غلاموں سے عشق تھا۔ فضل بن احمد بھی اِس شوق میں اپنے آقا کا مقلد تھا۔ مثل مشہور ہے کہ غلام اپنے آقا کی پیروی کرتا ہے۔ اُسے کسی نے بتایا کہ ترکستان میں ایک نہایت حسین غلام ہے۔ اس زہرہ جبیں کو حاصل کرنے کے لئے فضل بن احمد نے اپنا ایک کارندہ وہاں بھیجا اور اُسے تاکید کی کہ وہ غلام کو عورتوں کی طرح محمل میں چھپا کر لائے۔ ایک مخبر نے سلطان کو یہ بات بتادی۔ سلطان نے وزیر سے کہا کہ وہ اُس سیم اندام کو حضور میں پیش کرے۔ وزیر لیت ولعل کرتا رہا اگرچہ اُسے یقین تھا کہ سلطان اُس کی جان و مال پر قدرت رکھتا ہے۔ ایک سلطان نے اپنے وزیر سے کہا آج رات ہم تمہارے گھر آئیں گے۔ وزیر نے اسے اپنی عزت افزائی سمجھ کر سلطان کی ضیافت کا اہتمام کیا۔ جب وہ غلام حور شمائل سلطان کے حضور میں آیا تو سلطان نے خشمگین ہو کر وزیر کو سخت سست کہا اور اُسی وقت حکم دیا کہ وزیر کا مال و متاع ضبط کر لیا جائے۔ اِس کے چند روز بعد سلطان عازم ہند ہوا اور اُس کی غیر حاضری میں دشمنوں نے اُسے شکنجے میں کس کر عذاب دے دے کر مار ڈالا۔"

عماد الدین اصفہانی تاریخ سلجوقیہ میں لکھتا ہے۔ "سلطان سنجر کی عادت تھی کہ جو غلام پسند آجاتا تھا اُسے خرید کر اُس سے عشق کرتا تھا اور اس کی عام شہرت ہو جاتی تھی اور جان و مال اُس پر صرف کرتا تھا۔" تزک بابری کے مطالعے سے ہم جنسیت کے عام رواج کا علم ہوتا ہے۔ بابر اپنے ایک عزیز سلطان محمود مرزا کے بارے میں لکھتا ہے۔

---

[1] کتاب الہند   [2] دستور الوزراء

" سلطان محمود مرزا کے عادات و خصائل کے بارے میں یہ کہوں گا کہ وہ پابندِ صوم و صلوٰۃ تھا لیکن اِس کے ساتھ فسق و فجور اور تشدّد میں بھی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ وہ ہر وقت نشے میں دھت رہتا۔ اُس نے کئی لونڈے رکھے ہوئے تھے۔ اُس کی مملکت میں جہاں کوئی نوخیز اور حسین لونڈا دکھائی دیتا وہ اُسے قابو میں لانے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا۔ اُس کے سرداروں کے بیٹے حتیٰ کہ اُس کے رضاعی بھائی اور رضاعی بھائیوں کے بیٹے بھی اُس سے محفوظ نہیں تھے۔"

ہمایوں بھی حسین نوجوانوں میں کشش محسوس کرتا تھا۔ آزاد لکھتے ہیں [1]

" شاہ ابوالمعالی بڑے حسین اور طرحدار تھے۔ ایک دفعہ ایک رئیس علی شیر بیگ کو قتل کر دیا۔ ماخوذ ہو کر دربار میں پیش ہوئے۔ ہمایوں بادشاہ عالمِ حسن و جمال میں محو ہو گئے اور معاف کر دیا۔"

اکبر ایرانی ذوق سے مبرّا تھا لیکن اُس کے اُمراء تُرک اور اُزبک ہم جنسی معاشقے کرتے تھے۔ ایک سردار شاہ قلی ایک خوبصورت نوجوان مقبول خان پر عاشق ہو گیا۔ اکبر نے منع کیا تو اُس نے سب کچھ لُٹا دیا اور جوگی بن کر جنگل کی راہ لی۔ خان زمان ایک نوخیز شاہم بیگ پر مرتا تھا۔ شاہم بیگ کا بھی خان زماں کی داشتہ آرام جان پر آ گیا۔ خان زمان نے یہ طوائف شاہم خان کو بخش دی۔ شاہم بیگ ایک لڑائی میں مارا گیا تو خان زمان نے اُس کے سوگ میں ماتمی لباس پہنا۔ جہانگیر نے ایک سدومی واقعہ نویس اور اُس کے محبوب کو عبرت ناک سزا دی تھی۔ آزاد کے الفاظ میں " بادشاہی واقعہ نویس ایک لڑکے کو لے کر بھاگ گیا کہ نہایت صاحب جمال تھا اور جہانگیر بھی دربار میں دیکھ کر خوش ہوا کرتا تھا۔ حکم دیا پکڑ لاؤ۔ وہ کئی منزل سے پکڑ لائے۔ اپنے سامنے دونوں کی زندہ کھال اُتروا دی۔"

تُرکوں اور اُزبکوں کی طرح افغان اُمراء و سلاطین بھی ایرانی ذوق رکھتے تھے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے سلیم شاہ سُوری اور دولت خاں کے معاشقے کا حال لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

[1] دربار اکبری۔

"مرض کی بے قراری میں بھی یہ حال تھا کہ جب تک اُس کے حواس ٹھکانے رہے اپنے معشوق دولت خان کو سامنے بٹھائے رکھتا تھا اور اُس کی صورت دیکھا کرتا تھا۔ جب کبھی غش سے چونکتا یہی کہتا، دولت خاں کہاں ہے، ضعف کی وجہ سے کروٹ لینا مشکل تھا لیکن اپنے محبوب کی یہ دلدہی تھی کہ اگر دولت خاں دوسری طرف آبیٹھتا تھا تو اُسے یہ گوارا نہ تھا کہ اُسے اپنے سامنے آنے کی زحمت دے بلکہ لوگوں سے کہتا تھا کہ میرا مُنہ اُس کی طرف پھیر دو۔ ایک دن دولت خاں موجود نہ تھا۔ پوچھا "وہ کہاں ہے؟" لوگوں نے کہا کسی سے ملنے گیا ہے۔ سلیم شاہ سمجھا مجھے مرتا ہوا دیکھ کر اَوروں سے پہلو جوڑ لیا ہے۔ اتنے میں دولت خاں حاضر ہو گیا۔ اُس کو دیکھ کر جان میں جان آئی اور سلیم شاہ نے یہ شعر پڑھا ؎

قدرِ من گر نہ شناسی کہ بجانم بوفا باش تا صحبتِ یاران دگر دریابی

سلطان محمد عادل سُوری عرف عدلی ایک بھگت لڑکے پر جو نہایت خوبصورت اور نازک اندام تھا فریفتہ ہو گیا۔ اُسے مجاہد خان کا خطاب دیا اور دس ہزاری کا منصب عطا کیا یہ لڑکا اِس قدر نازک مزاج تھا کہ ایک دفعہ اجادن کے میدان میں چوگان کھیل کر لوٹا تو راستے میں غازی خاں سُور کے ڈیرے پر ٹھہر گیا اور کہا مجھے بھوک لگی ہے۔ غازی خان نے کہا آجاؤ ماحضر تیار ہے لیکن جب کھانا سامنے آیا تو قلیہ کی مہک ہی سے اُسے غش آنے لگا اور وہ وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ مبارک شاہ خلجی اور خسرو خان کا عشق تاریخ ہند کا ایک عبرت ناک باب ہے۔ خسرو خاں ابتداء میں ایک ہندو غلام تھا جس پر سلطان فریفتہ ہو گیا۔ خسرو خان نے اپنے خاندان کے چند لوگوں سے مِل کر سلطان کو قتل کرنے اور تخت و تاج پر قبضہ کر لینے کی سازش کی۔ درباریوں نے بادشاہ کو اُس کے ارادوں سے مطلع کیا لیکن خسرو خان نے خلوت میں نسوانی اداؤں اور عشووں سے رو رو کر اپنی صفائی پیش کی۔ سلطان تو پہلے ہی اس کا شیدائی تھا۔ فرشتہ کے الفاظ میں

"بادشاہ را از گریہ دل بہ درد آمد، او را درکنار گرفت و بوسہ بر رخسارش دادہ

گفت خاطر جمع دار کہ یک موئے سر ترا بہتر از بادشاہی خودمی دانم چہ جائے
آنکہ در خاطرِ تو دغدغۂ بدگویاں باشد"

خسرو خاں نے اُسی شب مبارک شاہ کا سر تن سے جُدا کر دیا، اُس کے بچوں کو تہ تیغ کیا اور اُس کی بیگمات کو گھر میں ڈال لیا۔ سکھ بھی سدومی ذوق سے بہرۂ وافر رکھتے تھے۔ رنجیت سنگھ کا معاشقہ گلاب سنگھ سے مشہور ہے۔ گلاب سنگھ اُس کا محبوب لونڈا تھا۔[1] یہ گلاب سنگھ وہی ہے جس کے ہاتھ انگریزوں نے ارزاں پونے کشمیر بیچ دیا تھا۔

ہسپانیہ میں بھی ہم جنسیت کے آثار ملتے ہیں۔ جوزی نے عشقِ ہم جنسی کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جو درج ذیل ہے۔

"ہسپانیہ کا نحوی ابن کلیب (متوفی ۱۰۳۵ء) اور اسلم جو ایک قاضی کا خوبصورت بیٹا تھا اکھٹے پڑھتے تھے۔ ابن کلیب اُس پر فریفتہ ہو گیا اور اُس کے حُسن و جمال کی تعریف اور اپنی شیفتگی کا احوال اپنی نظموں میں بیان کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ ان نظموں کا دُور دُور چرچا ہو گیا اور گویّے محفلوں میں اُنہیں گانے لگے۔ احمد بن کلیب نے اپنی کتاب الفصیح بھی اسلم کے نام پر معنون کی۔ اسلم کو شرم محسوس ہوئی اور اُس سے ملنا چھوڑ دیا۔ غمِ فراق میں ابن کلیب کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ وہ پہروں اسلم کے مکان کے دروازے کے سامنے اِدھر اُدھر ٹہلتا رہتا کہ کہیں آتے جاتے اُسے اپنے محبوب کا دیدار میسّر آئے لیکن اسلم کترانے لگا۔ ناچار ایک دن ابن کلیب ایک بدّو کے بھیس میں انڈے مُرغیاں بیچنے کے بہانے اسلم کے دروازے پر آیا۔ اسلم باہر نکلا تو ابن کلیب نے اُس کا ہاتھ چُوما اور ظاہر یہ کیا کہ وہ اُس کا مزارع ہے جو اُس کے لیئے تحفے لایا ہے۔ دورانِ گفتگو میں اسلم نے اُسے پہچان لیا اور شکایت کی کہ تمہاری وجہ سے میں کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ ابن کلیب

---

[1] JOURNAL OF VOYAGE VICTOR JACQUEMONT

شکستہ دل لَوٹ گیا اور قضا کار گھر جاتے ہی بیمار پڑ گیا۔ مرض نے طول پکڑا تو اُس نے اپنے ایک دوست سے التجا کی کہ جس طرح ممکن ہو سکے وہ ایک بار اسلم کو اُس کے پاس لے آئے۔ دوست اسلم کے پاس گیا اور منّت سماجت کر کے اُسے اپنے ساتھ جانے پر آمادہ کر لیا۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھا کہ اسلم شرما کر ٹھہر گیا اور کہا بخدا اِس سے آگے میں نہیں جاؤں گا تم مجھے مجبور نہ کرو ابن کلیب کے دوست نے کہا بس اَب کچھ زیادہ دور نہیں جانا ہو گا، مکان بالکل قریب ہے۔ اسلم نہ مانا اور واپس مُڑا۔ دوست نے اُس کا دامن پکڑ لیا مگر وہ چھُڑا کر بھاگ گیا۔ ناچار وہ اکیلا ابن کلیب کے پاس پہنچا۔ ابن کلیب نے اپنا ایک غلام راستے میں کھڑا کر رکھا تھا جس نے اُسے اسلم کی آمد کی خوشخبری دے رکھی تھی اور وہ ہمہ تن انتظار میں بیٹھا تھا۔ جب اُس کا دوست اکیلا واپس لَوٹا اور ساری روئداد کہہ سُنائی تو ابن کلیب کے چہرے کا رنگ متغیّر ہو گیا اور اُس پر ہذیان کے آثار ظاہر ہو گئے۔ اُس کا دوست باہر نکلا۔ ابھی وہ گلی ہی میں تھا کہ ابن کلیب کے متعلقین کے نالہ و بُکا کی آوازیں آنے لگیں اور وہ سمجھ گیا کہ ابن کلیب واصل بحق ہُوا۔"

مصری قدیم زمانے سے ہر نوع کی جنسی بے راہ روی کے لیئے بدنام رہے ہیں۔ اسلام کی اشاعت نے بھی اُن کی جنسی عادات کو چنداں متاثر نہیں کیا۔ رچرڈ برٹن[1] لکھتا ہے کہ نیدرلینڈ کے کونسل جنرل موسیو دارائے نیر نے ایک دن سعید پاشا سے کہا کہ مصر میں سدومیّت پھیلی ہوئی ہے حالاں کہ یہ نہایت مذموم فعل ہے۔ سعید پاشا نے جواب دیا "موسیو! آپ کی رائے محض قیاسی ہے۔ اِس موضوع پر اظہار رائے سے پہلے بہتر ہو گا کہ آپ اِس کا دونوں طرح کا تجربہ کر لیں"۔ یہ لطیفہ ایک مدت تک ڈپلومیٹ حلقوں میں چکّر لگاتا رہا۔ چارلس نیپر نے سندھ کو فتح کیا تو اُسے بتایا گیا

[1] TERMINAL ESSAY

کہ کراچی میں اُمردوں کے قحبہ خانے ہیں جن کی سرپرستی برملا کی جاتی ہے۔ اس بات کی تحقیق کے لیے رچرڈ برٹن کو مامور کیا گیا جو سندھی زبان جانتا تھا۔ اُس نے بھیس بدل کر اپنا نام مرزا عبداللہ بوشہری رکھا اور مرزا محمد حسین شیرازی کو ساتھ لے کر ان قحبہ خانوں کا کھوج لگایا۔ رچرڈ برٹن کے بقول قبائلی علاقے اور افغانستان سے جو قافلے ہندوستان کو آتے تھے اُن میں نوخیز اُمردوں کو زنانہ لباس پہنا کر قافلے والے اپنے ساتھ لاتے تھے۔ انہیں کوچی سفری کہتے تھے۔ یاد رہے کہ عالمِ جنسیات میں ہم جنسی عشق اور سدومیت پر تحقیق علمی کی اولیت رچرڈ برٹن ہی کو دی جاتی ہے۔ اُس نے ہم جنسیت کی توجیہہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ میلان اُن اقوام میں پایا جاتا ہے جن کے معاشرے میں مردوں اور عورتوں کو میل جول کی آزادی نہیں ہوتی نیز فوجیوں کی لشکر گاہوں، سکولوں اور کالجوں کی اقامت گاہوں، جیلوں اور سمندری جہازوں میں سدومیت عام ہوتی ہے کیوں کہ اِن میں صنفِ مخالف سے اختلاط کے مواقع کم ملتے ہیں۔ یہ بات ایک حد تک درست ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ فی زمانہ ہمہ گیر جنسی آزادی کے باوجود مغربی ممالک میں ہر کہیں ہم جنسیت اور سدومیت کا رواج عام ہو رہا ہے۔ امریکہ میں ہم جنسی گوشۂ تاریکی سے باہر نکل آئے ہیں اور کھلّم کھلا اپنے ذوق کا اظہار کرتے ہیں۔ اُن کے کلب الگ ہیں، علاحدہ ناچ گھر[1] اور شراب خانے[2] ہیں جہاں صرف ہم جنسی اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ اُن کے خاص کھیل کے میدان ہیں، تھیٹر ہیں، موسیقی کی محفلیں ہیں، ہوسٹل ہیں، رسالے ہیں اور اخبار ہیں[3]۔ وہ اعلانیہ ہم جنسیت سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔ اُمرد تنگ پتلونوں اور ڈھیلے ڈھالے سویٹروں سے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ کولہے مٹکا مٹکا کر راستہ چلتے ہیں۔ سدومی چمڑے کی جیکٹ پہنتے ہیں۔ صرف سان فرانسسکو میں ہم جنسوں کے تیس شراب خانے ہیں جہاں اغیار بار نہیں پا سکتے۔ اُمرد کو 'ملکہ' کہتے ہیں۔ یہ نوجوان غازے اور لپ سٹک کا استعمال کرتے ہیں اور شوخ رنگوں کا لباس پہنتے ہیں۔ ٹینس کے جوتوں سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔

---

[1] GAY-BALL [2] GAY-BAR

[3] GAY-WORLD

ہم جنسی پارکوں میں اور سڑکوں کے کنارے اپنے ہم مشرب سرپرستوں کے انتظار میں کھڑے ہوتے ہیں اور اپنے خاص اشاروں سے ایک دوسرے کو اپنی جانب مُلتفت کرتے ہیں۔ اضلاعِ متحدہ امریکہ میں پچاس تنظیمیں ہم جنسوں کی قائم ہیں جن کے اراکین ایک دوسرے کو ملاقات کا وقت دیتے ہیں اِس وقت ملک بھر میں چھبیس لاکھ مرد اور چودہ لاکھ عورتیں ہم جنسی اور لزبائی ہیں۔ سان فرانسسکو، نیو یارک، لاس اینجلس، سینٹ لوئی وغیرہ بڑے بڑے شہروں میں ہم جنسوں کے شبانہ رقص ہوتے ہیں جن میں اُمرد زنانہ لباس پہن کر شریک ہوتے ہیں۔ ہم جنسوں کے اپنے ناٹک گھر ہیں جہاں عشقِ ہم جنسی کے موضوع پر کھیل دکھائے جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایک چاہنے والا اپنے محبوب اُمرد اور ایک شیلائی عورت اپنی دوگانہ کے ساتھ مل کر رہتے ہیں گویا اُن کا تعلق ازدواجی ہے حال ہی میں ایک خبر شائع ہوئی ہے کہ آسٹن (ٹیکساس) میں سٹیٹ اٹارنی کرافورڈ مارٹن نے دو مردوں کی باہمی شادی کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔ یہ دونوں پہلے امریکی باشندے ہیں جنھوں نے آپس میں باقاعدہ شادی کی ہے۔ ولیم ارٹ کی عُمر ۲۰ سال اور انٹونیو مولیا نا کی عمر ۴۲ سال ہے۔ اِن دونوں نے ۵۔ اکتوبر کو ہوسٹن کے گرجا میں باقاعدہ شادی کی تھی۔ ایسے بے شمار ہم جنسی اور لزبائی جوڑے ہیں جو گرجا کے توسط کے بغیر ازدواجی زندگی گذار رہے ہیں۔ امریکہ میں ہم جنسیت اِس قدر عام ہو گئی ہے کہ اربابِ حکومت مُتوحّش ہو گئے ہیں اور ملک بھر میں ہم جنسیت کی دہشت طاری ہے۔ ہم جنسیت اور سدومیت جدید تمدن کا ایک اہم مسئلہ بن گئی ہے۔ ۲۸۔ جون ۱۹۷۰ء کو دس ہزار ہم جنسوں نے نیو یارک میں جلوس نکالا اور مطالبہ کیا کہ ہم جنسوں کو ملازمتوں میں مناسب حصّہ دلایا جائے اور اُنہیں برسرِ عام ایک دوسرے سے پیار کرنے اور شادی رچانے کا حق دیا جائے۔

عورت کی آزادی سے مغرب میں ایک خاموش نفسیاتی انقلاب آ رہا ہے۔ مردوں میں زنانہ پن پیدا ہونے لگا ہے اور عورتوں میں مردانہ خصوصیات اُبھر رہی ہیں۔ نتیجتہً مغربی فضا ہم جنسی میلان

لہ THE HOMOSEXUAL IN AMERICA

TIME, OCTOBER 31, 1969.

لہ امروز ۱۰ دسمبر ۱۹۷۲ء

کے پہنچنے کے لیے زیادہ سازگار ہو گئی ہے۔ جیمز میک پارٹ لینڈ لکھتا ہے[1]

"ہمارے بے شمار مردوں عورتوں کا ہم جنسیت میں پناہ لینا ہمارے مستقبل کے لیے خطرے کا نشان بن گیا ہے۔"

مغرب کے قحبہ خانوں میں ہم جنسی میلان اور لزبائی شوق کی تشفی کے سامان کیے جاتے ہیں۔ ان میں اُمرد اور دوگانہ رکھی جاتی ہیں جن کی خدمات حاصل کرنے کے لیے ہزاروں ڈالر خرچ کیے جاتے ہیں۔ نیویارک، پیرس، ٹوکیو وغیرہ کے قحبہ خانوں میں لزبائی اختلاط کے مناظر دکھانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ کنسے کے بعد کی تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ لزبائی عورتوں کی تعداد امریکہ میں ہم جنسی مردوں سے کہیں زیادہ ہے اور لزبائی عورتیں آزادیٔ نسواں کی تحریک کی پرجوش علم بردار بن گئی ہیں۔ ایک خاتون باربرا لو لکھتی ہے[2]

"لزبائی وہ عورتیں ہوتی ہیں جو مرد کی مالی اور جذباتی محتاجی کے بغیر گذر بسر کر سکتی ہیں اور انتہا درجے کی خود مختار ہوتی ہیں۔ وہ یہ بات منوانے کے لیے دن رات برسرِ پیکار ہیں کہ عورتیں بھی صحیح معنوں میں انسان ہیں اور مردوں کے محض ضمیمے ہی نہیں ہیں۔ وہ قدیم جنسی اور جذباتی روایات کو یکسر ترک کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ لزبائی عورتوں کو اپنے جنسی میلان کے باعث زیادہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور انہیں سزا کی مستوجب سمجھا جاتا ہے اس لیے یہ امر باعث حیرت نہیں ہے کہ لزبائی عورتیں آزادیٔ نسواں کی تحریک میں پیش پیش ہیں اور اس کی قیادت کر رہی ہیں۔ اگر آزادیٔ نسواں کا مطلب مرد کی غلامی کا جوا اُتار پھینکنا ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ لزبائیوں نے یہ جوا اپنی گردنوں سے اُتار پھینکا ہے۔"

---

[1] SEX IN OUR CHANGING WORLD

[2] WOMAN IN SEXIST SOCIETY.

انتہا پسند[1] لزبائی عورتیں مرد کی غلامی سے نجات پانے کے لئے نکاح نہیں کرتیں بلکہ اپنی اپنی دوگانہ سے مل کر رہتی ہیں۔ امریکہ کے طول و عرض میں "بلائٹس کی بیٹیاں"[2] کی تنظیمیں قائم کی گئی ہیں جو عورتوں کے حقوق کے لئے کشمکش کر رہی ہیں۔ وہ بناؤ سنگھار، نئے فیشن کے ملبوسات، اور آرائش و زیبائش سے نفرت کرتی ہیں، پتلون پہنتی ہیں اور سگار پیتی ہیں۔ وہ مردوں کی طرح جملہ علوم و فنون میں امتیاز حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ہم مرد کے لئے گڑیا بن کر نہیں رہیں گی بلکہ اُسی کی طرح مستقل اور کامل شخصیت کی تعمیر کریں گی۔ اُن کے خیال میں[3]

"لزبائی عورتیں اوائل عمر سے خود مختاری کی زندگی گذارنا چاہتی ہیں اِس لئے اُنہیں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لزبائی عورتیں کامل شخصیت کی آرزو مند ہیں اور مردوں کی ہر قسم کی محتاجی سے نجات پانا چاہتی ہیں۔ وہ اُس نسوانی رول کو ترک کر دینے پر اصرار کرتی ہیں جس کے باعث عورت اب تک مرد کی غلامی میں گذر بسر کرتی رہی ہے۔"

وہ لزبائی شادیوں کے حق میں دلائل دیتی ہیں اور کلیسا سے ہم جنسی شادی کے حق کو تسلیم کروانے کے لئے کشمکش کر رہی ہیں۔ اُنہیں بچے پیدا کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کیرولین برڈ نے بلائٹس کی بیٹیوں کے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا[4]

"مستقبل میں تولید کا تصرّف ٹوٹ جائے گا اور معاشرۂ انسانی میں کئی قسم کے اسالیب حیات نمود پذیر ہوں گے۔"

امریکہ کے عُلمائے عُمرانیات و نفسیات کے خیال میں ہم جنسیت اور لزبائی عشق کی ملک گیر اشاعت ایک معاشرتی مرض کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ اُن کے خیال میں امریکی مرد آزاد عورت سے خوف زدہ

---

[1] یہ عورتیں اپنے آپ کو RADICAL LESBIAN کہتی ہیں۔ ان کا نعرہ ہے GAY IS GOOD

[2] انہیں DOB کہتے ہیں۔ امریکہ میں یہ تنظیم ایک خاتون ڈیل مارٹن نے قائم کی تھی۔

[3] ، [4] WOMAN IN SEXIST SOCIETY.

ہیں اور روز بروز زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہم جنسیت سے رجوع لا رہے ہیں۔ معاشرے پر عورت حاوی ہوتی جا رہی ہے۔

آخر میں یہ دیکھنا ہے کہ ہم جنسیت اور لزبانی عشق کے اسباب کیا ہیں۔ ارباب نظر نے تین اسباب سے بحث کی ہے، عضویاتی، نفسیاتی، معاشرتی۔

کرافٹ ایبنگ، ڈاکٹر مال اور پروفیسر مانٹا گیزا کے خیال میں ہم جنسی میلان خلقی اور عضویاتی ہوتا ہے۔ بلاخ نے بھی اس رائے کی تائید کی ہے۔ اُس کے خیال میں بعض حالات میں جنین کے جنسی نظام میں ایسی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں کہ ہم جنسی میلان بچے کی سرشت میں نفوذ کر جاتا ہے۔ اس نظریے کے حامی ہارمون (یونانی زبان میں اس کا معنیٰ ہے 'حرکت دینا') سے بھی دلیل لاتے ہیں۔ پہلے پہل شائی ناخ نے ثابت کیا کہ خصیتین اور بیضہ انثیٰ ہارمون پیدا کرتے ہیں جو مردانگی اور نسوانیت کے ذمے دار ہیں اور جسمانی اور ذہنی توانائی پیدا کرتے ہیں۔ پچوٹری غدود کے ہارمون پر خصیتین اور بیضہ کی فعالیت منحصر ہے۔ ہر عورت کے جسم میں مردانہ ہارمون اور ہر مرد کے جسم میں زنانہ ہارمون موجود ہوتے ہیں خواہ وہ کتنی ہی قلیل تعداد میں ہوں۔ بعض حالات میں یہ خفتہ ہارمون زیادہ فعال ہو جاتے ہیں اور لڑکا لڑکی بن جاتا ہے یا لڑکی لڑکا بن جاتی ہے۔ لزبانی عورتوں کا جنسی نظام عام عورتوں سے مختلف ہوتا ہے اور اُن کے مردانہ عناصر عام عورتوں سے زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ان عورتوں کا قد لمبا تڑنگا، ٹانگیں اور بانہیں دُبلی پتلی، کہنیاں اور گھٹنے اُبھرے ہوئے، اوپر کے ہونٹ پر بال ہوتے ہیں، آواز کرخت ہوتی ہے۔ وہ مرد سے نفرت کرتی ہیں اور اُن کا بظر نمایاں طور پر بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ اُمردوں کے جسم کے زاویے گول اور گدرائے ہوئے ہوتے ہیں، چہرہ تر و تازہ ہوتا ہے، داڑھی مونچھوں کے بال کم ہوتے ہیں۔ کولہے بھاری بھرکم، کندھے گول اور سینہ بھرا بھرا ہوتا ہے۔ ان کی آواز باریک ہوتی ہے۔ جنین کے جنسی نظام میں خلل آجانے سے بعض اوقات بچے میں مردانہ زنانہ دونوں قسم کے آلاتِ تناسل موجود ہوتے ہیں۔ نارمل مرد

FOLLICULLIN   ANDROSTERON
HERMAPHRODITES

اور نارمل صورت کے ہارمون میں ایک خاص تناسب و توازن موجود ہوتا ہے۔

ہم جنسیّت کا سب سے موثر دفاع ایک جرمن عالم کارل ہائنرخ اُلرخس نے کیا تھا۔ اُلرخس ۱۸۲۵ء میں پیدا ہوا۔ وہ خود پیدائشی ہم جنسی تھا اور ہم جنسیّت کو فطری اور قانونی فعلیت منوانے کے لئے عمر بھر جدو جہد کرتا رہا۔ اس موضوع پر اُس نے کئی کتابیں تالیف کیں۔ وہ نارمل آدمی کو ڈیو ننگ اور ابنارمل کو اُرننگ کہتا ہے۔ موخر الذکر میں جو لوگ زنخے مردوں سے عشق کرتے ہیں۔ اُنہیں وہ مین لِنگ اور اُمردوں کو ویب لِنگ کے نام دیتا ہے۔ اُس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ہم جنسی میلان خلقی ہوتا ہے اور ہم جنسی عورتیں مرد ذہنی، ذوقی، روحانی اور اخلاقی لحاظ سے نہ صرف نارمل آدمیوں کے ہم پلّہ ہوتے ہیں بلکہ اُن پر برتری بھی رکھتے ہیں۔ اُن میں ذہانت، خلوص اور انسانی ہمدردی کے جذبات نمایاں طور پر موجود ہوتے ہیں اور وہ عام طور سے موسیقی اور شاعری کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ وہ خوشی اور غم سے شدید تاثر لیتے ہیں اور دوسروں کی بہ نسبت زیادہ مخلص اور پیار کرنے والے ہوتے ہیں۔ اُلرخس اور اُس کے ہم نواؤں کی کوششوں سے فی زمانہ ہم جنسوں سے نفرت کرنے کے بجائے اُن کے مسائل کو ہمدردی سے سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

معاشرتی سبب وہی ہے جسے رچرڈ برٹن نے ہم جنسیّت کا واحد سبب قرار دیا تھا اور جس کا ذکر گذشتہ اوراق میں ہو چکا ہے۔ اس کے خیال میں جہاں کہیں مردوں کو عورتوں کی صحبت میسّر نہ آسکے اور عورتیں مردوں سے الگ تھلگ رہیں وہاں ہم جنسی میلان اور لزبائی عشق کو پنپنے کے مواقع مل جاتے ہیں۔ کاسپر کے الفاظ میں یہ اکتسابی ہم جنسیّت ہوتی ہے اور اس کی تہ میں مجبوری کارفرما ہے جیسے کہ ایک فاقہ زدہ شخص نامرغوب شے بھی کھا لیتا ہے چنانچہ صنفِ مخالف کی صحبت کے میسّر آنے پر اس نوع کا ہم جنسی میلان بھی ختم ہو جاتا ہے۔

ہم جنسیّت کے نفسیاتی سبب سے بحث کرتے ہوئے بعض علمائے تحلیلِ نفسی کہتے ہیں کہ ہر شخص فطری طور پر دو جنسی ہے۔

دو جنسیت[1] کا انکشاف سب سے پہلے فلیس نے کیا تھا جس سے فرائڈ نے استفادہ کیا۔ اس کی رو سے ہر مرد کے نفس میں نسوانی اور ہر عورت میں مردانہ میلان موجود ہوتا ہے۔ بعض حالات میں ان مردانہ اور زنانہ عناصر کا توازن خلل پذیر ہو جاتا ہے جس سے مرد میں نسوانیت اور عورت میں مردانگی اُبھر آتی ہے۔ جن بچوں کی پرورش نامساعد حالات میں ہو اُن کا نفسیاتی توازن درہم برہم ہو جاتا ہے۔ فرائڈ کہتا ہے

"میں نے کسی بھی ایک مرد یا عورت کا تجزیہ نہیں کیا جس میں ہم جنسی میلان موجود نہ ہو۔"[2]

وہ کہتا ہے کہ ہم جنسی میلان کو دبا دیا جائے تو تشویش کی اُلجھن لاحق ہو جاتی ہے۔ ولہلم سٹیکل اور کلفورڈ ایلن کی تحقیق یہ ہے کہ ہم جنسیت خلقی نہیں ہوتی بلکہ نفسیاتی نظام میں خلل پیدا ہو جانے سے نمود پذیر ہوتی ہے۔ ہیولاک ایلس نے کہا کہ ہم جنسیت کسی بھی نفسیاتی مرض کی علامت نہیں ہے۔ اُس کے خیال میں کسی ہم جنسی کو ابنارمل کہنا زیادتی ہو گی۔ بعض مرد عورت سے مایوس ہو کر یا احساسِ کمتری کے تحت ہم جنسی بن جاتے ہیں۔ اُنہیں اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ عورت کی جنسی تشفی نہیں کر سکیں گے۔ بعض نوجوان لڑکیاں مرد کے خوف سے ہم جنسیت سے رجوع لاتی ہیں۔ سیمون دیلوا کہتی ہے[3]

"ہم جنسی عورتوں کا اختلاط بظر[4] کے مساحقے تک محدود ہوتا ہے۔ ایک نوجوان لڑکی مرد کی درشتی اور تند مزاجی سے خائف ہو کر اپنے آپ کو اپنی سے بڑی عمر کی عورت کے سپرد کر دیتی ہے۔ مردانہ قسم کی عورت میں اُسے اپنے والدین کی جھلک دکھائی دیتی ہے اس طرح نوجوان لڑکی حقیقی تجربے سے رو گردانی کر کے عالمِ خیال لبسا

---

[1] BI-SEXUALITY . [2] COLLECTED PAPERS VOL.VI

[3] THE SECOND SEX.

[4] CLITORIS یونانی زبان کا لفظ ہے اس کا معنیٰ ہے 'حجابل'۔ اسے زنبور بھی کہا جاتا ہے۔

یتی ہے۔ اس کے یہاں تخیل اور حقیقت آپس میں گڈ مڈ ہو جاتے ہیں۔"

ایڈلر اور اُس کے مقلدین کا نظریہ یہ ہے کہ اپنی کمتری کے احساس کی تلافی کے لئے بعض ہم جنس احساسِ برتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور جعلی فن کار اور لااُبالی قلندر بن بیٹھتے ہیں۔ اپنی اس نوع کی زندگی کے جواز میں وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ دُنیا کے عظیم شاعر اور فن کار سبھی ہم جنسی ہی تھے

مغرب میں ہم جنسیت کو خللِ ذہن کی علامت یا کجروی نہیں سمجھا جاتا نہ ایک ہم جنسی یا لزبائی کو مریض کہا جاتا ہے۔ یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ معاشرے کی نفرت اور تعدی ہم جنسوں کو شدید احساسِ گناہ میں مبتلا کر دیتی ہے جو اُنہیں ذہنی لحاظ سے ابنارمل بنا دیتا ہے۔ اگر معاشرہ ہم جنسوں کو رد نہ کرئے، اُن سے نفرت نہ کرئے تو وہ اپنے آپ کو صحت مند خیال کرنے لگیں گے۔ قانون کا خوف بھی ہم جنسوں میں احساسِ جرم پیدا کر دیتا ہے۔ علمائے جنسیات کے خیال میں ہم جنسوں کو بھرپور، بامسرت زندگی گذارنے کے مواقع بہم پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ معاشرے کے تعصبات کو دور کیا جائے اور قوانین میں مناسب ترمیم کر لی جائے۔ اطالیہ، فرانس اور برطانیہ میں ہم جنسی اختلاط کو قانوناً مباح کر دیا گیا ہے بشرطیکہ فریقین کی رضامندی مشمول ہو۔

ے BOHEMIAN

قحبگی

کہا جاتا ہے کہ قحبگی دُنیا کا قدیم ترین پیشہ ہے۔ سی، ای، ایم جوڈ لکھتا ہے [1]
"تاریخ تمدن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے لئے روزی کمانے
کا ایک ہی وسیلہ رہا ہے: اپنے جسم کا سودا کرنا۔ وہ اپنے جسم کو دو طریقوں
سے بیچ سکتی تھی۔ وہ اُسے غیر معیّنہ مدت کے لئے کسی ایک شخص کے ہاتھ بیچ
دیتی یا بہت سے مردوں کے ہاتھ مختصر سی معیّنہ مدت کے لئے بیچتی۔ پہلا طریقہ
شادی کہلاتا ہے، دوسرے کا نام قحبگی ہے۔"

علمائے تمدن قدیم ہمیں بتاتے ہیں کہ قحبگی مذہب کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ ابتدا میں بیاہتا عورتوں کی بہ نسبت کسبیوں کو زیادہ معزّز سمجھا جاتا تھا کیوں کہ وہ معبدوں میں مقدّس پروہتانیوں کے فرائض بھی انجام دیتی تھیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ زرعی انقلاب کے بعد مملکت کی داغ بیل ڈالی گئی اور اس کے ساتھ ہی مذہب کی تنظیم عمل میں آئی۔ اس دَور کے مذہب میں آسمان دیوتا، سورج دیوتا، اور دھرتی مائی کی پُوجا بڑے ذوق و شوق سے کی جاتی تھی۔ دھرتی مائی کی کوکھ سے فصلیں اُگتی تھیں، آسمان سے مینہ برستا تھا جو انہیں سیراب کرتا تھا اور سُورج ان فصلوں کو پکاتا تھا۔ لوگ ہل چلانے اور جنسی ملاپ کے عمل کو ایک جیسا ثمر آور خیال کرتے تھے اس سے یہ عقیدہ راسخ ہوا کہ دھرتی مائی کے معبد میں کثرت و تواتر سے جنسی ملاپ کیا جائے تو ارضی کی بار آوری اور زرخیزی کو تقویت ہوگی۔ فریزر نے کہا ہے کہ یہ مثبت جادو کی ایک صورت تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ فطرتی اعمال کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے لئے اُن سے ملتے جلتے

---

[1] THE FUTURE OF MORALS

عمل کئے جاتے تھے مثلاً بارش برسانا مقصود ہوتا تو زمین پر پانی انڈیلتے تھے چنانچہ دھرتی مائی کے معبدوں میں منتخب حسین لڑکیاں رکھی جاتی تھیں جن سے پجاری اور یاتری تمتع کرتے تھے اُمراء اور روسا بھی اپنی بیٹیاں اِن معبدوں کی بھینٹ کرتے تھے۔ ان مقدس کسبیوں یا دیوداسیوں کی تکریم کی جاتی اور مذہبی اور فصلانہ تہواروں پر انہیں اُمراء کی صف میں جگہ دی جاتی تھی مورخین کے خیال میں مقدس قحبگی کا آغاز سُمیریا کے شہر اَردک سے ہوا جہاں عشتار دیوی کے معبد میں مقدس کسبیاں رکھی جاتی تھیں۔ ان کی قیام گاہ کو جاجم کہتے تھے۔ ان کی نگرانی پر بڑی پروہتانی مامور تھی۔ بعد میں سُمیریا کی عشتار بابل اور اشوریا کی صنمیات میں بار پا گئی۔ شام کی عُشتاتی اور فنیقیہ کی عشتورت اسی سے یادگار تھیں۔ مصرِ قدیم میں آئسس، یونان میں افرودائتی، ایشیائے کوچک میں سائی بیلی اور روم میں وینس بار آوری، افزائش، حسن و شباب اور عشق و محبت کی دیویاں تھیں جو دھرتی مائی ہی کی مختلف صورتیں تھیں۔ ان کے معبدوں میں جنسی ملاپ کی عام اجازت تھی۔ دیویوں کے سالانہ تہواروں پر جو عام طور سے فصلیں بونے اور کاٹنے پر منائے جاتے تھے ہزاروں پجاری شرکت کرتے تھے۔ عورتیں مرد مل کر سازوں کی ولولہ انگیز گتوں پر دیوانہ وار ناچتے اور جنسی بے راہ روی کے مظاہرے کئے جاتے تھے۔ بابل میں عشتار کا عظیم الشان مندر تھا۔ اس کے وسیع و عریض صحن میں کدیشہ (مقدس کسبیاں) رنگ برنگ کے سراپردے لگا کر بیٹھتی تھیں۔ ان میں شراب و کباب بھی مہیا کئے جاتے تھے۔ ہیرو ڈوٹس لکھتا ہے۔

"بابلیوں کی ایک رسم بڑی شرمناک ہے۔ ہر جوان عورت کو اپنی عمر میں ایک مرتبہ زہرہ (عشتار) کے مندر میں جا کر کسی نہ کسی یاتری سے مقاربت کرنا پڑتی ہے۔ اُمراء کی عورتیں لونڈیوں کے جھرمٹ میں گاڑیوں میں بیٹھ کر آتی ہیں جن پر پردے پڑے ہوتے ہیں اور مندر میں بیٹھ جاتی ہیں۔ اکثر عورتیں مندر کے اندر اپنے سروں پر پھولوں کے ہار لپیٹ کر بیٹھتی ہیں ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا ہے اور آمد و رفت کثرت سے دکھائی دیتے ہیں۔ عورتوں کے درمیان رسیاں کھینچ کر نشان دہی کر دی جاتی ہے

اور یاتری وہاں جاکر اپنی پسند کی عورت چن لیتے ہیں۔ جو عورت ایک بار مندر میں آجائے وہ واپس نہیں جا سکتی جب تک کوئی اجنبی اُس کی طرف چاندی کا ایک سکّہ نہ پھینکے اور اُس کے ساتھ خلوت میں نہ جائے۔ جب وہ سکّہ پھینکتا ہے تو کہتا ہے "دیوی تجھے برکت دے" چاندی کا سکّہ خواہ کتنی ہی مالیت کا ہو عورت کو قبول کرنا پڑتا ہے کہ اِس سے انکار کرنا خلاف قانون ہے۔ جب یہ سکّہ پھینک دیا جائے تو مقدّس بن جاتا ہے۔ پہلا آدمی جو سکّہ پھینکتا ہے عورت اُس کے ساتھ خلوت میں چلی جاتی ہے اور انکار نہیں کرتی۔ اِس طرح دیوی مطمئن ہو جاتی ہے اور عورت فارغ ہو کر اپنے گھر چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد کسی قیمت پر بھی اُس سے معاشقہ نہیں کیا جا سکتا۔ کشیدہ قامت خوبرو عورتیں جلد فارغ ہو جاتی ہیں جب کہ بدصورت عورتوں کو خاصی مدت تک انتظار میں بیٹھنا پڑتا ہے۔"

یونان قدیم میں افرودائتی کے معبدوں میں مقدّس کسبیاں پجاریوں اور یاتریوں کے تصرف میں آتی تھیں۔ ہندوستان کے مندروں میں سیکڑوں دیوداسیاں رہتی تھیں جنہیں گانے بجانے اور ناچنے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ پنڈت اور پجاری اِن سے بلا تکلّف فیض یاب ہوتے تھے۔ دیوداسیاں دن میں دو بار مورتیوں کے سامنے گاتی ناچتی تھیں اور ناچتے وقت نہایت ہوس پرور انداز میں بھاؤ بتاتی تھیں۔ سوم ناتھ کے مندر میں پانچ سو دیوداسیاں موجود تھیں جو صبح و شام رقص و سرود کی محفل برپا کرتی تھیں۔ اس مندر کے ساتھ ہزاروں دیہات وقف تھے اور اس میں بڑے بڑے اُمراء اور راجے مہاراجے اپنی بیٹیاں بھینٹ کرتے تھے۔ بیورلی نکلس کے بقول جنوبی ہند میں سری رنگم اور ترچنا پلی کے مندروں میں آج بھی دیوداسیاں موجود ہیں۔ مقدس قحبگی کا یہ ادارہ جناب مسیح کے بعد بھی یونان میں باقی رہا حتیٰ کہ قیاصرہ بازنطین نے عیسائی مذہب قبول کیا اور اِن مندروں کو مسمار کرا دیا۔ مذہبی قحبگی کے استیصال کے بعد عصمت فروشی نے کاروباری صورت اختیار کر لی اور دوسری اجناس کی طرح عصمت و عفت بھی برسرِ بازار بکنے لگی۔ برٹرنڈرسل لکھتے ہیں۔

"عیسائیت کی اشاعت سے پہلے قحبگی مندروں تک محدود تھی جہاں اسے ایک مقدس پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ عیسائی برسرِ اقتدار آگئے تو اُنہوں نے مندروں کو منہدم کرا دیا اور اس ادارے کا خاتمہ کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عصمت فروشی معاشرے میں ہر کہیں نفوذ کر گئی اور اسے خرید و فروخت کی جنس بنا لیا گیا جس سے قحبہ خانوں کے مالک بے انتہا نفع کمانے لگے۔ ان منظّم قحبہ خانوں میں کسبی کی حیثیت محض ایک محنت کش کی تھی، نفع مالکوں کی جیب میں جاتا تھا۔ ہمارے زمانے کی آزاد کسبی کا وجود بعد میں ظاہر ہوا۔ ہندوستان میں ابھی تک مذہبی عصمت فروشی کا ادارہ پوری طرح ختم نہیں ہوا[1]۔"

جب حکمران طبقے نے دیکھا کہ عصمت فروشی ایک منفعت بخش کاروبار ہے تو اسے منظّم کر کے آمدنی کا وسیلہ بنا لیا گیا۔ سب سے پہلے سولن نے ایتھنز میں سرکاری قحبہ خانہ کھولا، اُس کے قواعد بنائے اور کسبیوں کو مختلف طبقات میں تقسیم کر کے ان کی خرچی مقرر کی۔ اہلِ یونان ادنیٰ درجے کی کسبیوں کو پورنائی کہتے تھے جو بندرگاہوں میں جہازرانوں کے لئے لطفِ صحبت کا سامان کرتی تھیں۔ ان کا محلّہ سب سے الگ تھلگ تھا۔ ان کے گھروں کے دروازوں پر دیوتا پرائے پس کا لنگ بطورِ نشان کے لٹکایا جاتا تھا۔ کسبیاں دروازوں میں نیم برہنہ بیٹھتی تھیں اس لئے اُنہیں جمنائی (لغوی معنیٰ ہے ننگا۔ جمناسٹک کا لفظ اسی سے مشتق ہے کیوں کہ جمناسٹک کرتے وقت کپڑے اُتار دیتے تھے) کہتے تھے۔ تماشبین اُن سے ایک دن، ایک ماہ یا ایک سال کا معاہدہ کر لیتے تھے۔ بعض اوقات چند شرائط پر دو یا تین مردوں کو ایک کسبی کرائے پر دے دی جاتی تھی۔ کسبیوں کے کمرے کی دیواروں پر نہایت فحش تصاویر بنائی جاتی تھیں جیسا کہ پومپیائی کے کھنڈروں سے پتہ چلتا ہے۔ پورنائی سے بلند تر طبقہ آل ٹرائڈز (بنسری بجانے والیاں) کا تھا جو جاپان کی گیشاؤں کی طرح ناچ گانے کا دھندا کرتی تھیں۔ ناچ کے بعد اُنہیں مہمانوں کی خلوت میں جانا پڑتا تھا۔ بوڑھی نائکاؤں نے انہیں ناچ گانے کی تعلیم دلانے کے لئے درس گاہیں کھول رکھی تھیں جہاں اُنہیں مردوں کا دل لبھانے اور اُنہیں رجھانے کے انداز و ناز سکھائے جاتے تھے۔ سب سے بلند طبقہ

---

[1] شادی اور اخلاق

ہیٹرا (لفظی معنی 'خاتون دوست') کا تھا جو عام طور سے شہری ہوتی تھیں اور اپنے گھروں میں دھندا کرتی تھیں۔ کوچہ گرد کسبیاں بھی تھیں جو اپنے جوتوں کے تلوں پر کھدوا لیتی تھیں "میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ" وہ راستہ چلتیں تو یہ الفاظ زمین پر کندہ ہو جاتے تھے اور تماشبین ان کے پیچھے ہو لیتے تھے۔

یونان قدیم میں عورتیں پردے میں رہتی تھیں اور مردوں کی مجالس میں شرکت نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کا کام گھر کے معاملات کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ اوائل عمر میں ہی گھر کے دھندے میں لگ جانے کے باعث وہ تعلیم سے محروم رہتی تھیں۔ ان کے برعکس ہیٹرا تعلیم یافتہ ہوتی تھیں اور علوم و فنون میں دسترس رکھتی تھیں۔ وہ علمی مباحثوں میں شرکت کرتیں اور اپنے استدلال سے بعض اوقات فلاسفہ کو بھی لاجواب کر دیتی تھیں۔ تاریخ میں اونچے پائے کی ہیٹرا کے حالات محفوظ ہیں۔ ایک دیوتیمہ تھی جسے سقراط اپنی استاد مانتا تھا، آرکے نیسا تھی جس سے افلاطون جی بہلاتا تھا، دنائی تھی جس نے ابیقورس کو حظ و مسرت کے رموز بتائے تھے، تھیورس تھی جو سوفوکلیز کے بڑھاپے کو گرماتی تھی، اسپاشیا تھی جو فلسفہ و ادب میں بصیرت رکھتی تھی اور جس کی ناز برداری میں پریکلیز سرگرم رہتا تھا، تھسٹونو تھی جس نے سیکڑوں نوجوانوں کو عشق بازی کے آداب سکھائے تھے، تھیعینیا تھی جو اپنی حسین بیٹی کے لئے ایک رات کے ایک ہزار درہم مانگتی تھی، کیلپ سڈرا[1] تھی جس کا یہ نام اس لئے پڑ گیا تھا کہ وہ بالو گھڑی سامنے رکھ کر اپنے سرپرستوں کو ٹھہراتی تھی۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں ایتھنز کی فرنی کے حسن و جمال کا شہرہ تھا۔ کورنتھ کی لیث کے حسن جہاں سوز کا دور دور تک چرچا تھا۔ اس کے ہم وطن اسے فاتح اعظم کہا کرتے تھے۔ سنگ تراش مائی من نے اپنے ایام پیری میں لیث کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ ایک مجسمے کی تراش کے دوران میں اس کے سامنے کھڑی ہوا کرے۔ لیث نے لباس اتارا تو مائی من باایں ریش سفید ہزار جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا اور اظہار مدعا کرنے لگا۔ لیث نے مسکرا کر کندھے جھٹکائے، کپڑے پہنے اور چلی گئی۔ مائی من کے سر پر عشق کا بھوت سوار تھا۔ اگلی

---

[1] لغوی معنی بالو گھڑی۔ مارس ڈیکوبرا کے بقول پیرس کی کسبی نے اپنے کمرے کی دیوار کے ساتھ میٹر لگا رکھا تھا جس کے مطابق وہ خرچی وصول کیا کرتی تھی۔ (پیرس میں اکیس راتیں)

صبح اُس نے حجامت بنوائی، خضاب لگایا، ارغوانی چغہ پہنا، طلائی کمربند کسا، گلے میں سونے کی زنجیریں آویزاں کیں، انگلیوں میں جڑاو انگوٹھیاں پہنیں، رخساروں پر غازہ لگایا، جسم اور لباس کو خوشبو میں بسایا اور لیث کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ دستک دینے پر لیث نمودار ہوئی تو مائی سن حرف مطلب زبان پر لایا۔ لیث نے ایک ہی نظر میں گذشتہ رات کے بڈھے کو پہچان لیا اور کہا "میرے دوست! کل یہی درخواست تمہارے باپ نے کی تھی اور میں نے ٹھکرا دی تھی"۔ اور کھٹ سے دروازہ بند کر دیا۔ لیث مر گئی تو اُس کے ہم وطنوں نے اُس کے مزار پر شاندار مقبرہ تعمیر کرایا۔ اہل یونان کسبیوں کو پیار سے بلبل، ابابیل، جگنو، گڑیا، شیرنی، چڑیا، مشعل، انجیر اور شہد کا چھتّہ کہا کرتے تھے۔ ایتھنز کے نوجوان تربیت کے لئے یا تو فلاسفہ کے پاس جاتے تھے اور یا کسبیوں کے یہاں بیٹھتے تھے۔ کسبیاں فلسفیوں کو اپنے حریف سمجھتی تھیں اور انہیں بُرا بھلا کہا کرتی تھیں۔ یونان کے ایک جرنیل تھمسٹوکلیز کو ایک عجیب شوق تھا۔ وہ بازار میں سے گذرتا تو گھوڑوں کی بجائے کسبیوں کو رتھ میں جوتا کرتا تھا۔ سکندر نے ایک کسبی تائیس کے اُکسانے پر ایرانیوں کا عظیم الشان شہر اصطخر آگ لگا کر خاکستر کر دیا تھا۔

روما میں قحبہ خانے کو لوپانار (لغوی معنی "بھیڑیے کا غار") کہتے تھے۔ یونانیوں کی طرح روما کے رئیس زادے بھی شائستگی کے آداب سیکھنے کے لئے کسبیوں کے ہاں جاتے تھے۔ شاعر اووڈ کہتا ہے کہ روما میں کسبیاں آسمان کے تاروں کی طرح بے شمار تھیں۔ لاؤڈیسیا کے شہر میں منڈی کا داروغہ ہر روز برسرِ عام اجنبیوں کے ہاتھ کسبیوں کی خرچی نیلام کیا کرتا تھا اور گاہکوں کو ایک ایک چھلّا دے دیتا تھا۔ رات کو چھاپہ مارتے تھے۔ کوئی شخص بغیر اس چھلّے کے کسی کسبی کے یہاں پکڑا جاتا تو اُسے سزا دیتے تھے۔ کسبیاں عموماً کنیزیں ہوتی تھیں جن سے اُن کے آقا پیشہ کراتے تھے۔ سرائے والے اور تنور والے بھی کسبیاں رکھتے تھے۔ حماموں اور قبرستانوں تک میں کسبیاں موجود رہتی تھیں۔ روما میں کسبیوں کو شریف عورتوں سے پہچاننے کے لئے مردانہ وضع کا چغہ پہننا پڑتا تھا۔ لوسیان رومی کی کتاب "رنڈیوں کی بات چیت" میں ایک عورت نے اپنی بیٹی

کوربائیلی کو ہدایات دی ہیں کہ نوجوانوں کو کس طرح دامِ فریب میں پھانسا جا سکتا ہے۔

ہندوستانِ قدیم میں عام کسبیوں کو رُوپا جیوا یا کلوٹا کہتے تھے۔ اِن میں اونچا طبقہ ویشیا اور نرتکی (گانے بجانے والیاں) کا تھا۔ پڑھی لکھی شائستہ کسبیوں کو گنیکا کہتے تھے۔ کوٹلیہ کے ارتھ شاستر میں ہدایت کی گئی ہے کہ راجے مہاراجے اپنے محلوں اور درباروں میں منتخب حسین کسبیاں رکھیں جو جلوس میں چھتر اٹھا کر چلیں، ناچ گا کر اُن کا دل بہلائیں، اُن کے جسم کی مالش کریں اور آرتی[2] اُتاریں۔ راجے دربار سے واپس محل میں آتے تھے تو کسبیاں انہیں نظرِ بد سے بچانے کے لئے آرتی اُتارتی تھیں۔ اُنہیں شاہی خزانے سے تنخواہ دی جاتی تھی اور اُن کی تعلیم و تربیت پر پنڈت مامور تھے۔ کوٹلیہ نے اُن کسبیوں کو جو اپنے گھروں میں پیشہ کراتی تھیں حکم دیا کہ وہ بے چون و چرا تماشبینوں کو خوش کریں۔ جس کسبی سے کوئی تماشبین ناراض ہو گا اُسے جرمانہ کیا جائے گا۔ ہر کسبی دن بھر کی کمائی (بھوگ) کا حساب سرکاری داروغہ کو دیتی تھی اور ہر ماہ اپنی ایک دن کی کمائی کا دُگنا بطور محصول حکومت کو ادا کرتی تھی۔ جو لوگ رنڈیوں کو ناچ گانا، دل لبھانے کا فن، اور سنگھار کے طریقے سکھاتے تھے انہیں سرکاری خزانے سے تنخواہ دی جاتی تھی۔ فن عشوہ فروشی پر دامودر گپت کا رسالہ نٹنی متم مشہور ہے جس میں ایک عمر رسیدہ نائکہ ایک نوچی کو ہدایات دیتی ہے۔ اس کا اندازِ بیان بڑا لطیف ہے۔[3]

"___ جس طرح سونے چاندی میں منڈھا ہوا ہیرا آنکھوں کو زیادہ اچھا لگتا ہے۔ اسی طرح عورت بھی اپنے پریتم کی باہوں کے گھیرے میں زیادہ بھلی دکھائی دیتی ہے۔"

"___ روپ جوانی جیون کا دھن ہے اور بسنت ساری رُتوں کی دولت، پر میرے پیارے،

---

[1] کسبی کو MERETRIX کہتے تھے جس کا لغوی معنیٰ ہے 'کمانے والی' لفظ 'کسبی' اس کا صحیح مترادف ہے۔

[2] آرتی بتیل کا کئی بتیوں کا چراغ ہوتا ہے جسے سر کے گرد پھراتے ہیں تاکہ نظرِ بد اثر نہ کر سکے۔ بعد میں وہ بھجن جو اس موقع پر گائے جاتے تھے آرتی کہلانے لگے۔

[3] ترجمہ میراجی۔

میرے من موہن سب سے بڑا دھن یہی ہے کہ کوئی پریم اور کامنا کے منزے اُٹھا
کر امرت کے دو گھونٹ پی لے اور امر ہو جائے۔"

"۔۔۔۔۔ پریم سے کوری جوانی کس کام، جوانی سے کورا پریم کس کام کا اور کامنا سے کورے
روکھے سوکھے پریم اور جوانی دونوں کس کام کے؟"

"۔۔۔۔۔ بچپن کا پھل آزادی ہے اور جوانی کا پھل موہ لوبھ میں ہے، بڑھاپے کا پھل آتما
کی شانتی میں ہے۔"

کام شاستر کا مصنف پنڈت واتسایان کہتا ہے کہ متموّل کسبیوں کا فرض ہے کہ وہ مندر تعمیر کرائیں، باغ لگوائیں، کنوئیں کھدوائیں اور برہمنوں کو گئودان دیں۔ چندر گپت موریہ کسبیوں سے جاسوسی کا کام لیتا تھا۔ ہندوستان میں بیوہ کو نکاح ثانی کی اجازت نہیں تھی اس لئے وہ بسا اوقات کسب معاش کے لئے عصمت فروشی کا دھندا کرتی تھیں۔ چنانچہ لفظ رنڈی کا معنیٰ بیوہ بھی ہے اور کسبی بھی۔ سنسکرت کی تمثیلوں میں اعلیٰ طبقے کی رنڈیوں کا ذکر آیا ہے۔ چتر لیکھا اور وسنت سینا اپنے حسن و جمال، ناز و ادا اور شوکت و تجمل کے لئے مشہور تھیں۔ شدرک نے اپنے ایک ناٹک مرچھ کٹک میں وسنت سینا کے مکان کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"اس مکان میں آٹھ مختلف درجے ہیں جن میں پتھروں کی پچی کاری کی گئی ہے اور نہایت قیمتی قالین بچھے ہوئے ہیں۔ دروازوں کی محرابوں پر سونے کے پتر چڑھے ہیں اور پُرتکلف رنگ آمیزی کی گئی ہے، زینے سنگ مرمر کے ہیں قیمتی پردے پڑے ہیں، ستونوں پر بلور کے کاسے اور ظروف رکھے ہیں۔ پردوں کی جھالروں میں موتی کی لڑیاں لگی ہوئی ہیں۔ جا بجا قمار بازی کی میزیں ہیں جن کے گرد اُجین کے اعلیٰ طبقے کے تماشبین بیٹھے ہیں، ارباب نشاط حاضر ہیں، گانے والے، ناچنے والے، بھانڈ صاحب خانہ کے اشارے کے منتظر ہیں، احاطہ کی دیوار پر دکانیں بنی ہیں جن میں عطّار، جوہری وغیرہ موجود ہیں، نوکر، طفیلی آپس میں باتیں کر رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں، مشک آلود پانی اور سپاری پیش کی جا رہی ہے اور شراب

کا دور چل رہا ہے، جا بجا حوض ہیں جن میں زعفرانی پانی بھرا ہے طلائی پنجروں میں
طوطے، مینا، بلبلیں چہچہا رہے ہیں۔ پائیں باغ میں ریشمی جھولے لٹک رہے ہیں۔"

امبا پالی وشالا کی مشہور کسبی تھی جس نے گوتم بدھ کو اپنے باغ میں ٹھہرایا تھا اور پھر یہ باغ اُسی کو بخش دیا تھا۔ مسلمان سیاحوں اور مورخین نے لکھا ہے کہ ہندو راجے کسبیوں پر جو محصول عائد کرتے تھے اُس کی رقم پولیس اور فوج پر خرچ کی جاتی تھی۔ عبدالرزاق سمرقندی جو وجیا نگر میں سفیر بن کر گیا تھا لکھتا ہے۔

"ٹکسال کے عین مقابل کوتوال شہر کا دفتر ہے جس کے ماتحت بارہ ہزار پولیس کے سپاہی ہیں۔ اُن کی تنخواہیں اُن کے محاصل سے ادا کی جاتی ہیں جو قحبہ خانوں پر لگائے جاتے ہیں۔"

ابو ریحان البیرونی نے کتاب الہند میں لکھا ہے کہ ہندو راجے کسبیوں کو اپنے شہروں کے لئے باعث زینت سمجھتے تھے اور انہیں رعایا کے لئے عیش و عشرت کا سامان خیال کرتے تھے۔ ان کسبیوں پر جو محصول لگایا جاتا تھا یا جو جرمانے کئے جاتے تھے اس کی رقم سے وہ اپنی فوج رکھتے تھے۔

دنیائے اسلام میں بردہ فروشوں کے گھر عصمت فروشی کے اڈّے بن گئے جہاں حسین کنیزیں امیرزادوں کو آدابِ معاشقہ سکھاتی تھیں۔ جب وہ ناز و ادا سے انہیں لبھالیتیں تو طرح طرح کی فرمائشیں کرکے انہیں کنگال کر دیتی تھیں۔ الف لیلہ و لیلہ میں ہارون الرشید اور ابوالحسن کی کہانی میں ایک بردہ فروش طاہر ابن الاعلےٰ کا ذکر آیا ہے جو کسی تماشبین کو اپنی کنیزوں کے پاس ایک رات ٹھہرنے کے دس دینار وصول کیا کرتا تھا۔ تاریخ اسلام میں سب سے پہلے عضد الدولہ دیلمی نے عصمت فروشی کو منظم کیا اور کسبیوں پر محصول لگایا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ کسبیاں نہ ہوں تو شوریدہ سر فوجی رعایا کی باعصمت عورتوں کے لئے وبال جان بن جاتے ہیں۔ علاءالدین خلجی نے جو چور بازاری اور گراں فروشی کا دشمن تھا 'جنسِ لطیف' کی خرید و فروخت کے لئے بھی قوانین وضع کئے۔ فرشتہ لکھتا ہے

لہ کتاب الہند، البیرونی

"سلطان علاء الدین خلجی نے بازار کی تمام اجناس واشیاء کے نرخ مقرر کئے۔ حکم عدولی کرنے والوں کو عبرت ناک سزائیں دی جاتی تھیں۔ ایک دن ایک درباری نے دست بستہ عرض کیا حضور نے سب سے زیادہ ہر دلعزیز اور مقبول جنس کو تو نظرانداز کردیا ہے۔ سلطان نے چیں بجبیں ہو کر پوچھا 'کون سی جنس؟'، درباری نے کہا حسن وشباب، سلطان سمجھ گیا اور مسکرانے لگا۔ اُس کی ہدایت کے مطابق تمام کسبیوں کو عمر اور حسن وجمال کے لحاظ سے مختلف گروہوں میں تقسیم کیا گیا اور اُن کی فرچی مقرر کر دی گئی، پھر فرمان جاری کیا کہ جو کسبیاں مقررہ شرح سے زیادہ رقم وصول کریں گی انہیں سخت سزا دی جائے گی۔"

فیروز شاہ تغلق نے انسدادِ قحبگی کا ارادہ ترک کرتے ہوئے کہا[1]

"میں نے زنانِ بازاری کا جو علانیہ فحش کرتی تھیں نکاح کرنے کا حکم دیا لیکن اراکین نے عرض کی کہ اگر ان کا نکاح کر دیا گیا تو اکثر شہری شادی شدہ عورتوں سے بدکاری میں مبتلا ہو جائیں گے لہٰذا میں نے سکوت اختیار کیا۔"

جلال الدین اکبر نے کسبیوں کی ایک خاص بستی بسائی جس کا نام شیطان پورہ رکھا۔ شیطان پورہ کا رُخ کرنے والوں کو اپنا نام اور پتہ لکھوانا پڑتا تھا۔ ازالۂ بکارت کے لئے بطورِ خاص سرکار سے اجازت لینا پڑتی تھی۔ کبھی کبھار اکبر کسبیوں کو بلا لیا کرتا اور اُن سے کرید کرید کر پوچھا کرتا کہ تمہاری دوشیزگی کس نے غارت کی تھی۔ وہ نام بتاتیں تو اُن مردوں کو خواہ وہ اُس کے درباری ہوتے سزا دیتا تھا۔

بیجاپور کے احوال میں اسد بیگ لکھتا ہے[2]۔

"بازار میں ایک طرف شراب فروشوں کی دکانیں تھیں اور دوسری طرف رنڈیاں ہار سنگھار کر کے بیٹھتی تھیں۔ اس بازار میں ہر وقت گھما گھمی رہتی تھی۔ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ شراب خانوں میں بیٹھ کر مزے سے پیتے تھے۔ ناچنے گانے والیوں کے

---

[1] فتوحاتِ فیروز شاہی [2] وقائع

کوٹھوں پر ہر وقت جمگھٹ رہتا تھا۔"

گولکنڈہ کے بارے میں تیورنیر کہتا ہے [1]

"گولکنڈہ کے مضافات اور قلعے میں جو بذاتِ خود ایک شہر ہے، ایک اندازے کے مطابق بیس ہزار سے زیادہ کسبیاں رہتی ہیں جن کے نام داروغہ کے رجسٹر میں درج ہیں۔ یہ پیشہ اختیار کرنے کے لئے اُنہیں رجسٹر میں نام لکھوانا پڑتا ہے۔ ان سے بادشاہ کوئی محصول نہیں لیتا البتہ ہر جمعہ کے دن ان میں سے بعض کو اپنی نائکہ اور سازندوں کے ساتھ شاہی جھروکے کے سامنے چوک میں حاضری دینا پڑتی ہے۔ بادشاہ جھروکے میں بیٹھا ہو تو وہ مُجرا کرتی ہیں، نہ ہو تو ایک خواجہ سرا اُنہیں واپس چلے جانے کا اشارہ کر دیتا ہے۔ شام کے وقت جب ہوا میں خنکی ہوتی ہے وہ اپنے مکانوں کے دروازوں میں بیٹھتی ہیں۔ یہ مکان جھونپڑے کی وضع کے ہوتے ہیں۔ رات کے وقت وہ اپنے دروازوں میں شمعیں یا دیئے روشن کر کے رکھتی ہیں جو گویا دعوت کا اشارہ ہوتا ہے۔ اسی وقت تاڑی کی دکانیں کھل جاتی ہیں۔ تاڑی ایک درخت کا مشروب ہے۔ ہر روز پانچ چھ سو گھوڑے تاڑی کی مشکوں سے لدے ہوئے شہر میں داخل ہوتے ہیں بادشاہ کو تاڑی کے محصول سے خاصی رقم وصول ہوتی ہے۔ اسی آمدنی کی خاطر اتنی بڑی تعداد میں کسبیوں کو پیشہ کرانے کی اجازت دی جاتی ہے۔ انہی کسبیوں کے باعث تاڑی کی کھپت ہوتی ہے۔ تاڑی بیچنے والوں نے اپنی دکانیں کسبیوں کی بستی کے قریب کھول رکھی ہیں۔ یہ عورتیں اسقدر سبک خرام اور چاق و چوبند ہوتی ہیں کہ جب شاہِ وقت نے مسولی پٹم جانے کا ارادہ کیا تو نو کسبیوں نے مل کر ہاتھی کی شکل بنائی۔ چار عورتیں پاؤں بنیں، چار نے جسم بنایا، ایک سونڈ بن گئی۔ ان کے اوپر ایک تخت بچھا دیا گیا۔ اس سواری پر بادشاہ سلامت شہر میں داخل ہوئے۔"

---

[1] سیاحتِ ہند، سفرنامۂ ہند

نواب وزیر شجاع الدولہ کسبیوں کی صحبت کا بڑا دلدادہ تھا۔ اُس کے زمانے میں دُور دُور سے کسبیاں لکھنؤ میں ہجوم کر آئیں۔ لکھنؤ کی کسبیاں تین ٹکڑیوں پر تقسیم تھیں ـــــ (۱) کنچنیاں پیشہ ور چند و کسبیاں تھیں جو ناچنے کی ماہر تھیں ـــــ (۲) چونہ والیاں ـــــ (۳) ناگرنیاں، اِن میں ہر قسم کی عورتیں تھیں۔ اُونچے درجے کی طوائفیں ڈیرہ دار کہلاتی تھیں۔ ان کے کوٹھوں پر نوچیوں کو ناچ گانے کے ساتھ ادب و شعر کی تعلیم بھی دلائی جاتی تھی۔ طوائفوں کے آداب کو سند کا درجہ دیا جاتا تھا اور یہ مشہور تھا کہ آدمی جب تک رنڈی کی صحبت میں نہ بیٹھے انسان نہیں بنتا۔ لکھنؤ کی ڈیرہ دار طوائف اور اُس کے مکان کی تصویر مرزا ہادی کے قلم سے ملاحظہ ہو۔ [1]

"خانم صاحب کو آپ نے دیکھا ہوگا۔ اُس زمانے میں ان کا سن قریب پچاس برس کے تھا۔ کیا شاندار بڑھیا تھی! رنگ تو سانولا تھا مگر ایسی بھاری بھرکم جامہ زیب عورت نہ دیکھی نہ سُنی۔ بالوں کے آگے کی لٹیں بالکل سفید تھیں، اُن کے چہرے پر بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ ململ کا دوپٹہ کیسا باریک چنا ہوا کہ شاید و باید، اودے کا مشروع کا پاجامہ، بڑے بڑے پائنچے، ہاتھوں میں موٹے موٹے سونے کے کڑے کلائیوں میں پھنسے ہوئے، کانوں میں سادی دو انتیاں لاکھ لاکھ بناؤ دیتی تھیں ...... مرزا رسوا صاحب! خانم کا مکان تو آپ کو یاد ہوگا کس قدر وسیع تھا، کتنے کمرے تھے۔ ان سب میں رنڈیاں ـــــ خانم کی نوچیاں ـــــ رہتی تھیں۔ بسم اللہ (خانم کی لڑکی) اور خورشید میری ہم سنیں تھیں۔ ان کی ابھی رنڈیوں میں گنتی نہ تھی۔ ان کے علاوہ دس بارہ ایسی تھیں جو الگ الگ کمروں میں رہتی تھیں ہر ایک کا عملہ جُدا تھا، ہر ایک کا دربار علیحدہ ہوتا تھا۔ ایک سے ایک خوبصورت تھی، سب گہنے پاتے سے آراستہ، ہر وقت بنی ٹھنی تولواں جوڑا پہنے۔ سادہ کپڑے جو ہم لوگ پہنتے تھے وہ اور رنڈیوں کو عید بقر عید میں بھی نصیب نہیں ہوتے۔ خانم کا مکان تھا کہ پرستان تھا۔ جس

---

[1] اُمراؤ جان ادا

کمرے میں بجز اُلکو سوائے ہنسی مذاق ، گانے بجانے کے کوئی اور چرچا نہ تھا.....
ایک دن خانم صاحب کے سامنے رام کلی گا رہی تھی دھیوت سُدھ لگا گئی ، اُستاد
جی نے نہ ٹوکا ، خانم صاحب نے پھر اُسے کہلوایا ، میں نے پھر اُسی طرح کہا ،
اُستاد جی باخبر نہ ہوئے ، خانم صاحب نے گھُور کر دیکھا ، میں اُستاد جی کا مُنہ دیکھنے
لگی ، اُنہوں نے سر جھُکا لیا ، پھر تو خانم صاحب نے اُنہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ "
خانم کے یہاں نوچیوں کو گانے بجانے ہی کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی پڑھنے کے لئے مکتب بھی تھا ،
مولوی صاحب نوکر تھے۔

یُونان کی ہٹیرا ، ہند کی نرتکی ، لکھنؤ کی ڈیرہ دار طوائف کی طرح جاپان میں گیشا کو بھی
معاشرے میں اہم مقام حاصل رہا ہے۔ گیشا کی تعلیم و تربیت پر کئی سال صرف ہوتے ہیں۔ اُسے
آدابِ مجلس ، مہمانوں کی پذیرائی ، اُن سے بات چیت کے سلیقے ، چائے دم کرنے اور پیش کرنے
کے طریقے اور ناچ گانے کی تعلیم دلائی جاتی ہے۔ جاپانی اپنی عورتوں کو رفیقۂ حیات نہیں سمجھتے محض
اپنے بچوں کی مائیں خیال کرتے ہیں اور لطفِ صحبت کے لئے گیشا کے ہاں جاتے ہیں۔ دوسری جنگِ
عظیم کے بعد امریکیوں کے قیام کے اثرات جاپانی معاشرے پر گہرے ہوئے ہیں لیکن جاپانیوں میں
ابھی تک گیشا میں بے پناہ کشش کا سامان موجود ہے۔ مصر میں گانے اور ناچنے والیوں کو غازیہ اور عالمہ
کہتے ہیں۔ یہ دراصل قدیم مصر کی اُن کسبیوں سے یادگار ہیں جن کے برہنہ ناچ کی تصویریں پرانی عمارتوں
کے در و دیوار پر دکھائی دیتی ہیں۔ عالمہ اور غازیہ بیلی ڈانسنگ کی ماہر ہوتی ہیں جو خالصتاً قدیم
مصری ناچ ہے۔ ناچتے وقت وہ اپنے سینے ، شکم اور سرینوں کو عجیب ہوس پرور طریقے سے حرکت
دیتی ہیں اور جوش میں آ کر اِس تیزی و تندی سے کولہے ہلاتی ہیں کہ تماشائی بے قرار ہو ہو جاتے
ہیں۔ آج کل بیروت اِس ناچ کا سب سے بڑا مرکز ہے جہاں خلیج فارس کے عرب شیوخ ناچنے
والیوں پر اپنی دولت لُٹاتے ہیں۔
لیسکی تاریخِ اخلاق یورپ میں لکھتا ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ کے بڑے بڑے شہر

قحبگی کے اڈے بن گئے تھے جہاں دن رات فسق و فجور کا بازار گرم رہتا تھا۔ پادری نہ صرف قحبہ خانوں کی سرپرستی کرتے تھے بلکہ بعض نے اپنے قحبہ خانے کھول رکھے تھے۔ نشاۃ الثانیہ کی صدیوں میں قدیم یونانی علوم کے ساتھ اہل یونان کی جنسی قدروں کا احیاء بھی عمل میں آیا اور کامل جنسی آزادی کا دور دورہ ہوگیا۔ یہ آزادی ۱۸ ویں صدی کے اواخر تک نقطۂ عروج کو پہنچ گئی۔ ۱۹ ویں صدی یا عہدِ وکٹوریہ میں اس جنسی بے راہ روی پر قابو پانے کی کوشش کی گئی لیکن صنعتی انقلاب نے جہاں زندگی اور معاشرے کے دوسرے شعبوں کو متاثر کیا وہاں قحبگی کے حلقۂ اثر و نفوذ کو بھی وسیع تر کردیا اور عصمت فروشی کی نئی نئی صورتیں سامنے آنے لگیں۔ عصمت فروشی کے کاروبار کو وسیع تجارتی بنیادوں پر نئے سرے سے مرتب کیا گیا چنانچہ آج مغرب کے شہروں میں قحبگی کو مہنگے داموں شمپین بیچنے کا وسیلہ بنالیا گیا ہے۔ نیویارک، پیرس، نیوادا ریلوی جنیرو، بیروت وغیرہ کے قحبہ خانے رسوائے دہر ہیں۔ سومرسٹ مام کہتا ہے کہ جنسی آسودگی کے لئے پیرس بہترین شہر ہے۔

"جب میں دیکھتا ہوں کہ میرا انسانی ہیجان میرے کام میں حارج ہو رہا ہے تو میں عورت کے پاس چلا جاتا ہوں جیسے قبض ہو جائے تو مَیں دوائی جاتی ہے۔"

بڑے بڑے ہوٹلوں اور قحبہ خانوں میں افیم کھانے والے منگول اور حبشی بیرے بطور 'کاسب'[1] کے موجود ہوتے ہیں۔ ان اداروں میں کوکین، ہیروئن، ایل ایس ڈی، چرس وغیرہ منشیات کی فروخت درپردہ جاری رہتی ہے۔ بعض عمر رسیدہ امیر عورتیں مستقلاً اپنے ساتھ ایک نوجوان کاسب[2] رکھتی ہیں۔ اسی طرح عیاش بڈھے نوخیز داشتاؤں[3] کو لئے لئے پھرتے ہیں۔ پیرس کو قدیم بابل کی طرح 'گناہ کا شہر' کہا جاتا ہے۔ یہاں کے لوگوں کے بقول کامیو دو ہی مشاغل ہیں، اخبار پڑھنا اور زنا کرنا۔ پیرس کے قحبہ خانوں میں جو شخص پہلی بار داخل ہوتا ہے۔ ہچک ہو کر رہ جاتا ہے۔ بیش قیمت ساز و سامان سے آراستہ کمروں میں حسین نیم برہنہ لڑکیاں صوفوں پر مچلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ موسیقی کی تانیں، شراب کا

---

[1] MALE PROSTITUTE [2] GIGOLO

[3] GIGOLETTE

سرور، خوشبو کی لپٹیں، اور شباب کی سرمستیاں الف لیلائی فضا پیدا کر دیتی ہیں۔ ان قحبہ خانوں میں ہر جسامت، ہر رنگ اور ہر قد و قامت کی کسبیاں موجود رہتی ہیں اور ہر ذوق، ہر ہوس، ہر کجروی کی تسکین کا سامان وافر موجود رہتا ہے۔ تماشبینوں کو مختلف آسنوں کے مصوّر کتابچے پیش کئے جاتے ہیں جن سے وہ انتخاب کرتے ہیں۔ ایک کسبی نے بتایا کہ اُن کے نوّے فی صد سرپرست جنسی کجرویوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور پچاس فی صد سدومی ہوتے ہیں۔ ایک کسبی نے کہا[1] "میں ان معزّز حضرات کو خوب جانتی ہوں جو خلوت میں درندوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔" سمون دو بوا نے صدیٔ رواں کے اوائل کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ ایک قحبہ خانے پر چھاپا مار کر دو خورد سال لڑکیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ایک کی عمر بارہ برس کی تھی اور دوسری کی تیرہ برس کی۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ ایک لڑکی نے بیان دیتے ہوئے ایک 'معزّز' شخص کا نام لینا چاہا تو جج نے اُسے جھڑک دیا اور کہا "ایک معزّز رئیس کے نام کو آلودہ مت کرو" چنانچہ رئیس کا وقار بحال رہا اور لڑکی کو ذلیل و خوار ہو کر قید خانے میں جانا پڑا۔ لندن، پیرس اور نیویارک کے بعض قحبہ خانے صرف کجرووں کے لئے مخصوص ہیں جہاں ایذا کوشی، ایذا پسندی وغیرہ کی تسکین کی جاتی ہے۔ قحبہ خانوں کے مالک ہمیشہ کسبیوں کو مقروض رکھتے ہیں تاکہ وہ اُن کے چنگل سے نجات نہ پا سکیں۔ شراب نوشی، کھیل تماشوں، قیمتی ملبوسات اور زیورات کی شیدائی ہونے کے باعث کسبیاں فضول خرچ ہوتی ہیں۔ اُنہیں اپنے مستقبل کا کوئی خیال نہیں ہوتا اور وہ اپنی ناک کے آگے نہیں دیکھ سکتیں۔ وہ لمحہ گذراں میں زندگی گذارتی ہیں۔ جرمنوں کی تنظیم ضرب المثل ہے۔ اُنہوں نے عصمت فروشی کے کاروبار کو بھی ایک منظّم ادارہ بنا دیا ہے۔ کسبیوں کے لئے خاص ہوسٹل[2] کھولے گئے ہیں جہاں وہ مل کر رہتی ہیں۔ بعض کسبیاں آزادانہ پیشہ کرتی ہیں اور بسا اوقات غنڈوں کے چنگل میں پھنس جاتی ہیں جو بسا اوقات اُن کے آشنا اور محبوب بھی ہوتے ہیں اور اُن کی کمائی پر گلچھڑے اُڑاتے ہیں۔ ادنےٰ درجے کی کوچہ

---

[1] THE SECOND SEX.

[2] DIRNENWOHNHEIME

گردکسبیاں راتوں کو گلی کوچوں میں چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں اور ایک آدھ شلنگ کے عوض رہگزروں کے ہوس ناکی کی تسکین کرتی ہیں۔ پولیس والے جو انسدادِ فحاشی پر مامور ہوتے ہیں کسبیوں کے بہترین دوست ہوتے ہیں اور جنس اور نقد کی صورت میں اُن سے نذرانے وصول کرتے رہتے ہیں۔ یورپ کی طرح جنوبی امریکہ کے ممالک میں بھی عصمت فروشی کا کاروبار بڑے وسیع پیمانے پر کیا جارہا ہے۔ امریکی فوجیوں نے جنوب مشرقی ایشیا کے شہروں کو بڑے بڑے قحبہ خانوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ تھائی لینڈ، جنوبی ویت نام، جنوبی کوریا، جاپان، تائیوان، ملایا اور فلپائن کے شہر فسق و فجور کے اڈے بن گئے ہیں جہاں امریکی اپنا طرزِ زندگی پھیلا رہے ہیں اور ایشیائیوں کے اخلاق و کردار کو تباہ کر کے انہیں اپنے رنگ میں رنگ رہے ہیں تاکہ اُن کا انقلابی جوش و خروش ختم ہو جائے اور وہ "آزاد دنیا" سے باہر نکلنے کا خیال ترک کر دیں۔

یورپ میں اعلیٰ طبقے کی کسبیاں کال گرل، ماڈل گرل، میزبان عورتیں کہلاتی ہیں۔ امریکہ میں بعض کال گرلز ہزاروں ڈالر ماہوار کما رہی ہیں۔ سیمون دلیوا کے خیال میں آج کل کی فلمی اداکارائیں یونانِ قدیم کی ہیٹرا کی جانشین ہیں۔ ان کے حُسن و جمال کا شہرہ ایسے اچھوتے اور نفسیاتی انداز میں کیا جاتا ہے کہ ان کی ذات کے گرد کششِ نامعلوم کا ہالہ بن جاتا ہے اور لوگ ان کی اداؤں پر بے تحاشا دولت لٹا دیتے ہیں۔ نازی جرمن میں نسل کشی کے نام پر قحبگی کا ایک عجیب و غریب ادارہ قائم کیا گیا تھا۔ ہٹلر کے ایما پر گسٹاپو کے اعلیٰ افسر ہملر نے مُلک کے متعدد شہروں میں "حرم" کھلوائے جہاں منتخب حسین اور صحت مند لڑکیاں رکھی گئیں۔ ان کے پاس ایسے نوجوانوں کو خلوت میں بھیجا جاتا تھا جو جسمانی لحاظ سے آریائی قد و قامت اور خد و خال کے مثالی نمونے سمجھے جاتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ ایک قوی تر آریائی نسل کو پروان چڑھایا جائے جو دُنیا کی راہنمائی کا فرض ادا کر سکے۔

قحبگی کے اسباب و عوامل کے بارے میں جنسیات اور نفسیات کے طلبہ میں اختلاف پایا جاتا ہے بالعموم تین اسباب زیرِ بحث آتے ہیں۔ نفسیاتی، عمرانی، معاشی

اطالیہ کے عالمِ نفسیات لومبروسو کے خیال میں کسبیاں خلقی طور پر جرائم پیشہ ہوتی ہیں اور انہیں خواہ کتنے ہی مساعد حالات میں رکھا جائے بالآخر وہ بازارِ حُسن ہی کا رُخ کرتی ہیں۔ سائرل برٹ کے بقول بعض عورتوں کی جنسی خواہش غیر معمولی طور پر تُند و تیز ہوتی ہے۔ انہیں بیاہتا زندگی راس نہیں آتی اور اُن کا آخری ٹھکانہ قحبہ خانہ ہی ہوتا ہے۔ یہ عورتیں اصلاح پذیر نہیں ہوتیں اور اُنہیں کسی قسم کی ترغیب و تحریص عصمت فروشی سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اُن کی مظلومیت کی کہانیاں[1] محض فریب ہوتی ہیں۔ وہ اپنی زندگی سے مطمئن ہوتی ہیں اور نکاح سے گریز کرتی ہیں۔

ڈاکٹر مال، مارٹی نو، کارلسٹر وغیرہ کے خیال میں اکثر کسبیاں چھپی ہوئی ہم جنسی ہوتی ہیں۔ اس نظریے پر صاد کرتے ہوئے فرینک الیس کاپریو کہتا ہے کہ میں نے مشرق و مغرب کے اکثر ممالک کا دورہ کیا اور وہاں کی کسبیوں سے ملا۔ مجھ پر یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ ہم جنسی کسبیاں دُنیا بھر کے ممالک میں پائی جاتی ہیں اور مردوں سے فارغ ہو کر آپس میں جنسی اختلاط کرتی ہیں۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ تماش بینوں کے ساتھ خلوت میں جا کر وہ حظ محسوس نہیں کرتیں محض اُنہیں خوش کرنے کے لئے محظوظ ہونے کا ڈھونگ رچاتی ہیں۔ دُنیا بھر کے ممالک کی سیاحت اور تحقیق سے مجھے معلوم ہوا کہ ہم جنسی عورتیں خاص طور سے عصمت فروشی کا دھندا کرتی ہیں۔ دوسری حقیقت جو مجھ پر منکشف ہوئی ہے کہ کسبیاں ایسے گھروں سے آتی ہیں جہاں میاں بیوی ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ اُنہیں ہر وقت آپس میں لڑتے جھگڑتے دیکھ کر اُن کی بیٹیوں کو شادی سے نفرت ہو جاتی ہے اور وہ کسبیاں بن کر خود مختاری کی زندگی گذارنا چاہتی ہیں۔ ہم جنسی نوع کی کسبیاں مردوں کے لئے انتہائی سرد مہر ہوتی ہیں لیکن مساحقے سے پوری طرح حظ اندوز ہوتی ہیں[2]۔ بعض عُلمائے نفسیات کے خیال میں سنگین قسم کی احمق اور غبی لڑکیاں جو خوبصورت، کام چور، قیمتی ملبوسات کی شیدائی اور پُرتکلّف کھانوں کی رسیا ہوں یہ پیشہ اختیار کر لیتی ہیں۔ مسز سبل وولف نے کہا ہے کہ کسبیوں کے پاس کثرت و تواتر سے جانے والے مرد بھی غبی، فہم و شعور سے عاری

---

[1] SOB STORIES

[2] VARIATIONS IN SEXUAL BEHAVIOUR

اور اخلاق کوڑھ، میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ قحبہ خانوں میں جنس اور عشق یا جنس اور جمالیاتی احساس کا ربط و تعلق مٹ جاتا ہے اس لئے سرد مہری کا جنسی ملاپ انہیں چوپایوں کی سطح سے بھی نیچے گرا دیتا ہے۔

عمرانی نقطۂ نظر سے عصمت فروشی کی یہ توجیہہ کی جاتی ہے کہ جو لڑکیاں ایسے گھرانوں میں پرورش پائیں جہاں انہیں بوجوہ ماں باپ کی شفقت اور بھرپور پیار میسر نہ آ سکے وہ نفسیاتی خلفشار میں مبتلا ہو جاتی ہیں جو غیر معمولی جنسی ہیجان کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے چنانچہ جوان ہونے پر جب کوئی نوجوان اُن سے اظہارِ محبت کرتا ہے تو وہ بے اختیار سپردگی پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ یہ لڑکیاں بسا اوقات اپنے عشاق کے ساتھ کسی بڑے شہر کو بھاگ جاتی ہیں جہاں اُن کا چاہنے والا انہیں کسی دلال یا نائکہ کے ہاتھ بیچ کر رفو چکر ہو جاتا ہے اور انہیں بامرِ مجبوری کسبی کا پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ چند سالوں کے بعد وہ بالعموم آتشک میں مبتلا ہو کر مرجاتی ہیں۔ ولکی کالنز نے اپنے ایک ناول[1] میں معاشرے کی ریا کاری کا پردہ چاک کیا ہے۔ ایک پادری ایک کسبی سے نکاح کر لیتا ہے۔ راز فاش ہونے پر معاشرہ انہیں رد کر دیتا ہے اور انہیں ترکِ وطن کرنا پڑتا ہے۔ اس ناول میں دکھایا گیا ہے کہ کوئی کسبی ہمارے معاشرے میں نکاح کر کے باعزت زندگی بسر نہیں کر سکتی اس لئے وہ نکاح سے گریز کرتی ہے۔ باڈلے بیڈ نے ایک کسبی[2] جے کا ذکر کیا ہے۔ جے کہتی ہے کہ مجھے سب سے زیادہ نفرت اُن مردوں سے ہے جو مجھ سے ہم کنار ہونے کے بعد میری زبوں حالی پر مجھ سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہیں۔ بعض اربابِ اصلاح کسبی کے وجود کو معاشرے کے حفظ و بقا کے لئے ضروری سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قحبہ خانے گندی نالیاں ہوتی ہیں جن سے شہر بھر کی غلاظت خارج ہو جاتی ہے۔ لنکن نے کہا تھا کہ تم کسی شخص کو گندی نالی میں دبوچ کر رکھنا چاہو تو تمہیں خود بھی اُس کے ساتھ گندی نالی میں رہنا پڑے گا۔ یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ عورت کو گندی نالی میں رکھنے

---

[1] NEW MAGDALEN

[2] STREET WALKER

پر اصرار کرنے والے مرد خود بھی گندی نالی کے کیڑے بن جاتے ہیں۔

جو معاشرہ طبقاتی تفریق پر مبنی ہو اُس کی نادار عورتیں امراء کی عورتوں کو رشک اور حسرت کی نگاہ سے دیکھتی رہتی ہیں اور ان جیسا سامان آرائش، قیمتی ملبوسات اور زیورات فراہم کرنے کے لئے بعض اوقات عصمت فروشی کا دھندا کرنے لگتی ہیں۔ ایسے معاشرے میں دوسری اجناس کی طرح عصمت و عفت کو بھی خریدا اور بیچا جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں عورت کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے حسن و شباب کا سودا کر کے اپنی جملہ ضروریات پوری کر سکتی ہے۔ پنجابی کی ایک کہاوت ہے "کولے اے گھنّاں تے بھکھیاں کی رہناں" وہ اپنی عصمت بیچ کر اپنی تمام حسرتیں اور آرزوئیں پوری کر لیتی ہے جو وہ عفیفہ کی حیثیت میں شاید کبھی بھی پوری نہ کر سکتی۔ اشتراکی دانشوروں کے خیال میں جس عورت کو بچپن سے لے کر معاشی تحفظ میسّر ہو وہ عصمت فروشی کی جانب مائل نہیں ہوگی۔ اشتراکی انقلاب کے وقت ماسکو میں پچیس ہزار اور شنگھائی میں تیس ہزار کسبیاں موجود تھیں۔ اشتراکیوں نے ان کسبیوں کی اصلاح کے لئے مستقل ادارے قائم کئے جنہیں 'اصلاح خانہ' کہتے تھے۔ ان میں کسبیوں کو کسب معاش کے ہنر سکھائے گئے۔ اس طرح چند ہی برسوں میں عصمت فروشی کا خاتمہ کر دیا گیا۔

اشتراکی معاشرے میں عورت کو عملاً مرد کے برابر حقوق دیئے گئے ہیں اور اُسے معاشرے کا ذمے دار فرد تسلیم کر لیا گیا ہے جسے ہر پہلو سے مرد کی ہمسری میسّر ہے۔ عورتیں کارخانوں، کھیتوں، درسگاہوں، شفاخانوں اور نظم و نسق کے جملہ شعبوں میں مردوں کے دوش بدوش کام کرتی ہیں۔ بامقصد اور مسلسل کام اُن کی زندگی میں معنویت پیدا کر دیتا ہے اور معاشی آسودگی اُنہیں جذباتی بحران سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس طرح اُن کے ذہن و قلب میں وہ اعتدال اور زندگی میں وہ توازن پیدا ہو جاتا ہے جس کے سبب وہ عصمت فروشی کا تصوّر بھی نہیں کر سکتیں۔ قحبگی دوسرے معاشرتی عوارض کی طرح استحصالی معاشرے کی پیداوار ہے جہاں کہیں استحصالی معاشرہ قائم ہے وہاں قحبگی باقی و برقرار رہے گی۔ اہل مغرب معاشی استحصال کو بھی قائم رکھنا چاہتے ہیں اور قحبگی جیسی معاشرتی برائیوں کا جو اس معاشی استحصال کا نتیجہ ہیں انسداد کرنے کے بھی متمنی ہیں گویا وہ شہتوت کے درخت سے سیب کا پھل لینا چاہتے ہیں۔

جنس اَور ادب و فن

تخلیقِ فن کے عمل سے بحث کرتے ہوئے فرائڈ نے اپنے ایک لیکچر میں کہا ہے کہ فن و ادب اُس خیال آرائی[1] سے جنم لیتا ہے جس میں فن کار اپنی محرومیوں کا مداوا تلاش کرتے ہیں۔ یوں تو روز خوابی[2] اور خیال آرائی کی صورت میں سبھی لوگ اپنی تشنہ آرزوؤں کی تلافی کر لیتے ہیں لیکن فن کار اور عام آدمی میں یہ فرق ہے کہ عام آدمی خیال آرائی اور روز خوابی ہی پر اکتفا کرتا ہے جب کہ فن کار اپنی تخلیقی صلاحیت کے طفیل خیال آرائی میں کھو کر نہیں رہ جاتا بلکہ مسرّت بخش آرٹ کی صورت میں ہمارے لئے اپنی خیال آرائیوں کو محفوظ بھی کر لیتا ہے۔ اپنے آرٹ کے باعث اُسے وہ شہرت، عزت اور حسین عورتوں کا پیار میسّر آجاتا ہے جس کے لئے وہ روزمرّہ کی زندگی میں ترستا رہتا ہے۔ فرائڈ نے آرٹ کو ایک قسم کا نشہ قرار دیا ہے جو لوگوں کو زندگی کے تلخ حقائق سے فرار کا سامان فراہم کرتا ہے۔ آلڈس ہکسلے فرائڈ کے اس نظریّے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے[3]

"اکثر و بیشتر قارئین کتابوں سے کردار مستعار لے کر اپنے آپ کو اُن پر منطبق کر لیتے ہیں لیکن وہ اِس عمل کو اُلٹ بھی دیتے ہیں اور اپنے آپ کو حقیقی زندگی سے بے تعلق کر کے ادبیات میں پناہ لیتے ہیں اور عالمِ خیال میں اپنی ناکامیوں کی تلافی کر لیتے ہیں۔ مقبولِ عام قِصّوں، تمثیلوں اور فِلموں کا ایک کام یہ بھی ہے کہ لوگ اپنی ناآسودہ اور تشنہ آرزوؤں کی تسکین اِن نفسیاتی منشیات و محرکات میں تلاش کرتے ہیں۔ اِس قسم کے ادبیات کا عادی نشہ کرنے والے عالمِ کیف میں زندگی کے پست ترین حقائق اور تلخیوں کو بھی قبول کر لیتے ہیں۔ لوگوں کے ذہن و قلب پر ادب کا تسلّط

---

[1] PHANTASY [2] DAY-DREAMING [3] OLIVE TREE

نہایت محکم ہے..... ادبیات میں زر و مال اور رئیسانہ ٹھاٹھ کی فراوانی دکھائی دیتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حقیقی زندگی ان چیزوں سے یکسر عاری ہوتی ہے قصہ نویس اور ان کے قارئین اپنے افلاس اور معاشرتی کم مائیگی کا مداوا عالم خیال میں تلاش کرتے ہیں اور اسے پا لیتے ہیں۔ افلاس اور بے وقری ہی سے قصہ نویسوں اور ان کے قارئین کے مسائل نہیں ہوتے۔ عام طور سے وہ حسن و جمال اور وجاہت سے بھی محروم ہوتے ہیں اور ان کی زندگیاں رومان سے عاری ہوتی ہیں۔ اگر وہ شادی شدہ ہوں تو ان کی خواہش ہوتی ہے کہ کاش ہم مجرد ہوتے مجرد ہیں تو شادی کے لئے ترستے رہتے ہیں۔ بوڑھے ہیں تو کھوئی ہوئی جوانی کے لئے آہیں بھرتے ہیں اور کم عمر ہیں تو شباب کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ مختصراً ان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ایسے کیوں ہیں جیسے کہ وہ ہیں، دوسروں کی طرح کیوں نہیں ہیں چنانچہ قصّے کہانیوں اور فلموں میں ہمیں ہرجائی عاشق، مست و بے خود حسینائیں، نوخیز معصوم دوشیزائیں، خوبصورت، بے رحم نوجوان اور نفس پرست مہم جو عورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ ہالی وڈ اور حسیناؤں کی منڈلیوں کے قبول عام کی تہ میں یہی چیز کار فرما ہے..... آج کل عوام کے لئے مذہب کی نسبت سینما زیادہ موثر افیون ثابت ہو رہا ہے۔"

علمائے جنسیات نے جنسی جبلت کو فنون لطیفہ کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ سٹینلے ہال اور ایلس کہتے ہیں[1]

"مذہب، آرٹ اور زندگی کے بہترین عناصر کی کشش کا راز جنسی جذبے کی ہمہ جہت کارفرمائی اور توسیع پر منحصر ہے۔"

معاشرۂ انسانی کی ابتداء سے شعراء، مغنی، مصوّر وغیرہ عشق و محبت کی ترجمانی کرتے رہے ہیں عشق جنسی جبلت کا زائیدہ ہے اس لئے آرٹ اور ادب بالواسطہ جنسی جبلت ہی سے سیراب ہوتے ہیں۔ رومانی اور کلاسیکی آرٹ کا فرق بیان کرتے ہوئے ول ڈیوراں نے لکھا ہے[2]

---

[1] PSYCHOLOGY OF SEX [2] MANSIONS OF PHILOSOPHY

"احیاء العلوم کی مقدس ترین تصویروں میں عہدِ بت پرستی کی نفس پروری نے نفوذ کیا۔ مریم عذرا کے نقوش میں حُسن کی دیوی وینس کے بدن کی گدراہٹ نمایاں ہے۔ وٹی جان کے مجسموں میں ادونس موجود ہے اور وٹی سباستین کے مجسمے عریاں نگاری کے واشگاف نمونے ہیں۔ جب احیاء العلوم کی تحریک رُوم سے وینس پہنچی تو قدیم بُت پرستی کے عناصر غالب آگئے۔ عشقِ حقیقی کی جگہ عشقِ مجازی نے لے لی، یوں لگا جیسے مذہبی آرٹ اپنی بقا کے لئے عشق کے دیوتا کا دستِ نگر ہے۔ جنسی جبلّت کی توانائی کا زمین دوز دریا فن کار کے تخلیقی جذبے کو سیراب کرتا ہے۔ بعض طبائع میں اِن دونوں کا تعلق جنس اور آرٹ کی فوری ترقی کا باعث ہوا۔ اس ربط و تعلق سے رومانی قسم کا غیر معمولی تخلیقی ذہن جنم لیتا ہے۔ سیفو، الگزنڈر، لکریشیس، بائرن، شیلی، کیٹس، سوئن برن، ہیوگو، روسو، ورلین، پیٹرارک، برونو، گیورگونی، شِلر، ہائنے، پو، شومان، شوبرٹ، شوپاں، سٹرنڈ برگ، آرتی باشف، اور چیکوفسکی: یہ وہ ٹائپ ہے جس میں تخیل تعقل پر غالب آجاتا ہے اور جس میں جنس اور آرٹ ایک ہی سرچشمے سے فیض یاب ہو کر فن کار کو نڈھال کر دیتے ہیں..... یہی لوگ ہیں جو شاعری، مصوّری، موسیقی اور فلسفۂ عشق کی تدوین و تخلیق کرتے ہیں۔ ہر عاشق اُنہیں عزیز رکھتا ہے لیکن دوسرے فن کاروں میں جنس کے اظہار کے آگے بند باندھ دیا جاتا ہے اور وہ کُلّی طور پر تخلیق ہی کی راہوں پر بہہ نکلتا ہے۔ عشق کا تصرّف ٹوٹ جاتا ہے، جذبے پر قابو پا لیا جاتا ہے، عقل و خرد پھولتی پھلتی ہے اور ہر چیز پر متصرّف ہو جاتی ہے۔ اس عظیم ارتقاء میں غیر معمولی کلاسیکی ذہن پیدا ہوتے ہیں۔ سُقراط، سوفوکلیز، ارسطو، ارشمیدس، سیزر، گلیلیو، گاسٹو، لیونارڈو، تیشیانو، بیکن، ملٹن، ہابس، باخ، کانٹ، گوئٹے، ہیگل، ترگنیف، فلابیر، رینان، اناطول فرانس، مائیکل انجلو،

بیتھوون، نپولین : ان میں ہر دو قسم کے غیر معمولی ذہنوں کا امتزاج عمل میں آیا اور فوق البشر اکائی کی صورت اختیار کر گیا۔"

تحلیلِ نفسی اور جنسیات کے طلبہ نے اِس امر کی جانب بار بار توجہ دلائی ہے کہ عظیم فن کار غیر معمولی جنسی توانائی کے مالک ہوتے ہیں اور اُن کا آرٹ تند و تیز جنسی ہیجان سے ذوقی فیضان حاصل کرتا ہے۔ ہم جنسیت اور تخلیقِ فن کے قریبی تعلق کو بھی معرضِ بحث میں لایا جاتا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ جن مردوں اور عورتوں میں ہم جنسی میلان خلقی طور پر موجود ہوتا ہے وہ ادبی ذوق اور تخلیقِ فن کی صلاحیت سے بدرجۂ اولےٰ بہرہ ور ہوتے ہیں۔ عظیم فن کاروں کے سوانحِ حیات کے مطالعے سے بھی اِس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ یا تو وہ غیر معمولی قوتِ رجولیت کے مالک تھے اور یا نمایاں ہم جنسی میلان رکھتے تھے۔ یونان کے نامور تمثیل نگار سوفوکلیز کی زندگی عشق بازی اور کامجوئی میں گذری، لزباس کی شاعرہ سیفو اپنی شاگرد لڑکیوں سے پُرجوش عشق کرتی تھی۔ اُس کی نظموں کے جو پارے ہم تک پہنچے ہیں وہ شاعری کے اعلےٰ نمونے ہیں، دراصل ہم جنسی تھا۔ اُس نے عمر بھر شادی نہیں کی اور امردوں سے جی بہلاتا رہا، احیاء العلوم کے دور کا عالم ایرازمس ہم جنسی تھا، اطالیہ کے معروف سنگ تراش لیونارڈو ڈا ونچی اور مائکل انجلو ہم جنسی تھے۔ مشہور مصور رفائیل جنسی عفریت تھا۔ اُس کی راتیں فسق و فجور میں کٹتی تھیں، نطشے نے کہا ہے
"جنسی نظام کی حدت کے بغیر رفائیل پیدا نہ ہو سکتا۔"

چیلینی کو جس کی خود نوشت سوانحِ حیات کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے سدومیت کے جرم میں قید کیا گیا۔ شیکسپیئر اور مارلو ہم جنسی تھے۔ شیکسپیئر نے اپنے محبوب لڑکوں سے ایک سو سے زائد سانیٹوں میں اظہارِ عشق کیا ہے۔ ہمارے ہاں شیخ سعدی اور میر تقی میر امرد پرست تھے۔ اِس ضمن میں گلستان کا باب پنجم قابلِ مطالعہ ہے۔ شیخ شیراز خوبصورت حمامی لونڈوں کو گھورنے کے لئے کئی کئی میل پیدل سفر کر کے جایا کرتے تھے۔ میر تقی میر کے دواوین میں دلّی کے لونڈے بھرے ہیں جن سے وہ نہایت بازاری انداز میں اظہارِ عشق کرتا ہے۔ گوئٹے غیر معمولی جنسی توانائی کا مالک تھا۔ اُس

نے بے شمار عورتوں سے عشق کیا۔ بڑھاپے میں ایک نوعمر حسینہ تبنیافان آرنم سے اُس کا معاشقہ ہوا۔ ونکل مان، والٹرپیٹر، فٹز جیرلڈ اور آسکر وائلڈ ہم جنسی تھے۔ آسکر وائلڈ پر سدومیت کا جرم ثابت ہوگیا اور قید کاٹنا پڑی۔ آندرے ژید خود اپنی سدومیت کا ذکر مزے لے لے کر کرتا ہے۔ وہ عمر بھر اُمردوں سے معاشقے کرتا رہا۔ عربی کا شاعر ابونواس ایک بدنام سدومی تھا۔ اُس نے آہو چشم اُمردوں کی تعریف میں پرُجوش قصائد لکھے تھے۔ جدرہ کا شاعر ملیاگر اُمرد پرست تھا۔ اپنی ایک نظم میں اُس نے سات حسین اُمردوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک کو سوسن کا نام دیا ہے۔ دوسروں کو سفید بنفشہ، گلاب، انگور، شگوفہ، سُنہرا زعفران اور سدابہار زیتون کی کلی کہا ہے۔ پٹرارک نے اپنی محبوبہ لارا کے فراق میں پرُجوش سانیٹ لکھے۔ وہ اُسے "تنھا شعلہ" کہا کرتا تھا۔ اُس کا شمار رومانیت کے اولین ترجمانوں میں ہوتا ہے۔ فرانسیسی شعرا ورلین اور راں بو کا آپس میں ہم جنسی معاشقہ تھا۔ ایک دن ورلین نے حسد کے مارے راں بو پر طپنچہ داغ دیا جس سے وہ زخمی ہوگیا اور ورلین کو دو سال کی قید سُنائی گئی۔ شعراء ایلن گنس برگ اور پیٹر اوسلو فسکی چودہ برس تک ہم جنسی رشتۂ ازدواج[1] میں منسلک رہے۔ وکٹر ہیوگو، دوماکبیر، موپاساں اور لیوٹالسٹائے جنسی عفریت تھے۔ وکٹر ہیوگو، بالزاک اور بائرن پر عورتیں پروانوں کی طرح گرتی تھیں۔ عورت کے لیے اُس مرد سے زیادہ پرُکشش کوئی ہستی نہیں ہوتی جو زندگی کے کسی شعبے میں ممتاز ہو اور غیر معمولی قوت رجولیت کی شہرت بھی رکھتا ہو۔ وکٹر ہیوگو اسّی برس کی عمر سے متجاوز ہوکر بھی جنسی ملاپ کرتا رہا۔ اُس کی موت ۲۲۔ مئی ۱۸۸۵ء کو ہوئی تھی۔ اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے کہ یکم جنوری ۱۸۸۵ء سے لے کر ۵۔ اپریل ۱۸۸۵ء تک اُس نے آٹھ بار جنسی ملاپ کیا تھا۔ گاتیئے کی بیٹی جیوڈتھ بوڑھے ہیوگو پر دل و جان سے فدا تھی۔ ڈوماکبیر ۶۶ برس کی عمر میں ایک نوعمر ایکٹرس آڈا سے فیض یاب ہوتا رہا۔ لیوٹالسٹائے عمر بھر اپنے طوفان پرور جنسی میلانات کے خلاف کشمکش کرتا رہا اور شکست پر شکست کھاتا رہا۔ وہ ستّر برس سے متجاوز تھا کہ ایک دن بیس میل گھوڑے پر سفر کرنے کے بعد رات کو اپنی بیوی کی خلوت میں گیا اور وہ اُس کی توانائی پر

---

[1] اصطلاح میں اِس نوع کے تعلق کو GAY-MARRIAGE کہتے ہیں۔

ششدر رہ گئی۔ موپاساں قحبہ خانوں میں جا کر ایک ہی تخلیے میں کئی کئی کسبیوں سے تمتع کیا کرتا تھا۔ آخر آتشک میں مبتلا ہو کر ناوقت موت مر گیا۔ بائرن جنسی پاجی تھا۔ وہ سولہ برس کا تھا جب اس کا معاشقہ اپنی بڑی بہن آگسٹا سے شروع ہوا۔ جسے وہ پیار سے 'بلیخ' کہا کرتا تھا۔ اطالیہ کے دوران قیام میں وہ فسق و فجور کی دلدل میں غرق رہا۔ فرانس کا مشہور مورخ اور تمثیل نگار والٹیر بڑھاپے میں اپنی بھانجی مادام دینی سے معاشقہ کرتا رہا۔ ناول نویس جارج ساں مرد شکن عورت تھی۔ وہ 'ہلاکت آفریں'[1] اور 'مردانہ عورت'[2] کا ایک اچھوتا نمونہ تھی۔ اس کا اصل نام آرور سے دودے واں تھا لیکن اس نے اپنا نام مردانہ رکھ لیا۔ وہ مردانہ لباس پہنتی تھی اور سگار پیا کرتی تھی۔ اس نے بے شمار معاشقے کیے۔ اس کے ہاں بچے بھی پیدا ہوئے لیکن اسے عمر بھر جنسی آسودگی میسّر نہ آ سکی۔ اس کا معاشقہ شاعر اور قصہ نویس دمسّے سے مشہور ہے۔ ایک دفعہ وہ اس کے ساتھ وینس کی سیر کو گئی جہاں دمسّے بیمار پڑ گیا۔ وہ شدید بخار میں تڑپ رہا تھا اور اس پر ہذیانی کیفیت طاری تھی کہ ڈاکٹر کو طلب کیا گیا۔ جارج ساں نے باتوں باتوں میں نوجوان ڈاکٹر کو ورغلا لیا اور ساتھ کے کمرے میں اس کے ساتھ خلوت میں چلی گئی۔ موسیقار شوپن سے دس برس تک اس کا معاشقہ رہا حتیٰ کہ شوپن کی صحت تباہ ہو گئی۔ اس کی موت کے بعد وہ ایک اور موسیقار فرانز لسٹ پر فریفتہ ہو گئی۔ وہ کہا کرتی تھی میرا جی چاہتا ہے کہ جب لسٹ زور زور سے پیانو بجا رہا ہو تو میں اس کے پیانو کے نیچے لیٹ جایا کروں۔ وہ کہتی تھی کہ حمل کی حالت میں اس کا ادبی تخلیق کا سرچشمہ خشک ہو جاتا تھا۔ اور وہ ایک لفظ نہیں لکھ سکتی تھی۔ بادلیئر بقول آلڈس ہکسلے "مسیحی ابلیس" تھا اور حبشی اور یہودی کسبیوں کی صحبت میں خوش رہتا تھا۔ آخر آتشک میں مبتلا ہو کر اس جہان فانی سے رخصت ہوا۔ مشہور مصور ون گوغ گھٹیا درجے کی ٹکھیوں کے پاس جایا کرتا تھا۔ ایک دن وہ ایک کسبی کے ساتھ خلوت میں گیا۔ کسبی نے خرچی طلب کی تو گوغ نے کہا میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ کسبی غضبناک ہو کر بولی اچھا تو اپنا کان کاٹ کر مجھے دیتے جاؤ۔ ون گوغ نے بلا تامل استرے

[1] FEMME FATALE
[2] PHALLIC WOMAN

سے اپنا کان کاٹا اور اُس کے سامنے پھینک دیا۔ اُس نے اپنی بہترین تصویریں پاگل خانے میں کھینچی تھیں۔ آخر ۳۷ برس کی عمر میں خودکشی کر لی۔ ان مثالوں سے یہ قاعدہ کلیہ تو نہیں بنایا جا سکتا کہ ہر عظیم فن کار نمایاں ہم جنسی میلان رکھتا ہے۔ متنبی، عمر خیام، فردوسی، غالب، اقبال، خواجہ غلام فرید، وارث شاہ، ملٹن، دانتے، سروانٹیز وغیرہ میں ہم جنسیت کا کوئی کھوج نہیں ملتا البتہ غیر معمولی جنسی توانائی اور تخلیق فن کے ربط باہم سے انکار کرنا مشکل ہے۔ جو فن کار اور ادبا جنسی لحاظ سے کوتاہ ہمت اور سرد مہر ہوں اُن کی فنی و ادبی تخلیقات بھی سوز و گداز سے عاری ہوتی ہیں مثلاً کہا جاتا ہے کہ کارلائل اور رسکن مرد نہیں تھے اس لئے اُن کی تحریریں بھی پھیکی سیٹھی ہیں۔

شاعری، تمثیل نگاری، موسیقی، مصوری اور بت تراشی میں جنسی محرکات و عوامل شروع سے کارفرما رہے ہیں۔ اقوام عالم کے عظیم شعراء نے جذبۂ عشق کی پُرجوش ترجمانی کی ہے اور جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں جذبۂ عشق جنسی جبلت ہی کا دست پروردہ ہے۔ جغرافیائی ماحول اور تمدنی روایات کے اختلاف کے باوجود شعراء نے یکساں جوش و خروش سے عشق و محبت کے گیت گائے ہیں۔ بلاشبہ ہر شخص اپنی مادری زبان کی عشقیہ شاعری ہی سے کماحقہ حظ اندوز ہو سکتا ہے لیکن یہ جذبۂ عشق کی ہمہ گیری کا اعجاز ہے کہ دوسری زبانوں کی عشقیہ نظموں کے ترجمے بھی اثر انگیز ہوتے ہیں۔ مثال کے طور غزل الغزلات، سیفو کی نظمیں، غلام فرید کی کافیاں اور میراں کے گیت جادو کا اثر کرتے ہیں کیونکہ قاری خواہ کسی ملک کا باشندہ ہو بہر صورت دل رکھتا ہے جو دھڑکتا ہے اور احساس رکھتا ہے جو مرتعش ہوتا ہے۔ شاعری کے علاوہ دُنیا کی بعض بہترین تمثیلوں، داستانوں اور قصوں کے موضوعات عشق و محبت کے مرہون منت ہیں۔ فردوسی کے شاہنامے میں زال اور رودابہ کا افسانہ، ایلیڈ میں پیرس اور ہیلن کا عشق، کالیداس کے ناٹک میں وکرم اور اروسی کا پیار، طربیۂ خداوندی میں دانتے کا بیاطریچے سے پاکیزہ عشق، فاوسٹ میں فاوسٹ اور گریچن کا رُومان، رومیو جولیٹ میں دو دشمن خانوادوں سے تعلق رکھنے والوں کا المناک پیار، ہیر میں ہیر اور رانجھا کا عشق بلا خیز، ٹالسٹائے کے "جنگ و امن" میں آندرے اور نتاشا کی محبت، ہیوگو کے "نوتر دام کا کبڑا" میں کواسیمڈو

کی خانہ بدوش لڑکی سے بے پناہ محبت وغیرہ ، پڑھنے والوں کو روح کی گہرائیوں تک متاثر کرتی ہے۔ ان کے مطالعے سے قارئین کے ذہن و قلب پر جمی ہوئی خود غرضی کی پھپھوندی دور ہو جاتی ہے اور وہ خود فراموشی اور بے نفسی کے جذبات سے سرشار ہو جاتے ہیں۔اس طرح ادب و فن میں جنسی جبلت مرتفع ہو کر عشق و محبت کی صورت میں انسان کے تزکیۂ نفس اور رفعتِ احساس کا سبب بن جاتی ہے۔

موسیقی اور رقص بھی جنسی جبلت کے اظہار کی صورتیں ہیں۔ سُریلے پرندے نر ہوتے ہیں جو اپنی دلکش آواز سے مادہ کو اپنی جانب ملتفت کرتے ہیں۔ سب سے سُریلا پرندہ بُلبل ہے جو مادہ بُلبل کو لُبھانے کے لئے گاتا ہے۔ دیہات کے لوک گیتوں سے لے کر پیچیدہ نغماتی تمثیلوں اور اور خیالوں میں جنسی جبلت کی تحریک کے مختلف مدارج کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ بیٹ ہوون، واگنر ، موتسارت ، فیاض خاں ، عبدالکریم خاں ، وغیرہ اُستادوں کے نغمات میں کومل سُر جنسی خواہش کی خفتگی اور بیداری کو ظاہر کرتے ہیں۔ آہستہ آہستہ بلند ہوتے ہوئے سُر عشق و محبت کی وارفتگی کی نشان دہی کرتے ہیں اور آخر نقطۂ عروج پر جا پہنچتے ہیں جو جنسی مواصلت کی از خود رفتگی کی علامت ہے۔ خیال کی گائیکی میں الاپ ابتدائی کشش اور دلوں میں اُبھرتے ہوئے پیار کی عکاسی کرتی ہے۔ ولمبت عشق کی گوناگوں کیفیات ، سوزِ ہجر اور حسرتِ دید کی آئینہ دار ہے، دُرت اور ترانے میں وصال کی والہانہ خود سپردگی کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ اقوامِ عالم کے ناچوں میں بھی جنسی ترغیبات اور عشقیہ واردات اپنی تمام لطافت اور رعنائی کے ساتھ منعکس ہو گئی ہیں۔ افریقہ کے قبائلی ناچ واضح طور پر جنسی مواصلت کو ظاہر کرتے ہیں۔ مہذب اقوام کے ناچوں میں والز ، کتھک ، بیلی ڈانسنگ ، ٹانگو ، ٹوسٹ ، راک اینڈ رول واضح طور پر جنسی ہیں۔ ہسپانیہ کے مشہور رقص خان دانگو میں ناچنے والے مرد عورت اپنے اعضاء کی حرکات سے عشق و محبت کی جملہ منازل کی ترجمانی کرتے ہیں۔ آخری مرحلے میں عورت کامل سپردگی کی تصویر بن جاتی ہے۔ یہ ناچ اس

لہ CRESCENDO

قدر نفس پرور ہے کہ ناچنے والوں کے ساتھ دیکھنے والوں کی ہوا و ہوس کو بھی بے پناہ اشتعال ملتا ہے۔ کسانوا اپنے سوانح میں لکھتا ہے

"فان دانگو ناچ نہایت ہوس پرور ہے اس میں ناچنے والے مرد اور عورت نہایت نفس پرور اشارے کرتے ہیں اور اس میں عشق کے آغاز سے لیکر وصل کی انتہا تک تمام مراحل کی ترجمانی کی جاتی ہے گویا یہ ناچ عشق کی مکمل تاریخ ہے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی بھی عورت اس ناچ میں حصّہ لینے کے بعد اپنے ساتھی سے انکار نہیں کر سکتی کیوں کہ ناچ کے دوران میں جنسی خواہش تیزی سے بھڑک اٹھتی ہے۔"

مشرق وسطیٰ کے عرب ممالک کا بیلی ڈانس واضح طور پر جنسی ہے۔ اس میں رقاصہ اپنے کولھوں[1] کو نہایت ہوس پرور انداز میں تیزی سے مٹکاتی ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حرکات کس بات کی غمازی کر رہی ہیں۔ مصر صعید کی ناچنے والیاں جنہیں عالمہ اور غازیہ کہتے ہیں بے تکلّفی کی محفلوں میں برہنہ بھی ناچتی ہیں۔ یہ ناچ قدیم مصر کے فراعنہ سے یادگار ہے۔ ہندوؤں کے ناچ کتھک میں محبت کی متنوع کیفیات اور جنسی خواہش کے آغاز و ارتقاء کو انگلیوں، ابروؤں، آنکھوں، بازوؤں اور کولھوں کی جُنبش و حرکت سے دکھایا جاتا ہے۔ ہیولاک ایلس لکھتے ہیں۔[2]

"وحوش اور پرندے ناچ کر جنسی جذبے کا اظہار کرتے ہیں۔ انسانوں میں بھی ناچ اس جذبے کی انگیخت کا باعث ہوتا ہے۔ وحشی قبائل سے لے کر آج کل کے مہذّب معاشرے تک میں مختلف قسموں کے ناچوں کا آغاز و ارتقاء جنسی جذبے کے اظہار و بیان سے وابستہ رہا ہے۔ والز کے ناچ میں ابتدائے عشق سے لے کر ملاعبت اور مواصلت تک کے جملہ مراحل کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ مرد عورت کے تعاقب میں جاتا ہے، وہ گریز کرتی ہے، پھر قریب آتی ہے، پھر دور ہٹ جاتی ہے، گریزاں بھی ہوتی ہے اور دعوت بھی دیتی ہے حتیٰ کہ جوش و

---

[1] PELVIC DANCE [2] PSYCHOLOGY OF SEX. VOL. III

خروش کا آخری مرحلہ آجاتا ہے جو مواصلت کے نقطۂ عروج کی نشان دہی کرتا
ہے۔ وحشیوں کے ناچ صاف صاف جنسی ہوتے ہیں۔ اُن کے اعضاء کی حرکات
وسکنات سے مواصلت کے عمل تک کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ "

شاعروں اور موسیقاروں کی طرح مصوّر بھی جنسی جبلت سے فیضان حاصل کرتے رہے ہیں حسین و جمیل عورتوں کے نقوش میں محبت کے جذبے اور جنسی ترغیب نے رنگ بھرا ہے۔ احیاء العلوم کے اطالوی مصوروں نے نہایت خوبصورت نسوانی پیکر تراشے ہیں۔ تشیانے، بوشے اور دیلا کرائے کی حسین برہنہ عورتوں کی تصویریں ہوا و ہوس کے اُبھار کا باعث نہیں ہوتیں بلکہ ذوقِ حُسن کی تربیت کرتی ہیں۔ اقوامِ عالم کے مصوّر صبحِ تاریخ سے حُسنِ نسوانی کے مُرقعے پیش کرتے رہے ہیں۔ اربابِ بصیرت کے خیال میں نسوانی حُسن و جمال سے قطعِ نظر کرکے حُسن و جمال کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا اور ظاہر ہے کہ حُسنِ نسوانی کا شعور و ادراک جنسی خواہش ہی کا مرہونِ منت ہے۔ جنسی خواہش کے فطری اظہار میں رکاوٹ پیدا ہو تو وہ مرتفع ہو کر فنونِ لطیفہ کی آبیاری کرتی ہے۔ ایلورا، اجنتا اور پومپیائی کے دیواری نقوش اس کی معروف مثالیں ہیں۔ اجنتا کے غاروں میں بودھ بھکشو تجرّد اور زاویہ نشینی کی زندگی گذارتے تھے اور بستیوں سے عمداً گریز کرتے تھے تاکہ عورت کی کشش سے محفوظ رہ سکیں لیکن جنسی جذبے کو کُچلا نہیں جا سکتا۔ اس لئے اُن کے دبائے ہوئے جنسی جذبے نے مرتفع ہو کر تخلیقِ فن کی صورت میں اظہار و بیان کی راہ تلاش کی اور وہ فراغت کے اوقات میں تصویر کشی سے دل بہلاتے رہے، ان نقوش میں ہندو عورت کے حُسن و جمال کے بے مثل نمونے ملتے ہیں۔ بعض نقوش میں ملاعبت اور اختلاط کے مناظر بھی دکھائے گئے ہیں۔ نیم برہنہ عورتوں کے گدرائے ہوئے بدن اور سانچے میں ڈھلے ہوئے اعضاء اپنے جنسی مآخذ کی طرف واضح اشارے کرتے ہیں۔

مصوّروں کی طرح سنگ تراش بھی مثالی حُسنِ نسوانی کے تعبیر و تشکیل میں کوشاں رہے ہیں۔ یونانِ قدیم کے سنگ تراشوں نے دُنیا بھر کے حسین ترین مجسمے پیش کئے ہیں۔ وینس دمائیلو

اُن کے کمالِ فن کی ایک خوبصورت یادگار ہے۔ احیاء العلوم کے دور کے سنگ تراشوں نے اِس یونانی روایت کا احیاء کیا۔ فلورنس، میلان، نیپلز وغیرہ کے نگار خانوں میں اُن کے شاہکار محفوظ ہیں۔ اُن کے تراشے ہوئے حسین عریاں نسوانی مجسمے رفعتِ احساس کا سامان وافر رکھتے ہیں۔ مائکل انجلو نے قدمائے یونان کی طرح مردانہ حسن کی ترجمانی کی۔ اُس کا مجسمہ داؤد اپالو کی یاد تازہ کرتا ہے۔ جنوبی ہند کے مندروں میں مستھن کا علامتی محرک خالصتاً جنسی ہے۔ اِس میں جنسی مواصلت کے مختلف پہلوؤں اور آسنوں کو بے محابا دکھایا گیا ہے۔ کونارک، کھجوراہو، بیلور وغیرہ کے مندروں کے در و دیوار پر اِس قسم کے نقوش کثرت سے تراشے گئے ہیں۔ بعض ناقدینِ فن انہیں جین سنگ تراشی کی روایت قرار دیتے ہیں لیکن ظاہراً مستھن کا علامتی محرک ماقبل آریائی دور کے دراوڑوں سے یادگار ہے جو لنگ اور یونی کی پوجا بڑے انہماک سے کرتے تھے۔ فنِ تعمیر میں بھی جنسیاتی عوامل کا کھوج ملتا ہے۔ ہندوستان میں آج بھی شوالے شولنگ کے نمونے پر تعمیر کئے جاتے ہیں۔

جنسیات کے طلبہ کہتے ہیں کہ مذہب اور ادب وفن میں ہر قسم کی کجرویاں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ ادعا شائبہ صداقت سے خالی نہیں ہے۔ بعض شاعروں، تمثیل نگاروں اور قصہ نویسوں نے جنسی غلامی، ایذا کوشی، ایذا طلبی، جنسی عفریتوں، مردافگن عورتوں، حیوانیت، ہم جنسیت، معاشقۂ محرمات، نرگسیت، زنانے مردوں، مردانہ عورتوں، نوخیزوں کے ساتھ بڑوں اور بڑوں کے ساتھ نوخیزوں کے معاشقوں سے موضوع لئے ہیں۔ یوری پیڈیز کی تمثیل 'ایلس' محرمات کے معاشقے پر مبنی ہے۔ شیکسپیئر کی تمثیل انٹنی کلیوپیٹرا کا مرکزی خیال جنسی غلامی ہے۔ انٹنی کوشش کے باوجود اپنے آپ کو کلیوپیٹرا کی جنسی غلامی سے آزاد نہیں کرا سکتا۔ وہ کہتا ہے "میں ایک کسبی کی آتشِ ہوس کو بھڑکانے کے لئے دھونکنی اور پنکھا بن کر نہیں رہوں گا۔" لیکن آخر تک وہ اِس غلامی کا جُوا اپنی گردن سے نہ اُتار سکا۔ ہیملٹ کی ماں اُس کے باپ کے قتل کے بعد اپنے دیور سے شادی کر لیتی ہے جسے ہیملٹ معاشقۂ محرمات کہہ کر سخت نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ سیفو

اور ابو نواس کی شاعری میں ہم جنسی عشق کی پُرجوش ترجمانی کی گئی ہے ۔ ۱۸ ویں صدی کے مشہور فرانسیسی قاموسی دیدیرو نے اپنے ناول 'راہبہ کی سرگذشت' میں عشق ہم جنسی کا اُستادانہ تجزیہ کیا ہے ۔ ایک حسین و جمیل لڑکی کو اُس کی مرضی کے خلاف راہبہ بنا دیا گیا ہے ۔ خانقاہ کی منتظمہ جو لزبائی ہے نووارد راہبہ پر فریفتہ ہو جاتی ہے اور مردوں کی طرح اُس سے اظہار مدعا کرتی ہے ۔ نوجوان راہبہ اعتراف سُننے والے پادری کو سب کچھ بتا دیتی ہے ۔ وہ اُسے منع کرتا ہے کہ منتظمہ کے پاس خلوت میں کبھی نہ جانا ۔ لڑکی اس حکم کی تعمیل کرتی ہے ۔ منتظمہ آشوب فراق کی تاب نہ لا کر پاگل ہو جاتی ہے اور آخر مر جاتی ہے ۔ لزبائی عشق[1] پر اس ناول کو کلاسیک کا درجہ حاصل ہے ۔ خلوت کے مناظر حقیقت نگاری کے دلآویز نمونے ہیں ۔ سوفوکلیز کی تمثیل فیڈرا اور رسین کی اسی نام کی تمثیل کا موضوع بھی عشق محرمات ہے ۔ لکھنو کی ریختی کی تہ میں زنانہ پن ہے جو اس معاشرے کی زوال پذیری کی علامت بھی ہے اور پیداوار بھی ہے ۔ سعادت یار خاں رنگین اور انشاء اللہ خاں اس کے مخترع تھے ۔ صاحبقران ، جان صاحب ، نازنین اور عصمت ریختی گو تھے ۔ عصمت لکھنوی زنانہ لباس پہن کر مشاعروں میں شرکت کرتا تھا ۔ لاطینی شاعر اووڈ کی نظم 'فن عشق بازی' میں ایک جنسی بابی کی جھلک دکھائی دیتی ہے ۔ قدیم داستانوں میں بھی ہر نوع کی کجرویاں دیکھنے میں آتی ہیں مثلاً الف لیلہ ولیلہ کی بصرہ کے عشاق کی داستان میں دو لزبائی عورتوں کا معاشقہ بیان کیا گیا ہے ۔ اسی کہانی میں ایک عورت ذات الدواجی مساقعے کی عادی ہے اور نوجوان لڑکیوں کو دام فریب میں پھانس لیتی ہے ۔ بائرن نے اپنی جنسی کجرویوں کی سرگذشت لکھی تھی جسے اُس کے دوست ہاب ہوس نے نذر آتش کر دیا ۔ بائرن کہتا ہے

"میں نے ہوس کے تمام سرچشمے خشک کر دیئے ہیں ، میں ہوں ایک بوڑھا جوان آدمی ۔"

---

[1] آج کل لزبائی عشق کو فلموں میں دکھایا جا رہا ہے مثلاً STAIRCASE ، THE FOX ، MIDNIGHT COWBOY .

ایک نقاد نے کہا ہے کہ ڈان یوان کی نظم ایک خبیث شیطان (بائرن) ہی لکھ سکتا تھا۔ بائرن کو ابلیسانہ شاعری کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ جے دیو کی گیتا گووندا میں کرشن کو ایک جنسی عفریت کی صورت میں پیش کیا گیا ہے جو بے پناہ قوتِ رجولیت کا مالک ہے اور ہر دم گوپیوں کے تعاقب میں بھاگتا پھرتا ہے۔ دانننزیو، کامیو، سارتر اور موریاک کے قصوں میں معاصر اہلِ مغرب کی عورت دشمنی، جنسی کلبیت اور نابکاری کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ مغرب میں ایذا کوشی اور جنس کے امتزاج سے فلموں کے موضوع لئے جاتے ہیں۔ ان میں خونخوار قاتل اور نیم برہنہ عورتیں دوش بدوش دکھائی دیتے ہیں۔ فلم سازوں کے خیال میں قتل و غارت کے مناظر اور بہتا ہوا خون دیکھ کر ناظرین جنسی حظ محسوس کرتے ہیں جس کی پرورش خوش گِل عورتوں کے گدرائے ہوئے سیمیں بدن کی نمائش سے کی جاتی ہے۔ برہنگی شبانہ مجالس تک محدود نہیں رہی بلکہ سکرین اور سٹیج پر بھی آگئی ہے لندن کے 'مرمیڈ' تھیٹر میں اوتھیلو کی تمثیل دکھائی گئی تو آخری منظر میں ڈیسڈے مونا کو بستر پر برہنہ دکھایا گیا تاکہ وہ اپنے بدن کی رعنائی سے اپنے غضبناک شوہر کو لبھا سکے۔

ازدواجی زندگی کے عُقدے معاشرۂ انسانی کے اہم مسائل میں شمار ہوتے ہیں۔ بہت ہی کم خوش نصیب میاں بیوی ایسے ہوں کے جنہیں بھرپور ازدواجی مسرت ارزانی ہوئی ہو اور جو کامل جسمانی، ذہنی اور ذوقی موافقت سے بہرہ یاب ہوئے ہوں۔ اکثر گھرانوں میں ازدواجی زندگی بڑے یا چھوٹے المیئے کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور میاں بیوی ایک دوسرے سے بے زاری اور بدمزگی کی زندگی گذارتے ہیں۔ مشاہیر تمثیل نگاروں اور قصّہ نویسوں نے ازدواجی زندگی کے اس پہلو کو موضوعِ سخن بنایا ہے اور اس کے المناک پہلوؤں کی طرف توجّہ دلائی ہے مثلاً لیوٹالسٹائے کے ناولوں آناکیرے نینا اور کرائسٹرز سوناٹا اور فلابئر کے ناول مادام بوواری کا موضوع یہی ہے۔ ان میں ازدواجی زندگی کے عذاب کا ذکر کیا گیا ہے۔ کرائٹرز سوناٹا کا مرکزی کردار پوزنی شیف حسد کے مارے اپنی بیوی کو قتل کر دیتا ہے۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

" ہماری حالت اُن مجرموں جیسی تھی جو کالے پانی کی سزا کاٹ رہے ہوں اور اس

قیدِ بامشقت میں انہیں ایک ہی زنجیر میں جکڑ دیا گیا ہو۔ ہم ایک دوسرے سے
نفرت کرتے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کی زندگی کو جہنم کا نمونہ بنا رکھا تھا لیکن
بظاہر ہماری کوشش یہی تھی کہ یہ عذاب ہماری آنکھوں سے اوجھل رہے۔ اُس وقت
مجھے اِس بات کا علم نہیں تھا کہ ننانوے فی صد لوگ اِسی جہنم میں عذاب بھگت
رہے ہیں۔"

یہ حالات تھے جب ایک موسیقار اُن کے گھر آیا اور اُس نے پیانو پر بیٹ ہوون کا نغمہ کرائٹزر سوناٹا بجایا۔ پوزنی شیف کی بیوی مسحور ہو گئی اور دل وجان سے اُس پر فریفتہ ہو گئی۔ ایک دن پوزنی شیف اچانک گھر آیا تو اُس نے دونوں کو اکٹھا دیکھا۔ اُس نے تاؤ کھا کر بیوی کو قتل کر دیا۔ یہ کہانی بڑی حد تک سوانحی ہے۔ لیو ٹالسٹائے کے اپنی بیوی سونیا سے آئے دن کے جھگڑے اذیت ناک صورت اختیار کر گئے تھے۔ اُن کے یہاں گیارہ برسوں میں آٹھ بچے پیدا ہوئے۔ سونیا نے ایک دن جل کر ٹالسٹائے سے کہا۔ "تم نے تو مجھے نسل کشی کی گھوڑی بنا رکھا ہے۔" ٹالسٹائے اپنی بیوی سے سخت متنفر تھا لیکن کوشش کے باوجود ضبط نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے۔

"میں ایک غلیظ شہوت پرست بُڈھا ہوں۔"

ان ایام میں ٹالسٹائے کا ایک عقیدت مند موسیقار پے نیف اُن کے یہاں آ کر ٹھہرا۔ سونیا اُس کے نغمے سُن کر اُس پر فریفتہ ہو گئی۔ ٹالسٹائے حسد کے مارے جل کر کباب ہو گیا اور کرائٹزر سوناٹا لکھ کر دل کی بھڑاس نکالی۔ جب یہ قصّہ شائع ہوا تو سونیا نے جز بُز ہو کر اپنے شوہر سے کہا کہ یہ کہانی لکھ کر تم نے میری رسوائی کا سامان کیا ہے۔ اواخرِ عمر میں ٹالسٹائے ازدواجی زندگی کو قانونی عصمت فروشی کہا کرتا تھا۔ اُس کے عظیم ناول آنا کیرے نینا کا موضوع بھی یہی ہے۔ آنا اپنے عمر رسیدہ شوہر سے بیزار ہے۔ اُس کی ملاقات ایک نوجوان فوجی افسر ورونسکی سے ہوتی ہے اور وہ اُس کی مردانہ وجاہت پر فریفتہ ہو جاتی ہے۔ شوہر کے طعن وطنز سے تنگ آ کر وہ اپنے محبوب کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد ورونسکی اُسے دھتا بتا دیتا ہے اور آنا مایوسی کے عالم میں ریل

کے انجن کے آگے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لیتی ہے۔ مادام بوواری میں بھی متاہل زندگی کے المناک پہلو کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مادام بوواری اپنے سیدھے سادے شوہر سے مطمئن نہیں ہے اور اُٹھتے بیٹھتے رُومانی تخیلات میں کھوئی رہتی ہے۔ آخر ایک اوباش اُسے اغوا کر لیتا ہے اور اُس سے فیض یاب ہو کر اُس قطع تعلق کر لیتا ہے۔

گاتیئے کے ناول میدموئیل ماپاں کی ہیروئن مردانہ لباس پہنتی ہے۔ وہ کہتی ہے تمام" مرد بدصورت ہوتے ہیں۔ میرا گھوڑا ان مردوں سے زیادہ خوبصورت ہے۔ مجھے اس کے چومنے سے اتنی کراہت محسوس نہیں ہوتی جتنی کہ مرد کے بوسے سے ہوتی ہے۔" فرانس کے شاعر پائرے لوئی نے ہم جنسی عشق پر پُرجوش نظمیں لکھیں تھیں جن کے مجموعے کا نام تھا " بلائٹس کے گیت[1] "۔ آج کل یورپ اور امریکہ میں 'بلائٹس کی بیٹیاں' کے نام سے عورتوں نے انجمنیں قائم کر رکھی ہیں جن میں آزادیٔ نسواں اور لزبائی عشق کے حق میں پرچار کیا جاتا ہے۔ امریکی شاعر والٹ وٹمین نے بھی ہم جنسی محبت کی تعریف کے گیت گائے ہیں۔ ۱۹۶۰ء سے پہلے جنسی ملاعبت و مواصلت کے مناظر نیلی فلموں تک محدود تھے، اب عام فلموں اور ناٹکوں میں دکھائے جاتے ہیں جس سے ہوسِ دید کی تسکین مقصود ہوتی ہے۔ 'لزبائن' اِسی نوع کی ایک فلم ہے اور 'اوہ کلکوتا' اِسی قِسم کا ایک ناٹک ہے۔ اِس میں مادر زاد برہنہ مرد عورتوں کو گروہی رقص کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ خودلذتی کی خیال آرائی[2] پر جین ژینے کا ناول 'پھُول والی خاتون' قابلِ ذکر ہے جو قید خانے میں لکھا گیا تھا۔ یاد رہے کہ دساد کے ناول بھی قید خانے ہی میں لکھے گئے تھے اور انہیں بھی اِسی خیال آرائی کی تخلیقات سمجھا جاتا ہے۔

آخر میں ہم فحش نگاری کا ذکر کریں گے جو ادبیات کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ فحش نگاری کی روایت قُدمائے یونان و روم سے یادگار ہے۔ یُونان قدیم میں فحاشی کی دیوی تھی جس کے سالانہ تہوار پر مرد عورتوں کا اور عورتیں مرد کا لباس پہنتی تھیں اور ہر قسم کے کجروی کے مظاہرے کئے جاتے تھے۔

---

[1] SONGS OF BILITIS [2] MASTURBATORY FANTASIES

ہومر نے ایلیڈ میں خداوند خدا زئیس اور اُس کی زوجہ ہیرا کی مُواصلت ساٹھ مصرعوں میں بیان کی ہے جو نہایت ہوس پرور ہے۔ وہ اوڈیسی میں لکھتا ہے کہ ایک دن دیوتا ہیفے سٹس نے اپنی زوجہ افرو ڈائٹی کو دیوتا ایریز کے ساتھ ناگفتہ بہ حالت میں دیکھا تو وہ تمام دیوتاؤں کو بُلا لایا اور اُنہیں یہ منظر دکھایا۔ ہومر نے اس منظر کی وصف نگاری میں خُوب خُوب پر پھیلائے ہیں۔ قدیم روم میں فحش نظمیں لکھی جاتی تھیں۔ جوان لڑکے لڑکیاں اُنہیں چھُپ چھُپ کر پڑھا کرتے تھے۔ ایک باقاعدہ تحریک کی صُورت میں فحش نگاری کا آغاز ۱۷ ویں صدی عیسوی میں ہوا اور ۱۸ ویں صدی میں فحش تحریریں تمام مغربی ممالک میں رواج پا گئیں۔ وکٹوریہ کے عہدِ حکومت میں فحش نگاری کے وہ تمام اسالیب مُعیّن ہو گئے جو آج تک باقی ہیں مثلاً سائنسی مقصد کے لیے جنسی فعل کا تفصیلی تذکرہ، علم الانسان اور تقابلی مذہب کے نام پر قدیم اقوام و مذاہب کی عجیب و غریب جنسی رُسوم کا ذکر، لوک بت کہاؤ اور لوک گیتوں کے حوالے سے فحش نگاری کرنا، شادی کے ہدایت نامے وغیرہ۔ ہنری سپنسر ایش بی نے اپنی تالیف انڈکس کی تین ضخیم جلدوں میں جُملہ فحش تحریروں کو جمع کر دیا۔ وہ کہتا ہے کہ کسی قوم کے فحش ادب میں اُس کے اخلاق کا عکس پڑتا ہے جیساکہ مثلاً میرابو، دساد، ترسیا، لے کلو وغیرہ کے قصوں میں ۱۸ ویں صدی کے فرانسیسی اُمراء کی فاسقانہ زندگی کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اِن مُصنفّین نے معاصر معاشرے ہی کی تصویر کشی کی ہے۔ ایش بی کہتا ہے کہ کسی عہد کے اخلاق محاسن کو بھی اُس زمانے کے معائب کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا۔ اُس کا یہ خیال محلِ نظر ہے کیوں کہ فحش قصوّں میں کسی معاشرے کی قدروں یا کسی فرد کے احوال کی حقیقی ترجمانی نہیں کی جاتی بلکہ وہ سراسر مریضانہ خیال آرائی پر مبنی ہوتے ہیں لہٰذا فحش قصوّں کا اِس خیال سے مطالعہ کرنا کہ اُن سے کسی معاشرے کی اخلاقی قدروں کا اِدراک ہو گا سعی بے مصرف ہو گی۔ فحش تحریروں میں زندگی کے تلخ حقائق سے گُریز کر کے ایک ایسے خیالی عالم میں پناہ لی جاتی ہے جس میں سوائے جنسی مواصلت کے کچھ بھی نہیں ہوتا اور یہ وہ عالم ہے جس میں مرد عورتیں ہمہ وقت ہمہ تن جنسی مُواصلت میں غرق رہتے ہیں۔ یہ خیالی عالم وہ لوگ بساتے ہیں جو جنسی محرومی اور کمزوری کے شکار ہوتے ہیں۔

اور اپنی واماندگی اور کوتاہ ہمتی کی تلافی شہوانی خیال آرائی سے کرتے ہیں۔ اس خیال آرائی میں شہوت رانی کی مجالس[1] برپا کی جاتی ہیں جن کی وصف نگاری واضح طور پر لکھنے والے کی جنسی فاقہ زدگی کی غمازی کرتی ہے۔ اس تفصیل نگاری میں اکتا دینے والی تکرار ہوتی ہے اور وہ سراسر میکانکی ہوتی ہے۔ پورنو ٹوپیا[2] میں تمام مرد غیر معمولی رجولیت کے مالک ہوتے ہیں اور تمام عورتیں دن رات جنسی ہیجان میں مبتلا ہوتی ہیں۔ اس میں عشق و محبت یا حسد و رقابت کا کوئی وجود نہیں ہوتا، کہانی کا اتار چڑھاؤ نہیں ہوتا، ڈرامائی صورت احوال نہیں ہوتی، جذبات کا تصادم نہیں ہوتا، فطری مناظر اور معاشرتی عقدوں سے اعتنا نہیں کیا جاتا۔ اس کے کردار میکانکی انداز میں جنسی مواصلت کئے جاتے ہیں اور اس سے کبھی سیر نہیں ہوتے۔ ایک مرد اور دوسرے مرد میں کچھ بھی فرق نہیں ہوتا، عورتیں بھی سبھی ایک جیسی ہوتی ہیں۔ غرضیکہ مرد عورتیں پلاسٹک کے کھلونے ہوتے ہیں اور کھلونوں ہی کی طرح ایک عمل کو بار بار دہراتے رہتے ہیں۔ فحش قصّے میں وقت کے گذرنے کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کا آغاز پہلے جنسی تجربے سے ہوتا ہے۔ جب تک آدمی زندہ رہتا ہے اُس کی رجولیت بحال رہتی ہے اور جب تک اُس کی جنسی توانائی برقرار رہتی ہے وہ زندہ رہتا ہے۔ فحش ناول کے کردار ہر عنوان سے ہر بہانے سے جنسی مواصلت پر کمر بستہ رہتے ہیں۔ اُن کا مذہب لِنگ اور یونی کی پرستش کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔[3] فحش ناول نگار عالم خیال میں اپنے آپ کو جنسی پہلوان تصوّر کر لیتے ہیں۔ راقم الحروف کو ایک نوجوان کی تحریریں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے جو جبری خود لذتی میں مبتلا تھا اور اپنی کم ہمتی اور احساس کہتری کی تلافی فحش نگاری سے کیا کرتا تھا۔ وہ ایک سوکھا سہما ہوا مریل سا لڑکا تھا لیکن اپنی تحریروں میں وہ ایک قوی ہیکل شہ زور جوان دکھائی دیتا ہے جس کے پیچھے عورتیں دیوانہ وار بھاگتی پھرتی ہیں۔

راقم الحروف کے خیال میں سچا ادب اور سچا فن فحش ہو ہی نہیں سکتا کیوں کہ وہ محض خیال

---

[1] ORGIES [2] PORNOTOPIA [3] THE OTHER

آرائی پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ اُس کا ذہنی اور ذوقی رشتہ روزمرّہ کی زندگی اور اُس کے مسائل سے بلا واسطہ استوار ہوتا ہے اور وہ زندگی ہی سے اپنے موضوع تلاش کرتا ہے۔ اِس کے ہاں جنسی جبلّت میں عشق و محبت کا پاکیزہ جذبہ مشمول ہوتا ہے اور عشق وہ کٹھالی ہے جس میں جنسی خواہش ذوقِ جمال کا زرِ خالص بن کر نکھر آتی ہے چنانچہ وہ تحریریں قطعی طور پر فحش ہیں جن میں جنسی مواصلت کا ذکر سرد مہری سے کیا جائے اور اُس کی وصف نگاری میکانکی بن کر رہ جائے۔ اِس نوع کی مواصلت انسان کو حیوان سے بھی پست تر کر دیتی ہے۔ فحش قصوں میں ایذا کوشی کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ فحش نگار ہمیشہ مرد ہی ہوتے ہیں اور کوتاہ ہمت مرد لازماً ایذا کوش ہوتا ہے۔ راقم کے مشاہدے میں ایسے کئی واقعات آئے ہیں کہ مرد نے خلوتِ صحیحہ میں اپنی کوتاہ ہمتی سے جھلا کر فریقِ ثانی کا گلا گھونٹ دیا یا اُسے گولی مار دی۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ کسی بھی عورت نے فحش ناول نہیں لکھے۔ اِس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ جنسی کوتاہ ہمتی کے شکار اکثر و بیشتر مرد ہی ہوتے ہیں۔

'فحش ادب' کی ترکیب مغالطہ آفرین ہے۔ فحش تحریروں پر ادب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ کسی فاترالعقل کی خیال آرائی کو حیطۂ تحریر میں لایا جائے تو وہ ادب نہیں کہلائے گی۔ اِس طرح ایک کوتاہ ہمت کی مریضانہ شہوانی خیال آرائی کو ادبیات میں شمار نہیں کیا جائے گا کیوں کہ ایک تو وہ روزمرّہ کی زندگی سے ذوقی فیضان حاصل نہیں کرتا، دوسرے جمالیاتی قدر کی ترجمانی سے قاصر رہتا ہے۔ فحش تحریریں پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انسانی زندگی کی کوئی اساس نہیں ہے۔ نہ اِس میں کسی نوع کی قدر یا معنویت پائی جاتی ہے۔ دساد کے ناول جسٹن کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ۱۸ ویں اور ۱۹ ویں صدیوں کے فحش نگاروں نے اِسی کو اپنے لئے نمونہ بنایا ہے۔ جسٹن ایک حسین دوشیزہ ہے جو ماں باپ کی وفات کے بعد بے یار و مددگار رہ جاتی ہے اور مصائب و آلام اُسے چاروں طرف گھیر لیتے ہیں۔ اُسے کچھ عرصے کے لئے ایک ڈاکٹر کے یہاں قیام کرنا پڑتا ہے۔ یہ ڈاکٹر ایک جنسی عفریت ہے جس کی بدعنوانیوں میں ایذا کوشی اور عشقِ محرّمات مشمول ہیں۔ جسٹن ڈاکٹر سے چھٹکارا پاتی ہے تو چند فاسق و فاجر راہبوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہے۔ خانقاہ کے دوران

قیام میں جو کچھ اُس پر گذرتی ہے وہ ہوسناکی اور ایذا کوشی کی بدترین مثال ہے۔ اِس قصے کے مطالعے سے دساد کی ابلیسیت کھل کر سامنے آجاتی ہے اور قاری کے پست ترین جذبات بھڑک اُٹھتے ہیں جب کہ سچا ادب و فن جذبات کی تنقیح کا باعث ہوتا ہے۔ اور انسان کے تعمیری اور مثبت میلانات کی پرورش کرتا ہے۔ جنوبی ہند کے مندروں کے دیواری نقوش اور آرٹینو کی کتاب کی رُسوائے زمانہ تصویریں بھی فحش ہیں۔ ہندو روحانیت کے حوالے سے ان کی توجیہ و تقدیس کرتے ہیں لیکن یہ محض جواز جوئی اور تاویل آرائی ہے۔

ڈاکٹر ایبر ہارڈ اور فلس کرون ہاسن نے فحش نگاری اور نفسیاتی حقیقت نگاری میں فرق کیا ہے۔ نفسیاتی حقیقت نگاری[1] کا مقصد معروضی اور غیر جذباتی انداز میں جنس سے متعلق حقائق کو کھول کر بیان کرنا ہوتا ہے جب کہ ایک فحش نگار کا مقصدِ واحد ہوس انگیزی ہوتا ہے۔ فحش قصوں اور نظموں کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو سراسر فحش ہیں اور دوسروں کے بعض مقامات کو فحش کہا جا سکتا ہے۔ سراسر فحش قصوں سے ہم طوالت کے خوف سے دو مثالیں دیں گے: 'ہوس پرست تُرک' اور 'ہندوستان میں زُہرہ'۔

'ہوس پرست تُرک' خطوط کی شکل میں ہے۔ ایک انگریز لڑکی ایمیلی بارلو کو بحری قزاق اغوا کر کے الجریا کے حاکم کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔ حاکم کے حرم میں جو کچھ ایمیلی پر گذرتی ہے وہ اُن واردات کو خطوط کی شکل میں اپنی سہیلی سلویا کیری کو لکھ بھیجتی ہے[2]۔ حرم کی دوسری لڑکیاں جو تُرک حاکم کی ہوس کا نشانہ بنتی ہیں، ایمیلی کو باری باری اپنی آپ بیتی سُناتی ہیں۔ قصے میں ہر عنوان سے تُرک حاکم کی جنسی فتوحات کا ذکر نہایت نفس پرور انداز میں کیا گیا ہے۔ ناول کا بیشتر حصہ اِسی قسم کی وصف نگاری پر مشتمل ہے۔ اس میں معاصر انگریزی یا الجزائری معاشرے کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ جنسی مواصلت کے مناظر ہیجان انگیز ہیں، اندازِ بیاں میکانکی اور

---

[1] EROTIC REALISM

[2] RAPE MURDER SACRIFICE

ٹھس ہیں۔

دوسرا ناول انگریزی فوج کے ایک افسر کی خودنوشت سوانح ہے جس میں اُس نے ہندوستان کے دوران قیام میں اپنی جنسی مہمات کا ذکر کیا ہے۔ مُصنّف کیپٹن ڈیور و فوجی خدمات انجام دینے کے لئے ہندوستان آتا ہے اور صوبہ سرحد کی جھڑپوں میں حصّہ لیتا ہے۔ اپنی رجمنٹ کے کیمپ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں وہ ایک سرائے میں ٹھہرتا ہے جہاں اُس کی ملاقات ایک حسین انگریز عورت سے ہوتی ہے۔ عورت اُسے اپنے کمرے میں بُلا لیتی ہے اور پھر جنسی مواصلت کی وصف نگاری کا وہی چکر چلتا ہے جس میں حقیقت کم اور خیال آرائی اور آرزو پروری زیادہ ہوتی ہے۔ ہر بار خلوت میں نئے نئے اسالیب اختراع کئے جاتے ہیں اور دونوں بے پناہ جنسی توانائی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد یہی کپتان اپنے میجر کی تین جوان کنواری لڑکیوں فینی، ایمی اور میبل سے اسی انداز میں تمتّع کرتا ہے۔ تینوں بہنیں یکے بعد دیگرے اُس پر فریفتہ ہو جاتی ہیں اور باری باری سپردگی پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ دوسرے فحش قصّوں کی طرح اس ناول کا مقصدِ واحد عالم خیال میں اُس جنسی لذت اور آسودگی کا حصول ہے جن سے مُصنّف اپنی حقیقی زندگی میں محروم رہا ہے۔ یہ نام نہاد خودنوشت سوانح عُمری سراسر دروغ و جعل ہے۔ اس میں ہندوستانی معاشرے کی جو جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں وہ محض چند الفاظ و تراکیب اور سُنی سنائی باتوں تک محدود ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف نے ہندوستان میں قدم تک نہیں رکھا۔

آج کل یورپ اور امریکہ کے شہروں میں فحش قصّے برملا فروخت ہوتے ہیں۔ جو عورتیں اور مرد بوجوہ جنسی آسودگی سے محروم رہتے ہیں اور اُس مُسرت کے لئے ترستے رہتے ہیں جو جنسی خواہش کی بھرپور تسکین ہی سے میسّر آسکتی ہے وہ فحش قصّوں کے مطالعے سے اپنی محرومیوں کی تلافی کر لیتے ہیں۔

مغرب میں فحش قصّوں، نیلی [illegible] ب در لباس اُتار[1] شبانہ مجالس کی مقبولیت اس حقیقت

---

[1] STRIP-TEASE

کی غمازی کرتی ہے کہ جنسی آزادی کے باوجود مغرب کے بے شمار عورتیں مرد بیزاری اور اُکتاہٹ کی زندگی گذار رہے ہیں اور اس کے مداوا کے لئے فحاشی اور عُریانی سے رجوع لانے پر مجبور ہیں۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ اشتراکی ممالک میں فحش نگاری کا کوئی کھوج نہیں ملتا۔ اشتراکی، معاشرے میں لوگ اس قدر مصروفیت کی زندگی گذارتے ہیں اور انہیں معاشی آسودگی کے ساتھ ساتھ جذباتی تشفی کے اتنے سامان میسّر ہیں کہ وہ مریضانہ خیال آرائی سے رجوع نہیں لاتے۔ جو شخص محنت مشقت کی صاف ستھری سیدھی سادی زندگی گذار رہا ہو اس کی جنسی جبلت میں بھی ہمواری اور اعتدال کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ اشتراکی معاشرے میں ذہنی و جذباتی آسودگی کے باعث شہوانی خیال آرائی بلکہ کسی قسم کی مریضانہ خیال آرائی یا ذہنی فرار کا کوئی عنوان ہی باقی نہیں رہتا۔

بردہ فروشی

بردہ فروشی نے افراد و اقوام عالم کی جنسی زندگی پر گہرے اثرات ثبت کئے ہیں۔ جیساکہ معلوم عوام ہے بردہ فروشی کا انسداد ۱۹ ویں صدی میں کیا گیا۔ اِس سے پہلے کم و بیش دس ہزار برسوں تک غُلاموں اور لونڈیوں کی خرید و فروخت کا بازار گرم رہا۔ شاہیت اور جاگیرداری کے زمانوں میں حکومت کی باگ ڈور مطلق العنان بادشاہوں اور اُن کے درباریوں کے ہاتھوں میں تھی جو بڑی بے رحمی سے عوام کا استحصال کرتے تھے اور اُن کے گاڑھے پسینے کی کمائی کو اپنی عیش و عشرت پر بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ حسین و جمیل لونڈیاں چُن چُن کر حرم سراؤں میں داخل کی جاتی تھیں اور اُنہیں اپنے آقاؤں کی ہوسناکی کی تسکین کرنا پڑتی تھی۔ نوخیز، خوش گِل غُلاموں سے ساقی گری کا کام لیا جاتا تھا اور ایرانی ذوق رکھنے والے اُمراء اُن سے متمتع ہوتے تھے چنانچہ جنسیات کے طلبہ بجا طور پر بردہ فروشی کو خصوصی مطالعے کا مستحق سمجھتے رہے ہیں۔ معاشرۂ انسانی پر بردہ فروشی کے جنسی اثرات کا ذکر کرنے سے پہلے ہمیں اوائل تمدن سے رجوع لانا ہوگا۔

بردہ فروشی کا آغاز زرعی انقلاب سے وابستہ ہے جب انسان نے عہدِ حجریہ کی شکار کی زندگی کو ترک کر کے کھیتی باڑی اختیار کی اور ذاتی املاک کا تصوّر معاشرۂ انسانی کا مرکز و محور قرار پایا۔ شروع شروع میں فاتحین جنگی قیدیوں کو تہ تیغ کر دیتے تھے، پھر اُنہیں دیوتاؤں کے مذابح پر قربان کرنے کا رواج ہوا اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ اُنہیں گائے بیل، بھیڑ بکری کی طرح ذاتی املاک میں شمار کرنے لگے۔ آقا کو اپنی دوسری املاک کے ساتھ غُلاموں اور لونڈیوں کو بیچنے کا حق بھی تھا۔ چنانچہ مصر، بابل، یونان، چین، اشوریا، ہند، فنیقیہ، روم، ایران اور اسرائیل میں بردہ فروشی رواج پا گئی۔ یونانی، رومی اور اسرائیلی اپنے ہم قوموں کو لونڈی غلام نہیں

بناتے تھے لیکن بابل اور چین میں اسے بھی جائز سمجھا جاتا تھا۔ ان اقوام میں باپ اپنی سرکش اولاد کو اور شوہر اپنی نافرمان بیوی کو لونڈی غلام بنا کر بیچ دیا کرتا تھا۔ چین اور اسرائیل میں قرضخواہ اپنی رقم کے وصول نہ ہونے پر مقروض اور اس کے بچوں کو غلام بنا لینے کا مجاز تھا۔ افریقہ، ہسپانیہ، گال، المنی، روس اور ایشیا سے غلاموں اور کنیزوں سے لدے ہوئے جہاز رومہ آتے تھے۔ بعض اوقات ایک دن میں سیکڑوں لونڈی غلام نیلام کیے جاتے تھے۔ اُس زمانے میں جنگ کا ایک مقصد ملک گیری کے علاوہ لونڈیوں اور غلاموں کی فراہمی بھی تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں دن رات غلاموں اور لونڈیوں کی خرید و فروخت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ سلاطین اور اُمراء اظہار تمول اور نفس پروری کے لئے لونڈیاں اور غلام خریدتے تھے اور ایک دوسرے کو تحفتہً بھی پیش کرتے تھے۔ جرجی زیدان لکھتا ہے۔

> "خسرو پرویز شاہِ ایران نے قیصرِ روم موریقس کے پاس سو غلام بھیجے جو ترکی کے شاہی خاندان سے تھے اور نہایت حسین تھے۔ ان کے کانوں میں سونے کی بالیاں تھیں اور بالیوں میں موتی پروئے ہوئے تھے۔ قیصرِ روم نے ان کے عوض دوسرے تحائف کے ساتھ بیس لونڈیاں بھیجیں جو سب کی سب برگنڈی، گیلکن وغیرہ شاہی خاندانوں کی لڑکیاں تھیں اور جن میں ہر کنیز کے سر پر طلائی تاج تھا۔"

غلام اور کنیزیں خراج میں بھی وصول کئے جاتے تھے۔ ہیرو ڈوٹس کہتا ہے کہ ہر سال کالچس کے باشندے ایک سو لڑکے اور ایک سو لڑکیاں بطور خراج شہنشاہ ایران کو بھیجتے تھے۔ ان میں سے بعض لڑکوں کو ہیجڑے بنا کر حرم کی خدمات پر مامور کیا جاتا تھا۔ ہیجڑوں کی تین قسمیں تھیں۔ (۱) صندلی: جس کا قضیب اور خصیتین دونوں قطع کر دیتے تھے[1]۔ (۲) جن کا صرف قضیب قطع کیا جاتا تھا۔ (۳) جن کے صرف خصیتین قطع کئے جاتے تھے[2]۔ اول الذکر سے معاشقے بھی کئے جاتے تھے انہیں

---

[1] CASTRATO — [2] THLIBIAS

[3] عربی میں ان تینوں قسموں کو مخنث کہا جاتا ہے۔

بردہ فروشوں سے خرید کر قحبہ خانوں میں بھی رکھا جاتا تھا۔ فیدوجس کے ساتھ سقراط کا مشہور مکالمہ منسوب ہے قحبہ خانے ہی سے خریدا گیا تھا۔ فنیقیوں کے شہر سدوم اور یونانی شہر کورنتھ میں امردوں اور ہیجڑوں کے بڑے بڑے قحبہ خانے موجود تھے۔

افلاطون اور ارسطو نے اپنے سیاسی اور عمرانی نظریات میں غلاموں کے حقوق سے اعتنا نہیں کیا نہ انہیں شہریوں میں شمار کیا ہے۔ ارسطو اپنی کتاب السیاست میں لکھتا ہے کہ غلاموں کا وجود کسی معاشرے کے استحکام اور بقا کے لئے ضروری ہے۔ رومہ میں غلام اور کنیز کو شہری تسلیم نہیں کیا جاتا تھا بلکہ انہیں ذاتی املاک میں شمار کرتے تھے۔ غلام اپنے آقا کی رضامندی کے بغیر شادی نہیں کر سکتا تھا۔ کنیز کے بطن سے جو بچے پیدا ہوتے خواہ وہ آزاد باپ کے صلب سے ہوں غلام ہی سمجھے جاتے تھے جس طرح ہندوؤں میں شودر عورت کے بچے خواہ وہ ایک برہمن کے صلب سے ہوں شودر ہی متصور ہوتے تھے۔ آقا کو اپنے غلاموں اور کنیزوں کے جسم و جان پر پورا پورا تصرف حاصل تھا اور وہ آقا کے ظلم کے خلاف عدالت سے رجوع نہیں لا سکتے تھے۔ معمولی لغزش پر لونڈیوں اور غلاموں کو دردناک عذاب دیئے جاتے تھے۔ رومہ کا قانون تھا کہ کوئی آقا اپنے کسی غلام کے ہاتھ سے مارا جاتا تو مقتول کے دوسرے غلام بھی بے دریغ جان سے مار دیئے جاتے تھے۔ ایک رومی رئیس سکینڈس کو اس کے ایک غلام نے قتل کر دیا قاتل کے ساتھ مقتول کے چار سو غلام موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ رومہ میں امرد پرستی یونان سے آئی تھی۔ نوخیز سادہ عذار غلام گراں بہا سمجھے جاتے تھے۔ ہمارے حساب کی رو سے ایک حسین لڑکا دس پندرہ ہزار روپے میں بکتا تھا۔ ایک دفعہ کیٹو کبیر نے جل کر کہا "ایک خوبصورت لونڈا سیر حاصل جاگیر سے زیادہ مہنگا بکتا ہے۔" جو غلام اراضی کی کاشت پر مامور تھے انہیں اراضی کے ساتھ ہی خریدا اور بیچا جاتا تھا۔ یونان اور رومہ کا معاشرہ غلامی کے ادارے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ جب غلاموں کی رسد ختم ہو گئی تو معاشرہ بھی منہدم ہو گیا۔

اسلام سے پہلے بردہ فروشی کا رواج عام تھا۔ مسعودی نے ایک بردہ فروش عبداللہ بن جدعان

کا ذکر کیا ہے۔ جو شخص غلام خریدتا تھا وہ اُس کے گلے میں رسّی ڈال کر اُسے کھینچتا ہوا اپنے گھر لے جاتا تھا گویا وہ انسان نہیں اُونٹ گھوڑا ہے۔ عرب اپنی لونڈیوں سے نکاح بھی کر لیتے تھے لیکن اُن کی اولاد کو غلام ہی سمجھا جاتا تھا۔ بعض حالات میں باپ اِس قسم کے بیٹوں کو متبنیٰ بنا کر آزاد کر دیتا تھا۔ عرب کے مشہور شہسوار اور شاعر عنترہ بن شدّاد کو اِسی طرح آزادی ملی تھی۔ اسلام میں کنیزوں کو مِلکِ یمین کہا گیا ہے۔ شیخین کے زمانے میں جب ایران اور روم کی فتوحات کے سلسلے میں لاکھوں رُومی اور ایرانی عورتیں مرد گرفتار کر کے لائے گئے تو حجاز میں ہر کہیں لونڈیوں اور غلاموں کی ریل پیل ہو گئی۔ فاتحین نے چار منکوحہ بیویوں کے علاوہ بیسیوں کنیزیں حرم میں داخل کر لیں۔ ان کنیزوں کے بطن سے جو اولاد ہوتی تھی اِسے ہجین یا دوغلے کہتے تھے۔ ایک ایک شخص کے گھر میں سیکڑوں بچے پیدا ہوئے۔ عبدالرحمن بن الحکم نے پچاس بیٹیاں اور ایک سو پچاس بیٹے چھوڑے۔ تمیم بن المعز کے ایک سو پچاس بیٹے اور پچاس سے زیادہ بیٹیاں تھیں۔ عمرو بن الولید کے نوّے بیٹے تھے جن میں ساٹھ شہسوار تھے اور باپ کے جلو میں نکلتے تھے۔ شرر لکھنوی نے بڑی سنجیدگی سے اِس خیال کا اظہار کیا ہے کہ کثرتِ ازدواج اور کنیز داری نے عربوں میں اولوالعزمی پیدا کی تھی۔ فرماتے ہیں[1]

"عرب کی سوسائٹی میں یہ کوئی معیوب بات نہ تھی۔ صُوفیوں کی وضع کا اِتقا بعد میں آیا ہے۔ تمام معززینِ اسلام مرد نکاح کرنے، حسین عورتوں کو پیغام دینے اور خوبصورت لونڈیاں رکھنے میں کسی قسم کا عیب خیال نہیں کرتے تھے۔ یہی عرب کی سادہ زندگی تھی اور یہی وہ زندگی تھی جس نے عربوں میں اولوالعزمی پیدا کی۔"

بنو اُمیّہ کے زمانے میں مدینۃ النبی ناچ گانے کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ شہر میں ہر کہیں بیوت القیان (گانے والی کنیزوں کے گھر) دکھائی دیتے تھے جہاں لوگ گانا سننے اور ناچ دیکھنے جاتے تھے۔[2] بنو عبّاس کے دورِ حکومت میں بھی کنیزوں کو ناچ گانے کی تربیت دلانے کے لئے مدینہ بھیجا جاتا تھا۔

---

[1] مضامینِ شرر [2] کتاب الاغانی

بغداد میں گانے بجانے والیوں کے گھروں کو دار لقربات کہتے تھے۔ بنو اُمیہ اور بنو عباس کے زمانوں میں رُوم اور ایران کے علاوہ ترکستان، جارجیا (گرجستان)، سرکاشیا (چرکس)، مصر، سوڈان، بربر، حبشہ، صقلیہ اور ہسپانیہ عربوں کی مملکت میں شامل ہو گئے اور مفتوح عوام کی لاکھوں لونڈیاں دمشق، بغداد، سامرہ، حلب، موصل، بصرہ اور کوفہ کے بازاروں میں فروخت کے لئے آنے لگیں۔ نیوبا کی بہترین کنیز جسے بڑی چاہت سے خریدا جاتا تھا، تین سو دینار میں آتی تھیں۔ سفید فام کنیزیں بیش قیمت سمجھی جاتی تھیں۔ ایک سفید فام کنیز کی قیمت ایک ہزار دینار سے کم نہ ہوتی تھی۔ خوارزمی کو ایک دفعہ ایک کنیز کے دس ہزار دینار پیش کئے گئے تھے۔ سفید فام غلاموں کو ممالیک (جمع مملوک کی ہے) کہتے تھے۔ ان میں اکثریت ترکی، ارمنی، سلاوی اور چرکسی غلاموں کی ہوتی تھی۔ سادہ عذار خوبصورت لڑکے کو غلمان کہتے تھے۔ ان سے اظہارِ عشق کرنا آدابِ معاشرہ میں داخل تھا۔ مجالس ناؤ و نوش میں ساقی گری کا کام اُنہیں کے سُپرد کیا جاتا تھا۔ وہ عورتوں کی طرح ریشمیں معطّر لباس پہنتے تھے، آنکھوں میں سُرمہ لگاتے تھے اور لب و رخسار پر غازے کی تہہ جماتے تھے۔ نوجوان کنیزوں کو جواری (جمع جاریہ کی) کہتے تھے۔ ان میں سے حسین کنیزیں خلوت کی زینت بنتی تھیں۔ صوبوں کے والی منتخب پری جمال کنیزیں بطور تحائف حریمِ خلافت میں بھیجتے تھے۔ ترکستان سے ہر سال سیکڑوں کنیزیں اور غُلام بطور خراج بغداد کو بھیجے جاتے تھے۔ بغداد کا سوق النخّاس بردہ فروشی کا بڑا مرکز تھا جہاں دن رات چہل پہل رہتی تھی اور ہر روز سیکڑوں لونڈیوں غُلاموں کے سودے چکائے جاتے تھے۔ بغداد کے سوق النخاس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عبدالرزاق لکھتے ہیں۔

> "بغداد میں غلاموں کا بازار سُوق النخاس علاحدہ تھا جس میں ایشیا اور یورپ کے غلام اور کنیزیں فروخت ہوتی تھیں۔ اس بازار میں چوبیس گھنٹے لین دین جاری رہتا تھا۔ کنیزوں کی خریداری میں حُسنِ ظاہری کے علاوہ ان کے اعضاء کے عیب و صواب بھی دیکھتے تھے۔ یہ کنیزیں عموماً تعلیم یافتہ ہوتی تھیں اور اسقدر شوخ اور فتنہ انگیز کہ خریداروں سے آنکھوں ہی آنکھوں میں سودا کر لیتی تھیں اور اپنے اوصاف برجستہ

اشعار میں بیان کرتی تھیں کہ خریدار مجبور ہو جاتا تھا۔ اس بازار میں حبشیات، رُومیات، جرجیات، شرکیات اور عربیات کنیزیں فروخت ہوتی تھیں۔" [1]

دلّال بولی دے کر غلام اور کنیزیں نیلام کرتے تھے اور سودا ہونے پر تاجرانہ وصول کرتے تھے۔ کچھ رقم سرکاری محصول کے طور پر ادا کی جاتی تھی۔ خریدار اور بردہ فروش کے درمیان سودے کی بابت تحریر ہو جاتی تھی جس پر شہادتیں قلم بند کی جاتی تھیں۔ جرمن مستشرق آدم میتز اس عہد کی بردہ فروشی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے [2]

"دورِ عباسیہ میں ہر بڑے شہر میں بردہ فروشوں کا بازار مخصوص تھا۔ یعقوبی نے سامرہ کے بازار کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ بردہ فروش بڑا مکّار اور مُتفنّنی ہوتا تھا۔ کِنِدی کہتا ہے کہ یہ لوگ کنیزوں کے چہرے اور بدن کا رنگ بھی تبدیل کر دیتے تھے اور سانولے رنگ کی کنیز کو صبیح اور سنہرے بالوں والی میں تبدیل کر کے اور بھدے جسم والی کو نازک بدن بنا کر بیچتے تھے۔ نیلی آنکھوں کو سیاہ آنکھوں میں بدل دیتے تھے اور زرد رُخساروں کو لال بھبوکا کر دکھاتے تھے، دُبلے پتلے جسم کو گداز بدن میں تبدیل کرنے کا سلیقہ رکھتے تھے، چہرے پر سے چیچک کے داغ اور مسّے وغیرہ دُور کر دیتے تھے۔ ایک بردہ فروش کہتا ہے "ایک درہم قیمت کی حِنا سے ایک کنیز کی قیمت میں ایک سو درہم کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ چھوٹے بالوں میں سیاہ رنگ کے باریک بال اور دھاگے لگا کر انہیں زلفِ دراز بنا دیتے تھے، دانتوں کو چمکانے کے لئے کوئلے اور نمک کو پیس کر بنایا ہوا منجن استعمال کراتے تھے۔ بردہ فروش کنیزوں کو ہدایت کرتے کہ وہ بوڑھے خریداروں کے ساتھ ناز و ادا سے پیش آئیں لیکن نوجوانوں کے سامنے شرمیلی بن جایا کریں۔ اس طریقے سے دونوں کے جذبات کو بھڑکایا جا سکتا ہے۔ گوری کنیزوں کے ناخنوں پر سُرخی لگاتے اور سانولی کنیزوں

---

[1] البرامکہ ۵

[2] RENAISSANCE OF ISLAM

کے ناخن سنہرے رنگتے تھے۔ اس طرح وہ نیچر کی تقلید کرتے تھے جو پھولوں کے مختلف رنگوں سے جاذبیت اور فریبِ نگاہ کا سامان کرتی ہے۔ یہ بیان ابن بتلان کا ہے جس نے کنیزوں کو خریدنے کے گر اپنی کتاب میں لکھے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ہندی عورتیں حلیم الطبع اور نازک مزاج ہوتی ہیں لیکن اُن کا حُسن جلد ہی زائل ہو جاتا ہے۔ ہندی غلام اچھے منتظم ہوتے ہیں اور صنعت و حرفت میں کامل ہوتے ہیں۔ سندھ کی عورتیں کمر کی نزاکت اور زلفِ دراز کے لئے ممتاز ہیں۔ مدینہ کی کنیز شائستہ، شوخ و شنگ اور کافر ادا ہوتی ہے اور بہترین مُطربہ بنتی ہے۔ مکہ کی کنیزوں کے ٹخنے خوش وضع گداز ہوتے ہیں، کلائیاں نازک ہوتی ہیں اور آنکھوں میں شیریں خستگی کی کیفیت ہوتی ہے۔ طائف کی کنیزیں بھورے سنہرے رنگ کی نازک بدن ہوتی ہیں اور بذلہ سنج، خندہ جبیں ہوتی ہیں بچے پیدا کرنے کے لئے بربری کنیزیں بہترین ہیں۔ وہ سلیم الطبع ہوتی ہیں اور ہر قسم کے حالات سے موافقت پیدا کر لیتی ہیں ..... بردہ فروشوں کے دلال ابو عثمان کے خیال میں بہترین کنیز بربر کی ہے جسے نو برس کی عمر میں اُس کے وطن سے لایا جائے اور جو تین برس تک مکہ اور مدینہ میں قیام کرے اور اُس کے بعد عراق لائی جائے جہاں اُس کی مناسب تربیت کی جائے۔ اس طرح اُس میں قومی اوصاف کے ساتھ مدینہ کی شوخی و دلبری، مکہ کی نزاکت اور عراق کی شائستگی پیدا ہو جائے گی۔ تمام کنیزوں میں حبشی کنیزیں خوش طبع ہوتی ہیں، ترکی کنیزیں گوری اور نازک ہوتی ہیں۔ اُن کی آنکھیں بے شک چھوٹی ہوتی ہیں لیکن اُن میں بلا کی کشش ہوتی ہے۔ وہ اچھی شہسوار بنتی ہیں، فیاض اور خوش خصال ہوتی ہیں۔ وہ کھانا بھی خوب پکاتی ہیں لیکن اُن پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ یونانی کنیزیں سرخ و سپید ہوتی ہیں۔ اُن کے سر کے بال نرم اور لچکیلے ہوتے ہیں اور آنکھیں نیلی ہوتی ہیں۔ وہ فرماں بردار، باوفا،

اور قابلِ اعتماد ہوتی ہیں۔ آرمینیا کی کنیزیں تمام سفید فام کنیزوں میں بدترین ہوتی ہیں۔
وہ متناسب الاعضاء ہوتی ہیں لیکن اُن کے پَیر بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ اُنہیں
چوری کی عادت ہوتی ہے اور عموماً بدچلن ہوتی ہیں۔ آرمینیا کی کنیز یا غلام کو ایک
ساعت کے لئے بیکار چھوڑ دو وہ کوئی نہ کوئی فتنہ ضرور جگا دیں گے۔"

بردہ فروشوں کے گھروں نے ہمارے یہاں کے اربابِ نشاط کے کوٹھوں کی صورت اختیار کرلی تھی جہاں رئیس زادے جوق در جوق جاتے تھے اور کنیزوں سے جی بہلاتے تھے۔ الف لیلہ و لیلہ میں طاہر بن الاعلیٰ کا ذکر آیا ہے جو ایک کنیز کے پاس خلوت میں جانے کے دس دینار وصول کرتا تھا۔ شیخ صلاح الدین خدابخش نے کتاب الموشح کے حوالے سے بردہ فروشی کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

"جب کوئی کنیز کسی مجلس میں کسی رئیس زادے کو دیکھ پاتی ہے تو اُسے اپنی جانب مائل کرنے کے لئے آرزو پرور نگاہوں سے اُس کی جانب دیکھتی ہے، اُس کے پیالے سے بچی ہوئی شراب پیتی ہے، اُنگلیاں چٹخا چٹخا کر اُس کی طرف بوسے پھینکتی ہے۔ جب وہ اُس کے دامِ محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے تو مکر و فریب سے اُسے یقین دلاتی ہے کہ تمہارے فراق میں میری راتوں کی نیند حرام ہو گئی ہے۔ وہ کبھی اُسے اپنی انگشتری بھیجتی ہے، کبھی اپنی زلف کا حلقہ کاٹ کر ارسال کرتی ہے، کبھی اپنے ناخن کا ٹکڑا، کبھی عُود کا ٹکڑا اور کبھی لُوبان کا ٹکڑا جو بوسے کی علامت سمجھا جاتا ہے، کبھی اُسے رقعہ لکھتی ہے جسے اپنے عُود کی تار میں لپیٹ کر بھیجتی ہے اور کاغذ پر اپنے آنسوؤں کے دھبّے لگا دیتی ہے۔ جب وہ اُس پر قابو پا لیتی ہے تو طرح طرح کی فرمائشیں کرنے لگتی ہے، عدن کا قیمتی کپڑا، نیشاپور کے زرتار پردے، سُوس کے دستار، ریشمیں کمربند، کمباجہ کے مرصّع جوتے، زمرّد اور الماس کے جڑاؤ ہار، انگشتریاں وغیرہ، کبھی وہ بیماری کا بہانہ کرتی ہے تاکہ اپنے عاشق سے تحائف وصول کرے یعنی مُشک و عنبر کی خوشبوؤں میں بسائی ہوئی قمیض، کافور، قیمتی شراب وغیرہ اور جب وہ قلاش ہو جاتا ہے تو بڑی

سنگ دل سے اُسے دھتا بتا دیتی ہے۔"

خلفاء اور اُمراء تربیت یافتہ کنیزوں کو حاصل کرنے کے لئے اپنے خزانے لٹا دیتے تھے۔ ہارون یحییٰ برمکی کی کنیز دنانیر پر فریفتہ ہو گیا تو ملکہ زبیدہ نے اُس کا دل ہٹانے کے لئے دس حسین کنیزیں ہارون کو پیش کیں۔ انہی میں مراجل تھی جس کے بطن سے مامون الرشید پیدا ہوا۔ مہدی حبشی کنیزوں کا دلدادہ تھا۔ اُس کا سیاہ فام بیٹا ابراہیم جس نے موسیقی میں کمال حاصل کیا ایک حبشی کنیز کے بطن سے تھا۔ مامون الرشید نے عریب کو ایک لاکھ درہم میں خریدا۔ عریب ایک باکمال مغنیہ تھی۔ اُس کے کمالات موسیقی پر خلیفہ المعتز باللہ نے ایک کتاب لکھی تھی۔ وہ ایک ہزار دھنوں کی مُوجد تھی۔ اُمراء شریف گھرانوں میں شادی کرنے سے گھبراتے تھے اور کنیز کو الحرۃ (آزاد عورت) پر ترجیح دیتے تھے۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کنیزوں کو خود دیکھ بھال کر خریدتے تھے جبکہ الحرۃ کو عورتیں منتخب کرتی تھیں جن کا ذوق حُسن مشتبہ ہوتا تھا۔ چنانچہ یہ معلوم کر کے تعجب نہیں ہوتا کہ سفاح اور امین کے سوا تمام خلفائے بنو عباس کنیزوں کے بطن سے تھے۔ منصور کی ماں سلامہ ایک بربر لونڈی تھی۔ المستکفی ایک یونانی کنیز کے بطن سے تھا۔ المطیع کی ماں ایک سلاوی کنیز تھی جو سیٹی خوب بجاتی تھی اور زبان پر پتہ رکھ کر بڑی دلکش سُریں نکالتی تھی۔ ہارون الرشید ایک ایرانی لونڈی خیزران کا بیٹا تھا۔ خلفائے بنو عباس کنیزوں پر بے دریغ دولت لٹاتے تھے۔ مہدی نے مکنونہ کو ایک لاکھ درہم میں خریدا اور بصبص پر سترہ ہزار دینار خرچ کئے۔ اسی طرح حلّہ اور حسنہ پر لاکھوں خرچ کئے تھے۔ ہارون نے ذات الخال کو ستر ہزار دینار میں خریدا تھا۔ مسعودی نے متوکل کے بارے میں لکھا ہے کہ اُس کے حرم میں چار ہزار کنیزیں تھیں۔ تاریخ عالم کا سب سے بڑا حرم خسرو پرویز کا تھا[1] جس کی کنیزوں کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ کرسٹنارائو والئی وجیانگر کے پاس بارہ سو خوبصورت لونڈیاں تھیں۔ مارکو پولو لکھتا ہے کہ قبلائی خان کے لئے ہر سال ارغوت (تاتار کا ایک علاقہ) سے ایک سو حسین کنواریاں لائی جاتی تھیں جن میں سے تیس چالیس منتخب کی جاتی تھیں۔ اُنہیں بوڑھی عورتیں اپنی نگرانی میں رکھتی تھیں۔ وہ

---

[1] طبری

دیکھتیں کہ ان میں کوئی جسمانی عیب تو نہیں ہے یا وہ رات کو سوتے میں خراٹے تو نہیں لیتیں، اُن کی سانس خوشبودار ہے کہ نہیں اور جسم سے کوئی ناگوار بدبُو نہیں آتی۔ اس معائنے کے بعد اُن کے بدن کو خوشبویات میں بسا کر اور لوبان کی دھونی دے کر خاقان کے شبستانِ عیش میں بھیجا جاتا تھا۔ فتح علی شاہ قاچار شاہِ ایران نے اولاد پیدا کرنے کا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ اُس کی سینکڑوں کنیزوں اور ممتوعات سے تین ہزار بیٹے بیٹیاں پیدا ہوئے۔ فتح علی شاہ کا پسندیدہ محل نگارستان تھا۔ اس میں سنگِ مرمر کا نہایت خوبصورت حمّام تھا جس میں ایک اونچی نرم سطح والی سرسورک (پھسلنے والی جگہ) بنائی گئی تھی جس کا نچلا حصّہ سطحِ آب سے ملا ہوا تھا۔ اِس سرسورک سے پھسل کر فتح علی شاہ کی حسین کنیزیں اُس کے بازوؤں میں آگرتی تھیں[1]۔ اِس پہلو سے صقلیہ کا بادشاہ ڈائیونیسس عجیب ذوق رکھتا تھا۔ وہ بہت سی فاختائیں پکڑوا کر اور اُن کے پر نچوا کر ایک بند کمرے میں چھوڑ دیتا پھر اپنی برہنہ کنیزوں کو حکم دیتا کہ اُنہیں پکڑیں۔ وہ اُن کے پیچھے بھاگتی پھرتیں اور بادشاہ اُنہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ یونان کے شہر ٹرینین میں رواج تھا کہ برہنہ کنیزیں مہمانوں کو کھانا کھلاتی تھیں۔ مہمان اُن کے بالوں سے تولیے کا کام لیتے تھے۔ ہارون الرشید کا وزیر جعفر برمکی باکرہ کنیزوں کا رسیا تھا۔ ہر جمعے کو ایک باکرہ کنیز اُس کی خلوت میں بھیجی جاتی تھی[2]۔

کنیزوں کی حفاظت پر خواجہ سرا (ہیجڑے) مامور تھے جنہیں مُعلّم، شیخ اور خادم بھی کہا جاتا تھا[3]۔ صقالبہ ہیجڑے فرانس سے درآمد کیے جاتے تھے جہاں لڑکوں کو مُخنّث بنانے کے لیے یہودیوں نے کارخانے کھول رکھے تھے۔ وردوں کا کارخانہ ازمنۂ وسطیٰ میں رُسوائے زمانہ تھا۔ وینس، جینوا اور فلورنس کے شہروں میں غریب ماں باپ کے بچے خرید کر ہیجڑے بنائے جاتے تھے اور اسلامی ممالک کو برآمد کیے جاتے تھے۔ خواجہ سرا نہایت سنگدل اور بے رحم ہوتے تھے اور کنیزوں کی کڑی نگرانی کرتے تھے۔ معمولی سی لغزش پر بھی کنیزوں کو عبرت ناک سزا دی جاتی تھی ایک دن شاہ عبّاس کبیر صفوی

---

[1] A YEAR AMONG THE PERSIANS

[3] ص ۳۰۲ وفیات الاعیان، ابنِ خلکان۔

نے سرور کے عالم میں اپنی تین محبوب کنیزوں سے کہا کہ وہ اُس کے ساتھ شراب نوشی میں شریک ہوں۔ کنیزوں نے معذرت کی کہ وہ زیارت کے سفر پر جانے والی ہیں۔ بادشاہ نے اُسی وقت تینوں کو زندہ آگ کے الاؤ میں پھکوا دیا۔ غلاموں اور کنیزوں کو ایک دوسرے سے عشق کرنے کی سخت ممانعت تھی۔ جاحظ نے اپنا چشم دید واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"ایک دن میں کشتی میں محمد بن ابراہیم کے ساتھ سامرّا سے بغداد جا رہا تھا۔ ابھی ہم ساحل سے تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ محمد بن ابراہیم نے حکم دیا کہ عرشے پر پردے لٹکا دیئے جائیں اور کنیزیں ناچ گانا شروع کریں۔ ایک کنیز نے قتارہ بجا کر اس مطلب کے شعر گائے۔

"میں اُن عشاق کے لیے رحم کی درخواست کرتی ہوں جو بے یار و مددگار ہیں
اُنہیں کب تک ایک دوسرے سے جُدا رکھا جائے گا اور وہ کب تک چُپ چاپ
غم فراق برداشت کرتے رہیں گے۔"

گانا ختم ہوا تو ایک کنیز نے مزاحاً پوچھا "ان حالات میں عُشاق کو کیا کرنا چاہیے۔" یہ سن کر گانے والی کنیز نے اچانک دریا میں چھلانگ لگا دی۔ ایک نوجوان غلام نے جو اپنے آقا کے پیچھے کھڑا مگس رانی کر رہا تھا کنیز کو دریا کی موجوں میں غلطاں دیکھا تو لپک کر آگے بڑھا، دریا میں کود گیا اور اپنی محبوبہ سے جا ملا۔ اس طرح عُشاق کو وصل مدام حاصل ہو گیا۔"

سلاطین و اُمراء کی حرم سراؤں میں سیکڑوں کنیزیں رہتی تھیں۔ ان میں سے اکثریت ایسی کنیزوں کی ہوتی تھی جنہیں دو ایک بار خلوت میں بلا کر فراموش کر دیا جاتا تھا اور وہ اپنی بے مصرف زندگی کے تلخ ایام یاس و حرماں کی اتھاہ تاریکیوں میں کاٹ دیتی تھیں۔ خواجہ سرا اور قہرمانہ ان کی ایک ایک حرکت پر نگاہ رکھتی تھیں لیکن وہ اپنی آسودگی کی کوئی نہ کوئی راہ تلاش کر ہی لیتی تھیں۔ میڈم کل برنیلی محمد پاشا لکھتی ہیں کہ سلطان عبدالمجید کی کنیز[illegible] نے جھروکوں سے راہ گیروں کو اشارے کر کے بلا لیا

کرتی تھیں اور اُن سے تمتع کرنے کے بعد انہیں قتل کرا دیتی تھیں۔ سلیمان قانونی کا رویّہ زیادہ حقیقت پسندانہ تھا۔ اُس کے حرم میں تین سَو کنیزیں تھیں۔ جب حرم سرا میں سلطان کی آمد آمد ہوتی تو وہ ہار سنگھار کرکے قطاریں کھڑی ہو جاتیں۔ سلطان چلتے چلتے کسی کنیز کے کندھے پر اپنا رومال ڈال دیتا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ آج کی رات تم میری خلوت میں بسر کروگی۔ جو کنیز پچیس برس کی عمر تک اس رومال سے محروم رہتی تھی اُسے آزاد کرکے کسی امیر سے اُس کی شادی کر دی جاتی تھی۔ سلیمان قانونی کے ایک درباری ایاز پاشا کا حرم اتنا وسیع تھا کہ وہ کہا کرتا تھا کہ اُس کے یہاں بیس گہواروں میں ہمیشہ شیر خوار بچے موجود رہتے ہیں۔ اسمٰعیل قلی خان شہنشاہ اکبر کا ایک درباری تھا۔ وہ دربار جاتے وقت اپنی کنیزوں کے اِزار بندوں پر مُہریں کر جاتا تھا۔ آخر انہوں نے تنگ آکر اُسے زہر دے کر مار ڈالا۔ عرب ممالک کی بہ نسبت ہندوستان میں لونڈی غُلام بہت ارزاں تھے جیسا کہ ابنِ بطوطہ کے سفرنامے سے معلوم ہوتا ہے۔ علاء الدین خلجی نے دوسری اجناس کی طرح لونڈی غلاموں کے نرخ مقرّر کر دیئے تھے۔ گھر کا کام کاج کرنے والی باندی کی قیمت پانچ سے بارہ ٹنکہ تھی جو لونڈی اپنے آقا کی خلوت میں بار پاتی اُسے بیس سے تیس ٹنکوں میں خریدا جا سکتا ہے۔ غلام ایک سے دو سَو ٹنکوں میں بکتا تھا۔ خوبصورت اُمرد بیس تیس ٹنکوں میں مِل جاتا تھا۔ کام کاج کرنے والے غلام کی قیمت دس سے پندرہ ٹنکے تھی۔[1] میر جملہ، شائستہ خان، ابوالحسن تانا شاہ اور باز بہادر کی کنیزیں حُسن و جمال کے لئے مشہور تھیں۔ یہ لوگ رُوم، چین، فرنگ وغیرہ سے خوبصورت کنیزیں خرید خرید کر حرم میں داخل کرتے تھے۔ شرر لکھنوی واجد علی شاہ کی معذرت خواہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔[2]

"معترضین نے اس بارے میں بادشاہ کی حالت پر غور نہیں کیا اس لئے کہ ممتوعات کی کثرت تو اُن کے اتقا اور پابندیٔ شرع کی دلیل تھی اور اتقا بھی ایسا تھا کہ معمولی مسلمانوں میں بہت کم دیکھا گیا ہے۔ تمام بادشاہان اسلام کی نسبت آپ سُنتے آئے میں کہ اِن کے محل میں چند بیویوں کے ساتھ ہزاروں کنیزیں بھری ہوئی تھیں۔ بنی اُمیّہ،

---

[1] تاریخ فیروز شاہی [2] جانِ عالم

بنی عباس اور بنی فاطمہ خلفاء کے حریم خلافت کا یہی حال تھا۔ سلاطین آلِ عثمان کے محلوں کی یہی کیفیت تھی۔ شاہان مغلیہ کی حرم سراؤں کا یہی رنگ تھا اور اب اگرچہ بردہ فروشی اور جائز کنیزوں کی فراہمی کا سلسلہ مسدود ہو گیا ہے مگر ہندوستان کے والیان ریاست کے محل اور زنان خانے اُسی طرح بے شمار عورتوں سے بھرے ہوئے ہیں۔"

۱۹ ویں صدی میں اہلِ مغرب نے بردہ فروشی کو خلافِ قانون قرار دیا لیکن بعض اسلامی ممالک میں بردہ فروشی کا کاروبار جاری رہا۔ مصر کے جلاب (بردہ فروش) نیوبیہ اور حبشہ سے کم سن لڑکیاں خرید کر یا جبراً پکڑ کر لاتے اور شہروں میں فروخت کرتے رہے۔ ان میں بعض لڑکیوں کے ساتھ ایسا بہیمانہ سلوک کیا جاتا تھا کہ وہ دریائے نیل میں کود کر خودکشی کر لیتی تھیں۔ خلیج فارس کے کروڑ پتی شیوخ آج بھی سفید غلامی کے سب سے بڑے سرپرست سمجھے جاتے ہیں۔

ہم نے طوالت کے خوف سے اپنی ہی تاریخ سے بردہ فروشی کی اکثر مثالیں دی ہیں۔ شاہی اور جاگیرداری عہد میں ہر کہیں غلاموں اور لونڈیوں کی حالت زار و زبوں تھی۔ صدیوں کی بردہ فروشی کے اثرات معاشرۂ انسانی پر نہایت ضرر رساں ہوئے۔

(۱)۔۔۔۔ عورت کا مقام پست تر ہو گیا اور وہ مرد کی ہوسناکی کا وسیلہ بن کر رہ گئی۔ خود عورت کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو گیا کہ وہ مرد کو لبھانے اور بہلانے کا ایک کھلونا ہے اور اس کی زندگی کا واحد مقصد مرد کی ہوا و ہوس کی تسکین کرنا ہے۔ حرم سراؤں کی غیر فطرتی زندگی نے عورت کے کردار و سیرت کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ اُس کی دلچسپیاں تمام تر ہار سنگھار، لباس کی آرائش و زیبائش اور زیوروں کی نمائش تک محدود ہو کر رہ گئیں کہ انہی سے مردوں کی توجہ کو جذب کیا جا سکتا تھا۔ عورت کی بیداری کی اس صدی میں بھی بعض عورتیں گڑیا کا یہ کردار ادا کرنے پر مُصر ہیں۔

(۲)۔۔۔۔ عورت کو پستی کے گڑھے میں گرا کر مرد کے اپنے اخلاق بھی پست ہو گئے۔ اُس نے الّا ماشاء اللہ اعلیٰ قدروں سے صرف نظر کر کے جنسی ہوس کی تسکین کو سب سے اعلیٰ قدر تسلیم کر لیا۔ جنس کا خبط اُس کے اعصاب پہ اِس بُری طرح سوار ہو گیا کہ دن رات کی کامجوئی اور ہوس رانی نے اُس کی قوتِ اقدام و

پیش رفت کو سلب کر لیا۔ شاہیت کے دور کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بردہ فروشی اقوام و ملل کے سیاسی و عسکری تنزل کا ایک اہم سبب رہی ہے۔ حرم سراؤں میں کنیزوں کی فراوانی اور شبانہ روز کی عیش و عشرت نے سلاطین و اُمراء کو دنیا و مافیہا سے غافل کر دیا اور وہ ناساعد حالات و حوادث کا سامنا کرنے کے قابل نہ رہے۔ بردہ فروشی اور منشیات کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ عرب عورت اور شراب کو الاطیبان (دو اچھی چیزیں) کہا کرتے تھے۔ یہی اطیبانان اُن کی تباہی کا باعث ہوئیں۔

(۳) مرد نے عورت کو عصمت و عفت کا پابند کر دیا لیکن خود آزادانہ ہوس رانی کرتا رہا۔ وہ خود تو سیکڑوں عورتوں سے تمتع کرتا تھا لیکن اُس کی حرم سرا میں کوئی محروم محبت لونڈی لغزش کر جاتی تو اُسے بے دریغ جان سے مار دیتا تھا۔ یہ صریح ظلم تھا۔ مرد کی یہ دو رُخی آج بھی باقی ہے۔ وہ اپنی جنسی بے راہ روی کے لئے ہر قسم کا جواز تلاش کر لیتا ہے لیکن عورت کے فطری تقاضوں کی تشفی پر قدغن لگا دیتا ہے۔ مرد اپنے آپ کو عفت سے مُستثنیٰ کر کے عورت سے اس کی پابندی کی توقع کرتا رہا ہے۔

(۴) جنسیات کے نقطۂ نظر سے اہم بات یہ ہے کہ جنسی ملاپ کا مقصد مرد کی یک طرفہ تسکین قرار پائی عورت محض ایک شے بن کر رہ گئی جو مرد کو جنسی حظ کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ مرد بھول گیا ہے کہ عورت کو بھی جنسی حظ اندوزی کا اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا کہ خود اُسے ہے جس مرد کی سیکڑوں باندیاں ہوں وہ ظاہراً اُن کی تشفی پر قادر نہیں ہو سکتا۔ محض اپنے حظ کے لئے سیکڑوں عورتوں کو حرم سراؤں میں بند کر دینا فطرت، دیانت اور انصاف کے منافی تھا لیکن جاگیردارانہ استحصالی معاشرے میں مُقتدر طبقے سے عدل و انصاف کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

(۵) لونڈیوں اور غُلاموں کو انسان ہی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ روس اور فرانس میں ۱۸ ویں صدی تک یہ دستور رہا کہ غُسل خانوں میں غُلام اور چاکر بیگمات کو نہلایا کرتے تھے۔[1] فرنیڈ و ہنرک کہتا ہے کہ ہندوستان میں انگریز افسروں کی میمیں غُسل کرتے وقت اپنے چاکروں سے مدد لیا کرتی تھیں گویا غُلام اور چاکر ذی حس انسان نہیں تھے بلکہ کاٹھ کے پُتلے تھے۔

---

[1] SOCIOLOGY OF SEX

جنس اور مذہب

زرعی انقلاب کے بعد ہر کہیں بار آوری کا مت پھیل گیا جس میں لنگ پوجا کو اہم مقام حاصل تھا۔ معاشرۂ انسانی کی ابتدائی صورت مادری تھی یعنی عورت کو سیادت حاصل تھی۔ اس زمانے میں لنگ[1] اور یونی[2] کو حیات و افزائش کی علامت سمجھ کر پوجتے تھے۔ مصرِ قدیم میں کوڑی کو مقدّس مانتے تھے کیوں کہ وہ یونی کی شکل کی تھی چنانچہ اُسے لین دین کا سکّہ بھی بنا لیا گیا۔ پدری نظامِ معاشرہ میں مرد کو فوقیت حاصل ہو گئی۔ اِس دَور میں بھی آسمان، دھرتی، آفتاب، سیاروں اور چاند کی پرستش کے دوش بدوش لنگ اور یونی کی پوجا جاری رہی۔ قدما اپنے معبدوں کے صحن میں کئی کئی سو فٹ کے اونچے لنگ نصب کرتے تھے۔ لنگ کو سعد مان کر اس کے ننھے منّے مجسمے سونے چاندی یا تانبے کے بنوا کر گلے میں لٹکاتے تھے یا بازوؤں پر باندھتے تھے تاکہ نظرِ بد سے محفوظ رہیں۔ مصری لنگ کو حیاتِ نو کا ضامن سمجھتے تھے اور اعزّہ کی قبروں پر انکھ ــــ دستہ دار صلیب جو لنگ یونی کے اتصال کی علامت تھی ــــ رکھتے تھے تاکہ مُردے پھر سے زندہ ہو جائیں۔ آج کل بھی کلیسائے رُوم کے پیرو اپنے عزیزوں کی قبروں پر اِسی مقصد کے لئے صلیب نصب کرتے ہیں۔ اُن کی صلیب مصری انکھ سے ماخوذ ہے۔ یونانِ قدیم میں دائونیسیس اور ہرمس جیسے دیوتاؤں کے لنگ کو توالد و تناسل کا سبب مان کر پوجتے تھے۔ پریاپس بارآوری کا دیوتا تھا جو کھیتوں اور باغوں کا محافظ تھا۔ اُس کے مجسمے لنگ کی صورت میں کھیتوں اور باغوں میں نصب کرتے تھے تاکہ اُن کا پھل نظرِ بد سے محفوظ رہے۔ اُس کے لنگ کے سرے پر انسانی چہرہ تراشا جاتا تھا۔ لاہور کے عجائب گھر میں ایک بہت بڑا سنگی لنگ رکھا ہے جس کے

---

[1] یونانی زبان میں فیلس، [illegible]ت میں پالا، پنجابی میں پھالا۔

[2] یونی کا لغوی معنی ہے فاختہ۔ فاختہ کی شکل یونی کی سی ہے اس لئے یہ حسن کی دیوی کی علامت بھی بن گئی۔

سرے پر انسانی شبیہ تراشی گئی ہے۔ اس وضع کا لنگ ظاہراً یونان سے گندھارا آیا تھا۔ روما میں فیسانس[1]، ٹوٹونس، موٹونس اور لائبر[2] دیوتاؤں کے لنگ کی پوجا کی جاتی تھی۔ عورتیں بانجھ پن کے علاج کے لئے اس سے ہم کنار ہوتی تھیں اور ان پر پھول پتے چڑھا کر مرادیں مانگتی تھیں۔ امریکہ میں مایا اور پیرو کے باشندے بھی ذوق و شوق سے لنگ کی پوجا کرتے تھے۔

ہبوطِ آدم کا اسطور عالمگیر ہے۔ اس میں سیب دوشیزگی کی علامت تھی۔ بعض اقوام میں دانۂ گندم کا بھی ذکر آیا ہے جو یونی کی علامت[3] تھی۔ سانپ اور شجر لنگ کی علامتیں تھیں۔ علم سے مراد جنسی ملاپ کا علم تھا۔ جننگ[4] کہتا ہے کہ صابئین کے معبدوں میں منارہ اور گنبد لنگ اور یونی کی علامات تھیں اور محراب جس میں زہرہ دیوی کی مورتی رکھتے تھے یونی کی شکل کی بنائی جاتی تھی۔ اس کے خیال میں مذہبی رسوم کے برتن مرتبان، کشکول وغیرہ بھی یونی کی علامتیں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہندو پرنام کرتے وقت جس انداز میں دونوں ہاتھ جوڑتے ہیں اس سے بھی تبرکاً یونی کی شکل بنانا مقصود ہوتا ہے۔ جننگ کے بقول آج بھی گرجا گھروں میں محرابیں اور کھڑکیاں یونی کی شکل کی بنائی جاتی ہیں۔ وہ تابوتِ سکینہ کو بھی رحم کی علامت سمجھتا ہے جس میں دو پتھر اور ایک عصا رکھے جاتے تھے۔ بعض صحرائی اقوام میں مقدس درخت لنگ کی علامت بن گئے تھے۔ نجد میں بلیدۃ الذا کے مقام پر ایک درخت تھا جس سے عورتیں حصولِ اولاد کے لئے ہمکنار ہوتی تھیں۔ محمد بن عبدالوہاب نے اسے کٹوا دیا تھا۔ بلوچی عورتیں اسی مقصد کے لئے شاہ وساوا کے مزار کے درخت سے ہم کنار ہوتی تھیں[5]۔

شہر ٹرائے کی کھدائی پر سطحِ زمین سے تیس فٹ نیچے لنگ یونی کے مجسمے دستیاب ہوئے تھے۔ ہڑپہ کے کھنڈروں سے بھی لنگ یونی کے مجسمے برآمد ہوئے ہیں۔ ای او جیمز کے خیال میں ہندوؤں کی

---

[1] انگریزی کا لفظ FASCINATION اسی سے یادگار ہے، قدما لنگ کو طلسماتی کشش کا پیکر مانتے تھے۔

[2] انگریزی کا لفظ LIBERTINE (اوباش) اسی سے مشتق ہے خیال یہ تھا کہ یہ دیوتا شرم و حیا سے نجات دلاتا ہے۔

[3] ؎ بزیرِ دامنش چیزے بجیبے — دو دانہ گندم آدم فریبے۔

[4] SEX SYMBOLISM IN RELIGION.

[5] قانونِ اسلام، جعفر شریف

لنگ پوجا دراوڑوں سے مستعار ہے۔ ہندوستان واحد ملک ہے جس میں لنگ اور یونی کی پوجا آج بھی ذوق و شوق سے کی جارہی ہے۔ ملک کے طول و عرض میں شیو لنگ کی پوجا کا رواج ہے شیو دراوڑوں کا بارآوری کا دیوتا تھا جسے کالی اور کرشن کے ساتھ آریاؤں نے دراوڑوں سے مستعار لیا تھا۔ لنگ کو جس حلقے پر نصب کیا جاتا ہے اُس سے یونی مراد ہے۔ شیو لنگ پر ہر روز تیل گرا کر اُس کی پوجا کی جاتی ہے۔ لنگامت کا بانی لبساوا تھا۔ اُس کے پیرو سونے چاندی کے لنگ بنوا کر انہیں گلے میں لٹکاتے ہیں اور پیشانی پر لنگ یونی کی شکل کا تلک لگاتے ہیں۔ انہیں لنگ دھاری اور شیو بھگت بھی کہا جاتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ کائنات پُرش (توانائی) اور پرکرتی (مادہ) کے اتصال سے عالم وجود میں آئی ہے۔ مرد عورت کی مواصلت کو اِس آفاقی اتصال کی ایک صورت مانتے ہیں۔ چھاندوگیہ اُپنشد میں جنسی مواصلت کو مقدس یگیہ کہا گیا ہے۔ برہا دارنیک اُپنشد میں ہے۔

"اپنی محبوبہ سے ہمکنار ہو کر جس طرح مرد دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے اسی طرح جو آتما برہم سے ہم آغوش ہوتی ہے وہ سب کچھ فراموش کر دیتی ہے۔"

کرشن گیتا میں کہتا ہے

"میں ہوں کام (نفسانی خواہش) جو خلق کرتا ہے۔"

گیتا ہی میں کرشن کہتا ہے "یہ پرکرتی میری بچہ دانی ہے جس میں میں حمل قائم کرتا ہوں اور جس سے تمام موجودات پیدا ہوتے ہیں۔" شنکر اچاریہ نے 'دیوی کے منتر' میں کہا ہے "شیو پرکرتی سے واصل ہو کر ہی تخلیق کر سکتا ہے ورنہ وہ بے جان محض ہے۔" اِس قول میں تنترمت کا یہ عقیدہ ملتا ہے کہ تخلیق و تکوین کے عمل میں نسوانی پہلو زیادہ اہم ہے۔ یاد رہے کہ تنترمت مہامایا کی پوجا پر مبنی ہے۔ شیو مت کے پیرو لنگ کو شیو اور یونی کو شکتی کی علامتیں سمجھتے ہیں۔ شاکت فرقے کے پیرو لنگ پوجا کے ساتھ بھگ پوجا (فرج کی پرستش) بھی کرتے ہیں۔ ہولی کے تہوار پر جو دراوڑوں سے یادگار ہے یہ لوگ لنگ اور یونی کے مجسّمے اٹھا کر جلوس نکالتے ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ رام نے رامیشورم میں شیو لنگ نصب کر کے اُس کی پوجا کی تھی۔ اِس لنگ کو ہر روز گنگا جل سے غسل دیا جاتا ہے۔ اِس پانی کو بانجھ عورتیں حصولِ اولاد کے لئے پیتی ہیں۔ کشمیر میں امرناتھ ہندوؤں کا ایک بڑا تیرتھ ہے جہاں ہر سال ملک کے

دُور دراز کے علاقوں سے یاتری دشوار گذار راستے طے کر کے آتے ہیں۔ اِس مقام پر ایک غار ہے جس میں برف کی لاٹ نمودار ہوتی ہے اور ہر روز تھوڑی تھوڑی بڑھتی رہتی ہے یہاں تک کہ چاند کی ۱۵ دیں رات کو دس گز لمبی ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد بتدریج گھٹنے لگتی ہے۔ ہندو اسے مہادیو کا لِنگ سمجھ کر اس کی پُوجا کرتے ہیں[1]۔ ہندوؤں کی رُسُوم عبادت میں کُنڈ۔ سُورج کُنڈ، ہون کُنڈ کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ کُنڈ[2] کا معنیٰ ہے گڑھا یا کُنواں۔ کُنڈ یونی کی علامت ہے جو ہندوؤں کے یہاں پُوجا کا لازمی جُز بن گئی ہے۔

قدیم زمانے کے یہودی اشیرات (مقدّس کھمبے) اور نوک دار چٹانوں کی صورت میں لِنگ کو پُوجتے تھے۔ یہودیوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی شخص کو قول و قرار کرنا ہوتا تو وہ دوسرے آدمی کے خصیتین پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتا تھا۔ ہندو آج بھی شیو کے بیل نندی کے خصیتین پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتے ہیں۔ یہودیوں کی روایات میں سانپ لِنگ اور جنسی ہیجان کی علامت تھا۔ دراوڑوں کی ناگ پُوجا میں بھی ناگ کو لِنگ کی علامت سمجھ کر پُوجتے تھے۔ ہندوؤں کی ناگ پُوجا اُنہیں سے ماخوذ ہے۔ آج کل بھی ناگ پنچمی کا تہوار ہر سال ساون کے مہینے میں منایا جاتا ہے۔ چین کے پھریرے پر اژدہا کا نشان بیسویں صدی کے اوائل تک موجود رہا ہے۔ لِنگ پُوجا کے آثار کلیسائے رُوم میں بھی باقی ہیں۔ فرانس کے اصلاح یافتہ کلیسا کے پیروؤں نے جنہیں ہیوگونو کہتے تھے ایک دفعہ حملہ کر کے امبرون کا شہر فتح کر لیا جہاں راہب فاتاں کا مقدّس لِنگ نصب تھا۔ لوگ اس پر تیل اُنڈیل کر اور شراب لنڈھا کر اُس سے مُرادیں مانگتے تھے جس سے اس کا رنگ سیاہی مائل سرخ ہو گیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کسی راہب کا لِنگ نہیں تھا بلکہ قدیم زمانے سے موجود تھا جسے مقامی لوگوں نے اپنا لیا تھا۔ ہیوگونو نے اسے توڑ پھوڑ کر پھینک دیا۔

مادری نظام معاشرہ میں ہل چلانے اور جنسی ملاپ کرنے کو یکساں ثمر آور خیال کرتے تھے جس سے

---

[1] آرائش محفل، شیر علی افسوس۔ [2] یونانی زبان میں CYNTHIOS، جرمنی میں KUNDT، انگریزی میں KUNT [3] TESTES انگریزی زبان کا لفظ TESTIMONY (قول و قرار) اسی سے مشتق ہے۔

یہ خیال پیدا ہوا کہ جنسی ملاپ سے زمین کی بارآوری کو تقویت ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لئے فصلانہ تہوار منائے جاتے تھے جن پر جنسی ملاپ کی کھلی چھٹی دے دی جاتی تھی۔ اورےنس، ورن، جیوپیٹر، اہورا، دیوس پتیر، آسمانی باپ کے مثیل تھے جو مینہ برسا کر دھرتی دیوی کو حاملہ کر دیتا تھا اور اس کی کوکھ سے فصلیں اُگاتا تھا۔ رابرٹ برفالٹ نے طویل بحث کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ قدیم اقوام میں فصلانہ تہواروں پر کامل جنسی آزادی دی جاتی تھی تاکہ فصل کی برداشت زیادہ ہو۔ رُومیوں کے ہاں فصل بونے کے موقع پر سیٹرنیلیا کا تہوار منایا جاتا تھا جس میں عورتیں لنگ کے مجسمے اُٹھا کر چلتی تھیں اور ناچتی ہوئی جلوس نکالتی تھیں۔ جلوس کے خاتمے پر اجتماعی رقص ہوتا تھا اور جنسی ملاپ کی کھلی چھٹی دے دی جاتی تھی۔ یونانیوں کے یہاں وائونیسس کے تہوار پر عورتیں مرد مل کر دیوانہ وار ناچتے تھے۔ جنسی ملاپ کو پوجا کا لازمی جزو سمجھا جاتا تھا۔ مصر قدیم میں آئسس دیوی نے گیہوں اُگانے کا راز دریافت کیا تھا۔ وہ زمین کی بارآوری کی علامت بھی تھی۔ اُس کے پجاری چہار اَبرو کا صفایا کراتے تھے اور صبح و شام دلآویز لحن میں اُس کی مناجات کرتے تھے۔ وہ زنانہ لباس پہنتے تھے اور اعضائے تناسل قطع کرا کر دیوی کی بھینٹ کرتے تھے۔ ختنہ کرانے کی رسم اِسی سے یادگار ہے۔ زمانے کے گذرنے کے ساتھ ذکر کو قطع کرانے کی بجائے غلافِ حشفہ کاٹنے پر اکتفا کرنے لگے۔ یونان میں افرودیسیس کا تہوار بڑی شان و شوکت سے منایا جاتا تھا۔ اِس میں کسبیاں برہنہ ہو کر جلوس نکالتی تھیں۔ فلوریلیا کے تہوار پر کسبیاں برسرِ عام ناچتی تھیں اور تمتّع کی دعوت دیتی تھیں۔ یہ سب کچھ زمین کی بارآوری کو تحریک دینے کے لئے کیا جاتا تھا۔ مرورِ زمانہ سے یہ روایات قدیم مذاہب کی خفیہ رسوم میں بار پا گئیں۔ ہندوستان میں نام دھاری، چولی مارگی اور شاکت خفیہ مجالس میں لنگ اور یونی کی پوجا اور اجتماعی جنسی ملاپ کرتے تھے۔ دیانند کے الفاظ میں [2]

"چولی مارگی بھیرو چکر کے وقت تمام عورتوں کی چولیاں مٹی کے ایک برتن میں اکٹھی رکھ دیتے ہیں، جب شراب پی کر بدمست ہو جاتے ہیں تو چولیوں پہ ہاتھ مارتے

---

[1] SEX IN CIVILIZATION.

[2] ستیارتھ پرکاش

ہیں۔ جس عورت کی چولی ہاتھ آجائے خواہ وہ اپنی بہن یا بیٹی ہو اُس سے سماگم کرتے ہیں۔"

فیروز تغلق نے چولی مارگیوں کے استیصال کی کوشش کی تھی۔ وہ لکھتا ہے۔[1]

"ملاحدہ اور اباحتیاں کا ایک فرقہ تھا جو الحاد و زندقہ سے عوام کو گمراہ کرتا تھا۔ وہ رات کے وقت مقررہ جگہ پر جمع ہو جاتے اور ان میں اغیار و اجانب بھی شامل ہو جاتے۔ وہاں خوب شراب پی جاتی، اُن کا خیال تھا کہ یہ جزوِ عبادت ہے۔ وہیں اُن کی بیویاں، بیٹیاں، بہنیں، مائیں بھی موجود ہوتیں۔ سب لوگ زمین بوس ہو جاتے اور پھر جس شخص کے ہاتھ جس عورت کی چولی آجاتی وہ اُس سے متمتع ہوتا تھا۔ میں نے اِس فرقے کے سرداروں کے سر کاٹ دیئے اور باقی ماندہ کو جلا وطن یا قید کر دیا۔"

ابا دلوا[2] لکھتا ہے کہ نام دھاریوں کی خفیہ مجالس میں تمام جاتیوں کے عورتیں مرد رات کے وقت مل بیٹھتے، شراب، تاڑی، افیون وغیرہ منشیات برتنوں میں چُن کر رکھ دیئے جاتے۔ بھُنے ہوئے گوشت کے مُچھے تھالوں میں سجائے جاتے۔ پھر شراب کے مٹکے کے پاس ایک مرد اور ایک عورت کو برہنہ کر کے کھڑا کر دیا جاتا اور اُن کے لنگ اور یونی کی پُوجا شیو اور شکتی سمجھ کر کی جاتی، اِس کے بعد سب ایک ہی برتن سے شراب پینے لگتے اور گوشت کھاتے۔ نشہ طلوع ہوتا تو عورتوں پر ہاتھ ڈالتے تھے اور ساری رات فسق و فجور میں بسر کرتے تھے۔ اِن میں برہمن، شُودر سبھی شامل تھے۔ یہ لوگ کہتے تھے کہ اِس رات کو ذات پات کی تمیز اُٹھ جاتی ہے۔ شیو بھگتوں کے گُرو کسی چیلے کے ہاں قیام کریں تو مرد باہر چلے جاتے ہیں اور گُرو جی جوان عورتوں سے بلا تکلف فیض یاب ہوتے ہیں۔

لی بان گجرات کے ویشنوؤں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔[3]

---

[1] فتوحاتِ فیروز شاہیہ

[2] تمدنِ ہند

[3] HINDU MANNERS, CUSTOMS AND CEREMONIES.

"گجرات میں زیادہ تر فرقہ ویشنوؤں کا ہے جن کا مذہب عجیب قسم کا ہے یعنی یہ صرف پچیس تیس برہمن پجاریوں کی جو مہاراج کہلاتے ہیں کورانہ پرستش کرتے ہیں۔
ان پجاریوں کی زندگی اور اُن کے پوجنے والوں کی خوش اعتقادی کے متعلق ہم مسٹر ملاباری ایڈیٹر انڈین سپیکٹیٹر بمبئی کی کتاب سے نقل کرتے ہیں۔
یہ پجاری جسے مہاراج کہتے ہیں وشنو اور کرشن کا جسمانی اوتار ہے اور کل خوش اعتقاد ویشنو اپنے جسم اور رُوح اور عزت کو بھی جو اُن سے وابستہ ہیں اُن پر نثار کر دیتے ہیں۔ یہ مہاراج اپنے پُوجنے والوں سے حسب ذیل فیس وصول کرتے ہیں۔ دور سے پرستش کے لئے ۵ روپے، جسم چھونے کے لئے ۲۰ رُوپے، اُن کے پیر دھونے کے لئے ۳۵ روپے، اُن کے پہلو میں بیٹھنے کے لئے ۴۰ رُوپے، اُن کے نہائے ہوئے پانی یا میلے کپڑوں کی دھوون کے لئے ۱۹ روپے اور بالآخر اُن کے ساتھ وصل کرنے کے لئے عورتیں ۱۰۰ سے ۲۰۰ روپے تک نذر کرتی ہیں۔"
یہی حال رادھا ولبھی فرقے کا ہے۔ ہمارے ہاں کے پیران سالوس کو جنہیں اقبال نے 'کعبے کے برہمن' کہا ہے، خوش کرنے کے لئے عقیدت مند عورتیں اپنا تن، من، دھن نثار کر دیتی ہیں۔
شکتی پوجا کے فرقے کے گوسائیں کو بھی جنسی ملاپ کی آزادی ہے۔ گوسائیں ترلوچن کا ذکر محسن فانی نے دبستان مذاہب میں کیا ہے۔ کشمیر کے صوبہ دار ظفر خان نے تبت پر فوج کشی کا ارادہ کیا تو

"ظفر خاں نے اپنے بعض مقربوں کی وساطت سے جو گوسائیں سے بھی تعلق رکھتے تھے گوسائیں سے درخواست کی کہ وہ اُس کی فتح تبت کے لئے دُعا کرے گوسائیں ترلوچن نے کہا میرے پاس چند حسین کسبیاں بھیج دو جو ہر وقت میرے پاس رہیں کیوں کہ ہمارے مسلک میں کسبیوں سے اختلاط کرنا دوسری عورتوں سے خلوت کرنے کی بہ نسبت زیادہ مستحسن ہے اور شراب اور دوسرے منشیات کی بھی فراہمی ضروری ہے۔

ظفر خان نے گوسائیں کی فرمائش کی تعمیل کی۔"

دُنیائے اسلام میں بعض باطنیّہ فرقے آزادانہ جنسی ملاپ کے قائل تھے۔ یہ لوگ مزدک کی تعلیمات سے مُتاثر ہوئے تھے۔ مزدک نے کہا کہ عورت اور زر و مال فتنہ و فساد کے موجب ہیں۔ امن قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اُنہیں ہر خاص و عام پر مباح کر دیا جائے، اُمراء سے دولت چھین کر غریبوں میں بانٹ دی جائے اور جن کے پاس ایک سے زیادہ بیویاں اور لونڈیاں ہوں وہ اُن سے لے کر ایسے اشخاص میں تقسیم کر دی جائیں جن کے پاس کوئی عورت نہیں ہے۔ بابک بن عبدالصمد کے پیروؤں کو خرّمیّہ کہتے تھے۔ یہ لوگ سال بھر میں ایک رات مُقرّر کر لیتے۔ جوان عورتیں مرد کثیر تعداد میں ایک بڑے کمرے میں جمع ہو جاتے، پھر روشنی گُل کر دی جاتی اور مرد شکار! شکار!! پکارتے ہوئے عورتوں پر پل پڑتے۔ جس کسی کے ہاتھ جو عورت آجاتی وہ اُس سے مُقاربت کرتا تھا۔ محمد بن علی شلمغانی نے اعلان کیا کہ عورت ہر شخص پر طیبّ حلال ہے یہاں تک کہ ہر شخص محرّمات سے بھی اختلاط کر سکتا ہے۔ شرر لکھنوی کے الفاظ میں: [1]

"شلمغانی نے کہا اب جو تکلیف اِس زمانے کے مناسب حال ہے یہ ہے کہ لوگوں کو اپنی عورتوں کو ہر شخص کے لئے حلال کر دینے کی تکلیف دی جائے تاکہ لوگ دوسروں کو اپنی عورتوں سے ہم بستر ہوتے دیکھیں اور غصہ نہ آئے چنانچہ عورتیں مطلقاً ہر شخص کے لئے طیبّ حلال ہیں، انسان اپنے ذوی الارحام اور مُحرّمات ابدیّہ تک کے ساتھ چاہے تو مُقاربت کر سکتا ہے کوئی مضائقہ نہیں باپ اپنے بیٹے کی عورت سے تعلق پیدا کر سکتا ہے بلکہ دینِ حق والوں (شریعت شلمغانی کے پیروؤں) کو چاہیے کہ ہر شخص جو دوسروں سے افضل ہو اپنے سے کم درجے والوں کی عورتوں سے حسبتہً للّٰہ مقاربت کرے تاکہ اُن میں نور کو پہنچا دے اور جو کوئی انکار کرے گا اُس کا جنم بہ پابندیٔ قوانین تناسخ آنے والے بعد کے دور میں عورت کے پیکر میں ہوگا۔"

---

[1] مضامین

قدیم اقوام میں مقدس قحبگی کا ادارہ ہر کہیں موجود تھا۔ دھرتی دیویوں کے معبدوں میں سیکڑوں منتخب حسین لڑکیاں بھینٹ کی جاتی تھیں۔ پجاری اور یاتری دیوی کے نام پر چاندی کے سکے دے کر اُن سے تمتع کرتے تھے۔ آئسس، عشتار، افرودائتی، اناہیتا وغیرہ کے معبدوں کے صحن میں دن رات مقدس عصمت فروشی کا کاروبار جاری رہتا تھا۔ اس کی تہ میں یہ عقیدہ کارفرما تھا کہ مندروں میں جنسی ملاپ کرنے سے زمین کی بارآوری بحال و برقرار ہو جاتی ہے اور فصلیں باافراط اُگتی ہیں۔ ہندوستان میں بعض اوقات بے رحم اور سفاک پروہت سات سات آٹھ آٹھ برس کی دیوداسیوں کو اپنے تصرف میں لاتے تھے۔ مس کیتھرین میو نے ایسے کئی لیلے قلم بند کیے ہیں۔ اُن کے بقول بعض لڑکیاں اپنی ہم جولیوں کا دردناک حشر دیکھ کر مندروں سے بھاگ جاتی تھیں اور انگریز نرسوں کے ہاں پناہ لیتی تھیں۔ مس میو نے ایک آٹھ سالہ بچی کا المناک واقعہ بیان کیا ہے جسے ایک درندہ صفت برہمن نے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا تھا۔ آدھی رات کو مندر کے در و دیوار اُس مظلومہ کی چیخوں سے گونجتے رہے لیکن وہ ظالم پروہت کے چنگل سے نجات نہ پا سکی۔ جنوبی ہند کے بعض مندروں میں آج بھی دیوداسیاں موجود ہیں اور مذہب کے نام پر یہ ناپاک کاروبار جاری ہے۔

کہا جاتا ہے کہ انسان نے اپنے معبود اپنی ہی ذات کے نمونے پر خلق کیے تھے چنانچہ قدماء کی جنسی بے راہ روی کے آثار اُن کے دیوتاؤں اور دیویوں کے احوال میں بھی ملتے ہیں۔ دیوتا اور دیویاں، گندھرو اور اپسرائیں آپس میں معاشقے کرتے تھے اور بعض اوقات انسانوں کے عشق میں بھی مبتلا ہو جاتے تھے۔ یونان کے ایک دیوتا کرونس نے اپنی بہن ریا سے اختلاط کیا جس سے اُس کی بیٹی پیدا ہوئی جو بعد میں تمام دیوتاؤں کی ماتا قرار پائی۔ مصر کے دیوتا اوسائرس نے اپنی بہن آئسس سے نکاح کیا، کرشن صبح و شام گوپیوں کے تعاقب میں سرگرم رہتا تھا۔ مہابھارت میں لکھا ہے

"ایک دن ایک رشی کی کنواری لڑکی نے سورج دیوتا کو بلانے کا منتر پڑھا، وہ ایک جوان خوبرو کی شکل میں آ گیا اور کہا تم نے مجھے کیوں تکلیف دی۔ لڑکی نے کہا میں نے

لہ SLAVES OF GODS

محض آزمائش کے لئے منتر پڑھا تھا۔ اُس نے کہا اب تو میں آ گیا ہوں اور اپنی یادگار چھوڑ جاؤں گا۔ لڑکی جھجکی اور کہا دیوتا میں بدنام ہو جاؤں گی۔ دیوتا نے کہا "نازنین! ڈرتی کیوں ہو اِس عمل کے رہ جانے سے تیری بکارت زائل نہ ہو پائے گی"۔ اِس طور سے کرن پیدا ہوا جو پانڈوؤں کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا اور یہ لڑکی پانچوں پانڈوؤں کی ماں کُنتی تھی۔"

سندھیا برہما دیوتا کی بیٹی تھی۔ برہما نے اُس کی عصمت دری کرنا چاہی تو شیو دیوتا نے اُسے بچا لیا۔ اِندر دیوتا نے گوتم رشی کی اہلیہ سے دھوکے سے صحبت کی رشی نے بددعا دی جس سے اندر کے بدن پر ہزار نشان جا مخصوصہ عورت کے نمودار ہو گئے۔ صنمیاتِ یونان میں افرودائتی حُسن و عشق کی دیوی تھی۔ اُسے لنگڑے ہیفےسٹس سے بیاہ دیا گیا لیکن وہ دیوتاؤں اور انسانوں سے معاشقے کیا کرتی تھی۔ ایریز، ہرمس، پوزی دون، دائونیسس، انکی سس، ادونس اُس کے عشاق تھے۔ یونانیوں کا خداوند خدا زیس ہر وقت نئی حسینہ کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا۔ ایک دن وہ فنیقی شہزادی یوروپا کو جب کہ وہ پھول چُن رہی تھی بھگا کر لے گیا۔ یورپ کا نام اِسی شہزادی سے یادگار ہے۔ یونانی ایک عجیب و غریب حیوان نما انسان کے وجود کے قائل تھے جس کا دھڑ بکرے کا اور چہرہ انسان کا تھا۔ اُسے سائٹر کہتے تھے۔ یہ سائٹر نہایت مغلوب الشہوت تھے اور ہر وقت جنگل کی دیویوں کے پیچھے بھاگتے پھرتے تھے۔ ہندوؤں کے اندر لوک میں اپسراؤں کا ذکر آیا ہے جو حسین نوخیز لڑکیاں ہیں اور دیوتاؤں اور گندھروؤں کا دل بہلاتی ہیں۔ کبھی کبھار کسی تپسوی کو بہکانے اور دیوتاؤں کو اُس کی شکتی سے بچانے کے لئے اُنہیں زمین پر بھیج دیا جاتا ہے۔ رمبھا اور اُروسی مشہور اپسرائیں تھیں[1]

عیسائیت کی اشاعت سے مغرب کی بت پرست اقوام کی جنسی آزادہ روی کا خاتمہ ہو گیا۔ قیصر قسطنطین نے ۳۲۵ء میں مقدس عصمت فروشی کا استیصال کر دیا اور وہ تمام معبد مسمار کرا دیئے جہاں مقدس کسبیاں بیٹھا کرتی تھیں۔ اُس نے نکاح کے تقدس کو بحال کیا اور عصمت و عفت کی اہمیت

---

[1] ہندو کلاسیکل ڈکشنری، دیوی سہائے

واضح کی۔ ولی امبروس نے کہا ہے کہ محض اسی بنا پر کہ عیسائیت نے عصمت و عفت کا تصور بحال کیا اُسے الہامی مذہب سمجھا جا سکتا ہے۔ جناب عیسیٰ نے ساری عمر تجرد کی حالت میں گذار دی تھی اور وہ جنسی ملاپ کو مجبوری کا امر سمجھتے تھے۔ متی کی انجیل میں لکھا ہے۔

"شاگردوں نے اُس سے کہا کہ اگر مرد کا بیوی کے ساتھ ایسا ہی حال ہے تو بیاہ کرنا ہی اچھا نہیں۔ اُس نے اُن سے کہا کہ سب اِس بات کو قبول نہیں کر سکتے مگر وہی جن کو یہ قدرت دی گئی ہے کیوں کہ بعض خوجے (ہیجڑے) ایسے ہیں جو ماں کے پیٹ ہی سے ایسے پیدا ہوئے اور بعض خوجے ایسے ہیں جن کو آدمیوں نے خوجہ بنایا اور بعض خوجے ایسے ہیں جنہوں نے آسمان کی بادشاہی کے لئے اپنے آپ کو خوجہ بنایا۔ جو قبول کر سکتا ہے وہ قبول کرے۔"

پوپ گریگوری ہفتم نے تمام پادریوں کو مجرد رہنے کا حکم دیا اور راہبات پر بھی یہی پابندی عائد کر دی نکاح پر یہ پابندی نہایت غیر فطری اور مضرت رساں تھی۔ جوان پادری اور نوجوان کنواریاں خانقاہوں میں مل جل کر رہتے تھے۔ ہر وقت کے میل ملاپ سے قدرتاً اُن کی جنسی خواہش بھڑک اٹھتی اور وہ ہوا و ہوس کی رو میں بے اختیار بہہ جاتے چنانچہ زمانے کے گذرنے کے ساتھ خانقاہیں فسق و فجور کے مرکز بن گئیں۔ پادری برملا داشتائیں رکھتے تھے اور اپنے حرامی بچوں کی پرورش کرتے تھے۔ اس پر ایراسمس نے جل کر لکھا کہ پادریوں کو زنا کرنے کی اجازت ہے لیکن اُن کے لئے نکاح کرنا ممنوع ہے۔ وہ داشتاؤں سے جی بہلائیں تو پکے عیسائی ہیں لیکن نکاح کریں تو مردود و عاصی سمجھے جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ راہبوں اور راہبات کے اقامت خانے اور قحبہ خانے میں کچھ بھی فرق نہیں ہے۔ لوتھر نے پادریوں کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ لوگ دوسروں کی کمائی پر گلچھرے اڑاتے ہیں اور فسق و فجور میں غرق رہتے ہیں۔ پاپائے روم کے حرامی بیٹے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے تھے۔ ایک انگریز عورت جون کو بھی پوپ کا اعلیٰ عہدہ تفویض ہوا۔ اُسے پوپ جونا کہتے تھے اور وہ ۸۵۵ء میں پوپ لیو چہارم کی موت کے بعد پوپ بنی تھی۔ ایک اتوار کو مذہبی جلوس کے دوران میں پوپ جونا نے عین

سرِ بازار بچہ جن دیا جس پر اُسے قید کر دیا گیا۔ پوپ کے شہر اوگنوں میں جہاں اُسے جلا وطن کیا گیا تھا، مذہبی پیشواؤں نے ایک قحبہ خانہ قائم کیا جس کی سرپرست نیپلز کی ملکہ تھی کسبیوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ تمام عبادات میں باقاعدگی سے حصّہ لیں۔ اِن کسبیوں کے ساتھ خلوت میں صرف راسخ العقیدہ عیسائی ہی جا سکتے تھے، یہودیوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ یہ تجربہ اِس قدر منفعت بخش ثابت ہوا کہ بعد میں پوپ جولیس دوم نے رُوم میں بھی اِس نوع کا ایک قحبہ خانہ کھلوا دیا۔ پادری خود قحبہ خانے کے منتظم تھے۔ مشہور عالم بشپ منز کے متعلق مشہور تھا کہ اُس کے یہاں اتنی ہی تعداد میں کسبیاں تھیں جتنی کہ کتابیں۔ احتساب کلیسیا والے اُن کسبیوں سے تعرض نہیں کرتے تھے جو قحبہ خانوں میں پیشہ کراتی تھیں بلکہ اُن عورتوں کو پکڑتے تھے جو چوری چھپے یہ کاروبار کرتی تھیں۔ ان پر جادوگرنی کا الزام لگا کر اُنہیں آگ میں جھونک دیا جاتا تھا۔ کہتے تھے کہ یہ جادوگرنیاں شیطان سے ہم کنار ہوتی ہیں جب کہ عام کسبیاں انسانوں کے پاس جاتی ہیں۔ مذہبی سنگیت منڈلیوں میں گانے والے لڑکوں کی آواز کی لطافت اور شیرینی کو برقرار رکھنے کے لیے اُنہیں آختہ کرا دیتے تھے۔ اِس مقصد کے لیے پاپائے رُوم ہر سال دو ہزار کم سِن لڑکوں کو ہیجڑے بناتے تھے۔ پادری اِن لڑکوں کو بھی اپنے تصرف میں لاتے تھے۔ اِن حقائق کے پیشِ نظر برٹرنڈ رسل نے کہا ہے کہ عیسائیوں کے اخلاق قدیم بت پرستوں کے اخلاق سے بھی پست تر ہو گئے۔ اُن کے الفاظ ہیں۔

"وحشیوں اور عیسائیوں کی فتح کے ساتھ مرد عورت کے تعلقات بربریت کی عمیق ترین پستیوں میں جا گرے جن کا دُنیائے قدیم میں صدیوں تک کوئی جواب نہیں ملتا۔ قُدماء میں بُرائی یقیناً موجود تھی لیکن بربریت نہیں تھی۔ تاریک صدیوں میں مذہب اور بربریت کے امتزاج سے زندگی کا جنسی پہلو پست و زبوں ہو گیا۔ منکوحہ عورتوں کے حقوق صفر کے برابر تھے، مرد کے فسق و فجور پر شادی کے حلقے سے باہر کوئی پابندی نہیں تھی۔ مرد کی حیوانیت کو کُھل کھیلنے کی عام اجازت تھی۔ ہر کہیں بدکاری کا دَور دورہ تھا۔ بشپ اپنی بیٹیوں سے مُنہ کالا کرتے تھے۔

آس پاس قرب و جوار میں اپنے لونڈوں کو اعلےٰ مذہبی عہدے تفویض کرتے تھے۔"
لیکی تاریخِ اخلاق یورپ میں لکھتا ہے۔

"یہ امر باعث حیرت نہیں ہے کہ اپنے مذہبی عہد و پیمان کو توڑنے کے بعد پادری ایسی زندگی گذارنے لگے جو عادی گناہ کی زندگی تھی۔ وہ فسق و فجور میں عام دُنیاداروں سے بھی بازی لے گئے۔ ہمیں اخلاق پستی کی ایسی اِکّا دُکا مثالوں پر زور نہیں دینا چاہیے جیسے پوپ جان XXIII کی مثال جس پر دوسرے جرائم کے علاوہ زنا اور اباحتِ نسواں کا الزام بھی لگایا گیا تھا یا کنٹر بری میں ولی آگسٹائن کے منتخب ایبٹ کی مثال جس کے متعلق تفتیش پر معلوم ہوا کہ صرف ایک ہی گاؤں میں اُس کے سترہ حرامی بچے تھے یا ہنری سوم لیژ کی مثال جسے ۱۲۷۴ء میں اپنے عہدے سے ہٹا دیا گیا کیوں کہ اُس کے ۶۵ ناجائز بچے تھے لیکن کلیسیا کے اہلِ قلم اور کلیسیائی مجالس کی شہادت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جس میں داشتائیں رکھنے سے کہیں زیادہ بھیانک معاصی کا ثبوت مِلتا ہے...... ازمنۂ وسطیٰ کے اہلِ قلم نے تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ راہبات کے اقامت خانے قحبہ خانے بن گئے تھے اور اُن کی چار دیواری میں سیکڑوں حرامی بچوں کو جان سے مار دیا جاتا تھا۔ پادریوں میں محرمات کے ساتھ معاشقے کرنے کا رواج عام تھا جس کے باعث بار بار ایسے احکام جاری کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ پادریوں کو اپنی ماؤں بہنوں کے ساتھ مِل کر نہیں رہنا چاہیے۔ سدومیت جس کے استیصال کو عیسائیت کی ایک نمایاں خدمت سمجھا جاتا تھا راہبوں کے یہاں باقی و برقرار تھی۔ اصلاح کلیسا کی تحریک سے کچھ عرصہ پیشتر یہ شکایات زور پکڑ گئی تھیں کہ اعتراف گاہوں کو بدکاری کے اڈے بنا دیا گیا تھا۔"

چاسر، ربے لے، والٹیر، دساد، مولیئر وغیرہ نے پادریوں کی ریاکاری اور ہوس ناکی کے پردے

بڑی بے رحمی سے چاک کئے ہیں۔ شہزادی مارگریٹ دلوار نے لکھا کہ پادری روپے پیسے کو ہاتھ تک نہیں لگاتے لیکن عورتوں کی رانیں ٹٹولنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔ جو عورتیں اعتراف گناہ کے لئے گرجا کو جاتی تھیں وہ اکثر و بیشتر پادریوں کی ہوسناکی کی شکار ہو جاتی تھیں۔ جب صلیبی سورماؤں کے لشکر ارض مقدس کو روانہ ہوئے تو ہزاروں کسبیاں اُن میں شامل ہو گئیں۔ پادری اُن کے اس مذہبی جذبے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ پادریوں کی ریاکاری ہمہ گیر صورت اختیار کر گئی۔ ہسپانیہ کے باشندے مذہبی جوش و خروش کے لئے مشہور ہیں لیکن اُن کی ریاکاری اور ظاہر داری بھی ضرب المثل ہے۔ کسانوا لکھتا ہے کہ ہسپانوی عورت یا کسبی اپنے کسی آشنا سے ہمکنار ہونے سے پہلے مریم عذرا یا یسوع مسیح کی تصویر پر چادر ڈال دیتی ہے۔ ایک کسبی کے ہاں سبت (اتوار) کے دن اس کا آشنا آیا اور کپڑے اُتارتے ہوئے سیٹی بجانے لگا۔ کسبی نے غضبناک ہو کر اُسے دھتکار دیا اور کہا کہ میں ایک ایسے شخص کے ساتھ خلوت میں نہیں جاؤں گی جو سبت کے مقدس دن کی توہین سیٹی بجا کر کرتا ہے۔ یہی حال برہمنوں کا تھا وہ دیوداسیوں سے بلا تکلف تمتع کرتے تھے اور اسے اپنا حق جانتے تھے۔ وہ کم سِن دیوداسیوں سے کھلم کھلا جنسی ملاپ کرتے تھے۔ پنڈت واتسیان نے کام شاستر بڑھاپے میں لکھی تھی جب وہ سنیاس کی حالت میں بنارس میں مقیم تھا اور سمادھی اور گیان دھیان میں غرق رہتا تھا۔ اس پر بھی اپنی کتاب میں غیر عورتوں کو پھانسنے کی ترکیبیں لکھی ہیں مثلاً کہتا ہے کہ راجہ کا دل کسی حسینہ پر آ جائے تو وہ اُس کے شوہر کو غداری اور جاسوسی کے الزام میں قید کر کے اُس عورت کو اپنے تصرف میں لا سکتا ہے۔ تیورنیرا اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ کھمبایت کے نواح میں ایک گاؤں تھا جس کے مندر پر بوڑھی نائکائیں نو عمر لڑکیوں کو خرید کر بھینٹ کرتی تھیں۔ اس چڑھاوے کو نیکی سمجھا جاتا تھا۔ ابادلوا کے بقول تیروپتی کے مندر میں بانجھ پن کے علاج کے لئے عورتیں شب باش ہوتی تھیں۔ صبح سویرے وہ پروہت سے گذشتہ شب کا ماجرا کہہ سُناتیں تو وہ کہتا "دھنباد! تو کتنی بھاگوان ہے دیوتا خود تیرے پاس آیا تھا۔"

۱؎ HEPTAMERON

۲؎ MEMOIRS

ایک صبح راجہ جے سنگھ کی رانی بنارس کے بڑے مندر میں پوجا کے لئے گئی۔ وہاں کے ہوس پرست اور نڈر پروہت نے جبراً اُس کی عصمت دری کی۔ رانی نے واپس آکر راجہ سے اس کا ذکر کیا جے سنگھ نے اورنگ زیب عالمگیر سے شکایت کی شہنشاہ نے اس قضیئے کو جے سنگھ ہی کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ راجہ غضبناک تو تھا ہی اُس نے مندر کو منہدم کروا دیا اور وہاں کے تمام پروہتوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔[1] ہمارے ہاں کے فارسی اور اُردو شعراء نے مشائخ کی ہوس پرستی کا خاکہ اُڑایا ہے۔ تصوف تنزل پذیر ہوگیا تو خانقاہیں فسق و فجور کا مرکز بن گئیں۔ مشائخ عشق مجازی کے نام پر اُمردوں سے معاشقے کرنے لگے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ سدومیت کو علت المشائخ کہا جانے لگا۔ مولانا روم نے اپنی مثنوی میں اس نوع کے ریاکار اور نفس پرست مشائخ پر جا بجا بھرپور طنز کیا ہے۔ مُلا عبدالقادر[2] نے لکھا ہے کہ ایک دن اُس نے ایک درگاہ میں ایک معشوق سے مُنہ کالا کیا۔ مُلا کی بدقسمتی سے معشوق کے عزیزوں کو اِس بات کی خبر ہوگئی۔ وہ تلواریں سونت کر جائے واردات پر پہنچ گئے اور مُلا کو شدید زخمی کر دیا۔ مُلا اپنی اِس قبیح حرکت کے جواز میں کہتا ہے کہ انسان نے کچا دودھ پیا ہے اِس لئے اُس سے لغزش ہو ہی جاتی ہے۔ مُلا کی ریاکاری ملاحظہ ہو کہ وہ دوسروں کو معمولی لغزشوں پر بھی سخت سُست کہتا ہے۔

ازلی گُناہ کا تصور پال ولی نے پیش کیا تھا۔ اُس کا استدلال یہ تھا کہ آدم کے گُناہ کے ساتھ ہی اُس کی تمام اولاد گُناہ میں ملوث ہوگئی ہے اس لئے مسیح مُنجی کی شفاعت ہی انسان کی نجات کا باعث ہو سکتی ہے۔ اُس نے جنسی ملاپ جیسے فطری عمل کو سراسر ناپاک قرار دیا ہے۔ کہتا ہے "جن کی بیویاں ہیں وہ ایسے رہیں گویا اُن کی کوئی بیویاں نہیں ہیں۔"

چنانچہ عیسائیوں کے ایک فرقے ابی لائٹ کے مرد ننھی مُنی لڑکیوں سے اور عورتیں خوردسال بچوں سے نکاح کرتی تھیں تاکہ جنسی ملاپ سے بچ جائیں۔ آگسٹائن ولی نے ازلی گُناہ کی تشریح کرتے

---

[1] کہا جاتا ہے کہ بنارس کی چار چیزیں خطرناک ہیں ؎ رانڈ، سانڈ، سیڑھی، سنیاسی ان سے بچے جو سیوے کاسی

[2] منتخب التواریخ

ہوئے کہا کہ آدم کا گناہ ہمیں ورثے میں ملا ہے اور ہم سب آدم کے گناہ کے ذمّہ دار ہیں۔ اِس لئے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ جنسی خواہش فی نفسہٖ مذموم اور شر آمیز ہے اور اسے کچل دینا انسب ہے۔ اس منفی اور سلبی عقیدے نے لوگوں کو حسن و جمال اور دُنیا کی تمام رعنائیوں اور دلچسپیوں سے جو جنسی خواہش سے وابستہ ہیں صرفِ نظر کرنے کی دعوت دی اور انسان کو افسردگی اور یاسیت کے حوالے کر دیا۔ یاد رہے کہ آگسٹائن ابتدائے عمر میں مانی کا پیرو رہ چکا تھا اور مانی بُدھ سے متاثر تھا۔ بُدھ نے کہا تھا کہ بچے پیدا کرنا ظلم ہے کیوں کہ وہ پیدا ہوتے ہی جنم چکّر میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور دکھ بھوگتے ہیں چنانچہ مانی نے بھی جنس کو تمام آلام و مصائب کا سبب قرار دیا اور اپنے پیرووں کو بدھ کی طرح مجرّد رہنے کی تلقین کی۔ آگسٹائن نے ازلی گناہ کو جنسی ملاپ سے وابستہ کر دیا اور کہا کہ جنسی ملاپ سے ازلی گناہ بچے میں سرائیت کر جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مرد کا عورت سے جنسی ملاپ ــــ منکوحہ یا غیر منکوحہ سے ــــ گناہ ہے۔ پوپ گریگوری نے اس پر صاد کیا اور یہ عقیدہ کلیسائے روم کے شعائر میں داخل ہو گیا۔ مسیحی زُہّاد عورت کو شیطان کا آلۂ کار سمجھنے لگے اور اُس کی ترغیب و کشش سے بچنے کے لئے صحراؤں اور پہاڑوں کا رُخ کیا۔ اُن کے خیال میں عورت غولِ بیابانی ہے جو صداقت کی جستجو کرنے والوں کو راہِ راست سے بھٹکا دیتی ہے۔ زمانے کے گذرنے کے ساتھ یہ عقیدہ عیسائیوں کے مزاجِ عقلی میں نفوذ کر گیا چنانچہ آج جنسی آزادی کے باوجود گناہ کی یہ اُلجھن عیسائیوں کو پریشان کر رہی ہے۔ بہر کیف آگسٹائن کے خیالات کی اشاعت سے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ جنسی ملاپ کو ترک کر دینے سے انسان اس دنیا میں مسرّت اور آخرت میں نجات کو پا لیتا ہے۔ جنسی خواہش کی قہرمانی سے بچنے کے لئے کئی راہبوں نے اعضائے تناسل قطع کرا دیئے۔ اوریجن نے اپنے آپ کو آختہ کر لیا۔ راہب ابیلارڈ اور راہبہ ہیلوسے کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہ ایک دوسرے سے والہانہ عشق کرتے تھے۔ اُن کے عشقیّہ خطوط شائع ہو چکے ہیں اور دُنیائے ادب کا قیمتی سرمایہ سمجھے جاتے ہیں۔ ابیلارڈ ایک مدت تک اپنی حسین محبوبہ ہیلوسے سے تمتّع کرتا رہا اور بقولِ خود اس دوران میں اُس نے ہوس رانی کا کوئی پہلو نہ چھوڑا۔

آخر احساس گناہ کی شدت اور پشیمانی کے عالم میں اپنے اعضائے تناسل قطع کرا دیئے اور یوں اس گناہ کا کفارہ ادا کیا۔ دور جدید میں شوپنہائر مانوی تھا۔ اُس کے خیال میں شر کائنات کا مایۂ خمیر ہے۔ اُس نے جنسی ملاپ کو جرم قرار دیا اور کہا کہ جنسی ملاپ کے بعد جو افسردگی ہم سب محسوس کرتے ہیں وہ ارتکاب جرم کے بعد کا احساس ندامت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کے تمام دُکھ درد کا ایک ہی مداوا ہے اور وہ یہ ہے کہ جنسی ملاپ کو ترک کر کے نسل انسانی کا خاتمہ کر دیا جائے۔

فرانسس دلی کے پیروؤں نے گناہ کا ایک نیا فلسفہ پیش کیا جس کا مشہور ترجمان روس کا ایک راہب راسپوٹین تھا۔ راسپوٹین نے پہلی عالمگیر جنگ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ وہ زارینۂ روس کے دل و دماغ پر پوری طرح حاوی تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ جرمنوں کا جاسوس ہے۔ وہ گناہ کے راستے نجات کی تبلیغ کرتا تھا۔ اُس کے خیال میں جو لوگ زہد و اتقا کی زندگی بسر کرتے ہیں وہ عام انسانوں سے بالاتر ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُس کا استدلال یہ تھا کہ انسان کا تکبر اُس کی نجات کے راستے میں حائل ہوتا ہے۔ تکبر پر احساس ندامت ہی سے جو ارتکاب گناہ کے بعد لاحق ہوتا ہے قابو پایا جا سکتا ہے۔ گناہ عاجزی اور انکسار سکھاتا ہے جو نجات کے لئے ضروری ہے۔ خداوند کے حضور نادم ہونے سے اُس کی رحمت کو تحریک ہوتی ہے اور گناہ کے بغیر ندامت محسوس نہیں ہوتی لہٰذا حصول نجات کے لیے گناہ کرنا ضروری ہے۔ دوسرے الفاظ میں توبہ خدا کو محبوب ہے، توبہ کے بغیر نجات نہیں ہو سکتی، گناہ کے بغیر توبہ نہیں کی جا سکتی اس لئے گناہ کرنا لازم ہے چنانچہ راسپوٹین دن رات گناہ میں غرق رہتا تھا۔ جرمنی کے اشراقی صوفی مائسٹر اکہارٹ کا قول ہے۔

"گناہ کے بغیر رُوح میں پختگی نہیں آ سکتی نہ روحانی اُفق میں وسعت پیدا ہو سکتی ہے اس لئے خدا اُنہیں لوگوں پر گناہ کا بوجھ رکھتا ہے جنہیں اُس نے کسی اعلیٰ مقصد کے لیے منتخب کیا ہو۔"

دوستوفسکی نے بھی فلسفۂ گناہ اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ اُس کا عقیدہ یہ تھا کہ گناہ اور توبہ سے

انسان خدا کا قرب حاصل کر لیتا ہے اور خدا گنہگاروں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے چنانچہ اُس کے ناولوں کے کردار گناہ کا ارتکاب اِس لئے کرتے ہیں کہ بعد میں اُنہیں پشیمانی کا احساس ہو جو اُن کی رُوحانی سربلندی کا سبب بن جائے۔ لُوتھر کا قول ہے۔

"جی بھر کر گناہ کرو۔ خدا صرف گناہِ کبیرہ کو معاف کرتا ہے۔"

گناہ اور نجات کے بارے میں ہمارے یہاں کے ملامتیہ سعید اسرمد، شاہ حسین، بلّھے شاہ وغیرہ کا نقطہ نظر بھی یہی تھا۔

جنسی ملاپ اور عورت کے بارے میں کلیسیائے رُوم کے غیر فطرتی اور مریضانہ تصوّر کے اثرات راہبوں اور راہبات کی زندگیوں پر بڑے ناخوشگوار اور ضرر رساں ہوئے کیوں کہ تجرّد سے جنسی خواہش پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ راہب پہاڑوں کی کھوہوں میں بھی عورت کے خیال سے نجات نہ پا سکے۔ جنسی ترغیبات سے بچنے کے لئے وہ کٹھن ریاضتوں سے کام لیتے، مُراقبے میں غرق رہتے اور فاقے کیا کرتے۔ وہ اِس حقیقت سے بے خبر تھے کہ جنسی خواہش کو جتنی سختی سے دبایا جائے یہ اُتنی ہی شدّت سے اُبھر آتی ہے چنانچہ کئی راہب اپنے حواس کھو بیٹھے۔ نوجوان مُقدّس کنواریوں نے جنابِ مسیح کو اپنا دولھا تصوّر کر لیا اور پُرجوش انداز میں اُن سے اظہارِ عشق کرنے لگیں۔ ایک مسیحی ولی میتھوڈیس نے کہا تھا۔

"ایک پاکباز دوشیزہ کی رُوح یسوع مسیح کی دلہن ہے۔"

پھر کیا تھا۔ 'مسیح کی دُلہن' کی ترکیب میں طلسماتی کشش پیدا ہو گئی اور جنسی پہلو سے فاقہ زدہ کنواریاں والہانہ شیفتگی سے آسمانی دولہا سے اظہارِ عشق کرنے لگیں اور اپنے وجود کو اُس کے وجود میں کھو دینے کے خواب دیکھنے لگیں۔ ولیہ ترلیسا جنابِ مسیح کو مخاطب کر کے کہتی ہے۔

"تیرے عشق کے طفیل میں یہاں، اِس دُنیا میں تیرے بغیر زندہ ہوں۔ میری التجا ہے کہ تُو میرے رگ و پے میں عشق کی آگ لگا دے۔ مجھے اِس امر کا اِذن دے کہ میں اپنی شُعلہ پرور تمنّا کے ساتھ تیرے دل میں سما جاؤں، تیرے عشق میں فنا ہو جاؤں۔"

ولیہ ترلیسا ڈی سپیڈا کاسٹیل کے ایک رئیس کی بیٹی تھی۔ وہ بچپن ہی میں رومانی تصورات میں کھوئی رہتی تھی۔ دس برس کی ہو کر اُس نے ترکِ دُنیا کر کے راہبہ بننے کا عزم کیا۔ چار برس کے بعد وہ جوان ہوئی تو حسن و جمال کی پُتلی بن گئی۔ وہ کھیل کود کی رسیا تھی اور ہنسی چہلوں میں اپنا وقت گذارتی تھی۔ نوجوان اُس میں دلچسپی لینے لگے۔ وہ ایک خوبرو نوجوان کو دل دے بیٹھی اور اُسے ملاقات کا وقت دیا۔ اُس کے باپ کو اِس بات کا علم ہوا تو اُس نے ترلیسا کو خانقاہ میں داخل کرا دیا جہاں اُسے بڑی کوفت محسوس ہوئی۔ اِس زمانے میں وہ بیمار پڑ گئی۔ طویل علالت کے بعد اُس کی صحت تو بحال ہو گئی لیکن شباب کا ولولہ جاتا رہا۔ اُسے ہسٹریا اور مرگی کے دورے بھی پڑنے لگے۔ اِس دوران میں اُس پر فالج گرا اور وہ فرلیش ہو گئی۔ تین برس کے بعد ایک صبح یک لخت اُسے محسوس ہوا کہ وہ تو بھلی چنگی ہے اور بستر سے اُٹھ کر چلنے پھرنے لگی۔ لوگوں نے اِسے ترلیسا کی کرامت پر محمول کیا اور دور دور سے اُسکی زیارت کو آنے لگے۔ وہ اِس خیال سے پریشان ہو جاتی کہ جب کبھی وہ کسی نوجوان کو دیکھے اُس کے رگ و پے میں مسرّت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ایک دن وہ ایک نوجوان سے جسے وہ چاہنے لگی تھی باتیں کر رہی تھی کہ معاً اُسے محسوس ہوا کہ جیسے یسوع مسیح اُس نوجوان کے پہلو میں کھڑے ہیں وہ مدہوشی کے عالم میں گر پڑی اور اُسے اُٹھا کر اندر لے گئے۔ ایک مکاشفے میں اُس نے دیکھا کہ اُس کی رُوح جسم سے جُدا ہو کر آسمان کی جانب پرواز کر گئی ہے اور وہ یسوع مسیح کی باتیں سن رہی ہے۔ ایک دن اُس نے

> "ایک نہایت خوبصورت فرشتے کو دیکھا جس نے میرے دل میں ایک لمبا سونے کا تیر جس کے سرے پر آگ لگی ہوئی تھی بھونک دیا اور وہ اُسے بار بار گھنگھولتا رہا حتیٰ کہ وہ تیر میری انتڑیوں تک پہنچ گیا۔ مجھے اِس قدر شدید درد محسوس ہوا کہ میں زور زور سے کراہنے لگی لیکن وہ تیر اتنا لذت بخش تھا کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ اُسے باہر نکالے۔ اِس سے بڑھ کر آسودگی مجھے اپنی زندگی میں کبھی بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ جب فرشتے نے وہ تیر باہر نکالا اور چلا گیا تو میں خداوند

لہ DURANT WILL.: THE REFORMATION.

کے عشق میں سراپا جل رہی تھی۔"

اس مکاشفے کے نفس پرور علائم صاف عیاں ہیں۔ ولیہ ترلیسا کا ذکر کرتے ہوئے بے اختیار ذہن میراں کی جانب منتقل ہو جاتا ہے جس نے اپنے بھجنوں میں کرشن سے اظہار عشق کیا ہے۔ ایک بھجن میں کہتی ہے

" اے ماں! کرشن نے اپنی صفات سے جن کا گیت میں گاتی ہوں میری روح
کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔
اے ماں! اُس کے پریم کا تیر میرے جسم کے اندر پیوست ہو گیا ہے۔"

میراں رتن سنگھ راٹھور والی میرانا کی لڑکی تھی۔ وہ ۱۵۰۲ء میں پیدا ہوئی جسے کرشن چودھری لکھتے ہیں[1]

" محل کے سامنے سے ایک برات گذر گئی۔ رانیاں اور بچے دریچوں میں سے جھانک کر تماشا دیکھنے لگے۔ برات گذر گئی تو مہارانی کرشن کی مُورتی کی پُوجا کرنے چلیں کمسن راجکماری میراں بھی ساتھ تھی۔ اُس نے پوچھا " ماں! میرا دُولہا کون ہے" ماں نے ہنسی ہنسی میں کرشن کی مورتی کی طرف اشارہ کیا اور کہا " تیرا دُولہا گردھر گوپال ہے۔" راجکماری نے نئی بیاہی ہوئی دلہن کی طرح مورتی کے سامنے اپنے مُنہ پر کپڑا اوڑھ لیا اور اُسی دن سے کرشن کو اپنا دُولہا سمجھنے لگی۔ بچپن کی یہ شوخی جوانی میں عشق بلاخیز کی صورت اختیار کر گئی۔ میراں کا بیاہ کنور بھوج مہاراج سے ہوا جو رانا سانگا والئی چتوڑ کا لڑکا تھا۔ سُسرال والے دُرگا پُوجا کرتے تھے۔ میراں کرشن کی مُورتی ساتھ لے گئی جس سے سُسرال والے خفا ہو گئے۔ میراں کا شوہر تخت نشینی سے پہلے ہی مرگیا اور اُس کا دیور گدّی پر بیٹھا۔ اُس نے میراں کو کرشن بھگتی سے روکا تو وہ چتوڑ چھوڑ کر بھاگ گئی اور رام داس کی چیلی بن گئی۔ اِس کے بعد وہ برندابن اور دوارکا کی یاترا کو چلی گئی۔ وہاں کرشن کی مُورتی سے

---

[1] میراں کے گیت

لپٹ کر جاں بحق ہوئی ۔ اُس کی محبت دیوانگی کی حد کو پہنچ گئی تھی اور وہ کرشن کا
نام لے لے کر اُس کی مورتی کے سامنے ناچتی گاتی رہتی تھی ۔"

میراں نے اپنے بھجنوں میں کرشن سے نہایت پُرجوش انداز میں اظہارِ عشق کیا ہے ۔ وہ بار بار مختلف
پیرائیوں میں کرشن سے مواصلت کی آرزو کرتی ہے ۔ ایک بھجن میں کہتی ہے ۔

" کرشن نے تیر مارا جو میرے آر پار نکل گیا ۔ برہ کا بھالا میرے اندر لگا اور تمام جسم بے چین
ہوگیا ۔
دُنیا کی شرم ، خاندان کی عزت کا خیال نہیں رکھوں گی ۔ پیا کے پلنگ پر جا لیٹوں گی اور
ہری کے رنگ میں رنگ جاؤں گی ۔"

ترلیسا و لیہ کے مراقبات اور میراں کے بھجنوں میں منحرف جنسی خواہش پوری شدت سے ظاہر ہو گئی
ہے[1] ۔ ژُنگ نے ایک عورت کا مکاشفہ بیان کیا ہے جس کے جنسی علائم اِس ضمن میں قابلِ غور ہیں

" میں پہاڑ پر چڑھی اور ایک جگہ پہنچی جہاں میں نے اپنے سامنے ، دائیں بائیں
اور پیچھے سات سُرخ رنگ کے پتھر دیکھے ۔ میں اِس مستطیل کے درمیان کھڑی
ہوگئی ۔ پتھر زینوں کی طرح چپٹے تھے ۔ میں نے اُن چار پتھروں کو اُٹھانے کی
کوشش کی جو میرے قریب تھے ۔ ایسا کرتے ہوئے مجھے معلوم ہوا کہ پتھر اُن چار
دیوتاؤں کے کھڑے ہونے کی جگہیں ہیں جو سر سے نیچے پاؤں اُوپر زمین میں مدفون
تھے ۔ میں نے کھود کر اُنہیں باہر نکالا اور اپنے اِرد گرد کھڑا کر دیا ۔ معاً وہ ایک
دوسرے کی جانب جُھکے اور اُن کے سر ایک دوسرے سے چھونے لگے اور میرے
سر کے اوپر خیمہ سا بن گیا ۔ میں زمین پر لیٹ گئی اور کہا " میں تھک گئی ہوں ،
آؤ مجھ پر گر جاؤ ۔" دیکھتی کیا ہوں کہ چاروں دیوتاؤں کو شُعلے کے ایک چکر نے
گھیرے میں لے لیا ۔ کچھ دیر کے بعد میں اُٹھ کھڑی ہوئی اور دیوتاؤں کے مجسّموں کو

---

[1] TWO ESSAYS ON ANALYTICAL PSYCHOLOGY.

زمین پر لڑھکا دیا جس جگہ وہ گرے وہاں چار درخت اُگ آئے۔ شُعلے کے چکّر سے نیلے رنگ کے شُعلے لپکے اور درختوں کی پتّیوں کو جھلس دیا۔ یہ دیکھ کر میں نے کہا "اِس چیز کو ختم ہو جانا چاہیے۔ مجھے شعلوں میں گھس جانا چاہیے تاکہ پتّے جل جانے سے بچ جائیں" پھر میں آگ میں گھس گئی، درخت غائب ہو گئے، آگ کا چکّر ایک بہت بڑے نیلے شعلے میں بدل گیا اور مجھے زمین سے اُٹھا کر اوُپر لے گیا"

جنسی ترغیبات سے بچنے کے لئے کلیسائے رُوم نے ازمنۂ وسطیٰ میں نہانے دھونے پر پابندی عائد کر دی تھی۔ خیال یہ تھا کہ جسم کو صاف ستھرا رکھنے سے نفسانی خواہش بھڑک اُٹھتی ہے۔ غلاظت کی تعریف کی جاتی تھی اور جسم کی بدبُو کو "تقدّس کی خوشبو" کہتے تھے۔ ولیۂ پالا کا قول ہے "جسم اور کپڑوں کی صفائی کا مطلب ہے رُوح کی آلائش"۔ جُوؤں کو "خُدا کے موتی" کہا جاتا تھا۔ خیال یہ تھا کہ جس شخص کے بدن میں جتنی زیادہ جوئیں ہوں اتنا ہی زیادہ وہ مقدّس ہوتا ہے۔

جذبۂ مذہبیت اور صوفیانہ احساس کے ساتھ غیر معمولی تُند و تیز جنسی خواہش کے تعلق کا ذکر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر فارستھ کے خیال میں تصوّف منحرف جذبۂ جنس کا دوسرا نام ہے۔ وہ کہتا ہے، "یہ بات قابلِ غور ہے کہ صوفیہ اپنے آپ پر وجد و حال کی کیفیت طاری کرنے کے لئے جنسی خواہش کو دبانے کی تلقین کیا کرتے ہیں[1]

"خُدا سے رابطہ قائم کرنے کے لئے صوفی کئی نفسیاتی مراحل سے گذرتا ہے۔ آخری مرحلہ وارفتگی اور جلوۂ محبوبِ حقیقی کا ہوتا ہے جس میں ایک صوفی شدید جذباتی ہیجان محسوس کرتا ہے اور وجد و حال کے عالم میں دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں وہ عشّاق کی زبان میں بات کرتا ہے اور رُوحانی وصل اور عروسی کا حوالہ دیتا ہے۔ جنسی خواہش کے جوش و خروش اور اس کیفیّت میں واضح مماثلت پائی جاتی ہے۔ نقطۂ عروج کو پہنچ کر موضوع اور معروض کی دُوئی

---

[1] PSYCHOLOGY AND RELIGION.

مٹ جاتی ہے اور سب کچھ مٹ مٹا کر ایک ہو جاتا ہے۔"

تجرّد اور زاویہ نشینی سے اُن کے تخیل پر عورت کا تصور مسلط ہو جاتا ہے اور جس خواہش کی تسکین وہ روزمرّہ کی زندگی میں نہیں کر سکتے اس کی تشفی وہ عالمِ خیال میں کر لیتے ہیں۔ ہیویلاک ایلس نے لکھا ہے کہ صوفیانہ بے خودی اور جنسی جذبے کی از خود رفتگی میں گہرا ربط و تعلق ہے۔ کرافٹ ایبنگ نے جنسی خواہش اور مذہبی تقدس کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے مسیحی اولیاء کی ترغیباتِ جنسی کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ مذہبیت اور جنسی جذبے کے ہیجان میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ولیہ ترلیسا کے 'لذت بخش عذاب' میں جنسی جذبہ مشمول ہے۔ اُس کے خیال میں جنسی جذبے کو دبا دیا جائے تو انسان کے دل میں بے پناہ توانائی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے جذبۂ مذہبیت سیراب ہوتا ہے۔ فریبِ نفس[1] سے بحث کرتے ہوئے فرائڈ نے اس کے جنسی عوامل کی طرف توجہ دلائی ہے اور ڈاکٹر شریبر کی مثال دیتے ہوئے کہا ہے[2]

"ڈاکٹر شریبر کا فریبِ نفس مذہبی اور صوفیانہ رنگ اختیار کر گیا۔ وہ کہتا ہے کہ "مجھے خدا سے بلا واسطہ تعلق ہے، مجھے شیطان نے اپنا کھلونا بنا رکھا ہے، مجھے معجزانہ پیکر دکھائی دیتے ہیں، میں مقدس راگ سنتا ہوں" بالآخر اُسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ وہ کسی اور ہی عالم میں رہتا ہے۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ خدا کی زوجہ ہے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے "میرے جسم کے اندر کچھ ایسی تبدیلی واقع ہوئی جیسی کہ مریم عذرا کو مسیح کے استقرارِ حمل سے ہوئی تھی یعنی ایسی باکرہ کو جو اچھوتی تھی، دو مختلف مواقع پر میرے اعضائے تناسلیہ زنانہ ہو گئے اگرچہ وہ پوری طرح عورتوں کے جیسے نہیں تھے اور میں نے اپنے بدن میں جنبش محسوس کی جو عورتیں جنین کی حرکت سے محسوس کرتی ہیں۔"

جنسیات کے طلبہ ایذا کوشی اور ایذا طلبی کو بھی مذہبیت اور جنس میں قدرِ مشترک مانتے ہیں اور

---

[1] PARANOIA [2] COLLECTED PAPERS VOL.3.

کہتے ہیں کہ مختلف مذاہب کے پیروؤں نے ایک دوسرے پر بے پناہ ظلم توڑے ہیں۔ ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں نے معمولی اختلاف کی بنا پر اپنے مخالفین کو قتل کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کیا۔ یورپ کی مذہبی لڑائیوں میں اور جادوگرنیوں اور یہودیوں کے قتل عام میں نہایت درجے سفاکی سے کام لیا گیا۔ احتساب کلیسیا والوں نے عقیدے کے اختلاف کے بہانے بے شمار بے گناہ مرد عورتوں کو روح فرسا عذاب دے دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ انہیں شکنجوں میں کس کر ان کے جسم کی ہڈیاں چور چور کی گئیں، زبانیں گدی سے کھینچ لی گئیں، آگ کے الاؤ میں جھونک دیا گیا، آگ میں تپائی ہوئی کنگھیوں سے گوشت کو ہڈیوں سے جدا کیا گیا۔ ولی سائرل کے حکم سے سکندریہ کی فلسفی خاتون ہائی پیشیا کو پادریوں نے سرِ بازار قتل کیا اور اس کا انگ انگ کاٹ کر آگ میں پھینک دیا گیا ہائی پیشیا کا جرم محض یہ تھا کہ وہ فلسفے کا درس دیتی تھی۔ بے شمار علم دوست لوگوں کو مطالعۂ کتب کے جرم میں قید کیا گیا۔ ہندوؤں نے شودروں پر بے پناہ ستم توڑے اور انہیں وحوش کی پستیوں تک گرا کر دم لیا۔ اہل مذہب کی ایذا طلبی کا ثبوت ان ریاضتوں سے بھی ملتا ہے جو مسیحی راہب، ہندو یوگی اور بعض صوفیہ کرتے رہے ہیں۔ کیلوں کے بستر پر لیٹنا، کھوپڑوں سے پانی پینا، اتنا عرصہ ایک ہی جگہ کھڑے رہنا کہ ہاتھ پاؤں سوکھ کر ٹھنٹھ ہو جائیں، عمر بھر غسل نہ کرنا، رات رات بھر دریا میں کھڑے ہو کر منتر پڑھنا، اپنے آپ کو کوڑے مار مار کر لہولہان کر لینا، اپنے آپ کو آختہ کر لینا، بالوں کا کھردرا لباس پہننا، غلاظت میں لتھڑے رہنا، چلّے کاٹنا، بیس بیس برس کھوہوں میں اور مناروں کی چوٹیوں پر گذار دینا یہ سب اعمال ایذا طلبی کی نشان دہی کرتے ہیں۔

جنسی انحرافات

جنسی انحرافات[1] سے مُراد ہے جنسی خواہش کی تسکین کے لیے ایسا طریقہ اختیار کرنا جو طبعی معمول سے مختلف ہو اور جو اپنی انتہائی صُورت میں جنسی ملاپ کا بدل بن جائے۔ تحلیل نفسی کے علماء کہتے ہیں کہ ہر شخص میں جنسی انحراف کے ممکنات پائے جاتے ہیں[2]۔ جنسی پہلو سے ایک صحت مند شخص اور ایک مریض کے مابین فرق کرنا مشکل ہے۔ جو لوگ جنسی لحاظ سے بظاہر نارمل دکھائی دیتے ہیں اُن میں بھی انحراف کا میلان موجود ہوتا ہے۔ فرائڈ کہتا ہے کہ نارمل اور منحرف جنسیت دونوں کا سرچشمہ شیر خوارگی کے دَور کی جنسی زندگی ہوتی ہے اور انحرافات دورِ طفلی ہی کی باقیات ہیں جن سے آدمی بلوغت کے بعد دوبارہ آشنا ہوتا ہے۔ جنسی انحراف کے چار پہلو ہیں۔

(۱) حظِ نفس کی خاطر جنسی معمولات سے ہٹ کر نئے نئے طریقے اختیار کرنا۔ بعض لوگ طبعاً نارمل ہوتے ہیں لیکن تیس چالیس برس کی عُمر کے درمیان نئے جنسی تجربات کرنے لگتے ہیں کیوں کہ شباب کا جوش و خروش ختم ہو جانے کے بعد اُنہیں طبعی طریقوں سے حسبِ دلخواہ تشفّی نہیں ہوتی۔ "میری مخفی زندگی" کا مصنّف بتلاتا ہے کہ وہ پینتیس برس کی عُمر کے بعد جنسی انحراف کی جانب مائل ہوا تھا۔ کسانوا کے سوانحِ حیات سے بھی اِس بات کا ثبوت ملتا ہے۔

(۲) بوڑھے عیاش جن کی زندگی کا واحد مقصد نفسانی لذت کا حصول ہوتا ہے از کار رفتہ ہو کر انحرافات سے رجوع لاتے ہیں۔

(۳) کچھ لوگ جنسی کوتاہ ہمتی کے باعث احساس کہتری میں مُبتلا ہو جاتے ہیں اور اِس کی تلافی کے

---

[1] SEXUAL DEVIATION رواں صدی تک اسے SEXUAL PERVERSION کہا جاتا تھا جس کا مطلب ہے جنسی کجروی۔ [2] اصطلاح میں اسے POLYMORPHICALLY PERVERSE کہتے ہیں۔

لئے جنسی انحراف کا دامن تھام لیتے ہیں۔ اُنہیں اپنی قوت رجولیت پر اعتماد نہیں ہوتا اور عورت سے خوف کھاتے ہیں۔

۴۔ بعض لوگ لاشعوری جبر کے تحت جنسی انحرافات میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور جنسی ملاپ سے گریز کرتے ہیں۔ انہی لوگوں کو صحیح معنوں میں جنسی انحراف کے خبطی کہا جا سکتا ہے۔

یاد رہے کہ جنسی انحراف کے خبطی اکثر و بیشتر طبقۂ اُمراء سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ فکرِ معاش سے آزاد ہوتے ہیں اس لئے فراغت کے اوقات میں عیش کوشی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں اور جب عیاشی کے معروف طریقوں سے اکتا جاتے ہیں تو انحراف کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ غریبوں کو فکرِ معاش اس قدر پریشان کرتی ہے کہ وہ اس نوع کے روگ پالنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے اور جنسی لحاظ سے صحت مند زندگی گذارتے ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جنسی انحرافات حضرتِ انسان سے خاص ہیں۔ حیوانات میں ان کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ قدماء بھی جنسی انحرافات سے آگاہ تھے۔ یونانیوں اور رومیوں کی تالیفات میں ان کا ذکر آیا ہے۔ جنسیات کی دنیا میں سب سے پہلے کرافٹ ایبنگ[۱] نے جنسی انحرافات پر تحقیق کے انداز میں قلم اُٹھایا۔ پاؤلو منیٹاگزا کی کتاب جنسی کجرویاں، بھی اس ضمن میں قابلِ ذکر ہے۔ فرائڈ، ہیویلاک ایلس اور سرش فیلڈ نے بھی اس موضوع پر تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ اس باب میں ہم چند عامۃ الورود انحرافات کا ذکر کریں گے۔

ایذا کوشی[۲]

اس کا مطلب ہے فریقِ ثانی کو اذیت دے کر جنسی حظ محسوس کرنا۔ یہ ترکیب موریلو دتور نے فرانس کے ایک رئیس مارکی دوناتن الفانسے دساد کے نام پر وضع کی تھی۔ دساد ۱۷۴۰ء میں پیرس میں پیدا ہوا، جوان ہو کر فوج میں بھرتی ہو گیا اور ہفت سالہ جنگ میں لڑتا رہا جہاں اُس نے بربریت اور سفاکی کے خوفناک مناظر دیکھے۔ پچیس برس کی عمر میں شادی کی جو ناکام ثابت ہوئی۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد اُس کی ساس نے حکام سے ساز باز کر کے اُسے گرفتار کرا

۱۔ اس کی مشہور کتاب ہے PSYCHOPATHIA SEXUALIS

۲۔ SADISM

دیا کیوں کہ دساد نے ایک کسبی روز کیلر کو اُس کے ہاتھ پاؤں جکڑ کر کوڑے مارے تھے۔ اُس کے یہاں عیش کوشی کی خفیہ مجالس برپا ہوتی تھیں جن میں عورتیں اور مرد فسق و فجور کے شرمناک مظاہرے کرتے تھے۔ اس قسم کی ایک محفل میں اُس نے کسبیوں اور مہمانوں کو ایک زہریلی چیز کنتھریڈیس کھانے میں ملا کر کھلا دی جس سے دو آدمی جاں بحق ہو گئے۔ دساد پکڑا گیا اور اُسے تیرہ برس کی سزا دی گئی۔ قید تنہائی میں اپنے جذبۂ ایذا کوشی کی تسکین عالم تخیل میں کرتے ہوئے اس نے قصے لکھنا شروع کئے جو بعد میں دس جلدوں میں شائع ہوئے۔ اُس کے دو ناول جسٹن اور جولیٹ فحش نگاری کے شاہ کار سمجھے جاتے ہیں۔ ان ناولوں میں اُس نے ایذا کوشی کے پردے میں اپنے 'شیطانی فلسفہ' اور 'شیطانی اخلاق' کی تبلیغ کی ہے۔ اُس نے عجیب و غریب دلیلوں اور تاویلوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس دنیا میں نیکی کرنا حماقت ہے اور نیک آدمی ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہے۔ بد اور خبیث ترقی کرتے ہیں اور ہر قسم کی لذات سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ کہتا ہے کہ اہل مذہب ریاکار، نفس پرست، زہد فروش دنیادار ہوتے ہیں جو اپنے مکروہ عزائم کو مذہب کے لبادے میں چھپاتے ہیں۔ جسٹن میں اُس نے پادریوں کی ہوس کاری کا نقشہ کھینچا ہے۔ دساد پکا ملحد تھا۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کائنات کا خالق نہیں ہے بلکہ خود ذہن انسانی کی مخلوق ہے اور ذہن انسانی سے علاحدہ اُس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ انقلاب فرانس کے بعد اُسے باستیل کی جیل سے رہا کر دیا گیا۔ اُس نے اپنی کتاب میں نپولین کو پیش کیں جس نے اُسے پاگل خانے بھجوا دیا جہاں وہ دسمبر ۱۸۱۴ء میں مر گیا۔

دساد نے اپنے قصوں میں ایذا کوشی کی جو مثالیں دی ہیں وہ معاصر معاشرے ہی سے لی گئی ہیں۔ اُس کی قبیل کے اُمرا کسبیوں کے بدن میں نشتر چبھو کر اور ان کی رگیں کاٹ کر محظوظ ہوا کرتے تھے۔ ۱۸ ویں صدی کے انگلستان اور فرانس میں قحبہ خانوں میں کوڑے مارنے اور کھانے کا رواج عام تھا۔ کوڑے جنسی خواہش کو برانگیختہ کرنے کے لئے مارے یا کھائے جاتے تھے۔ دساد کا نظریہ یہ تھا کہ کوڑے مارنے پر عورت کو مامور ہونا چاہیے کیوں کہ وہ مرد سے بڑھ کر ایذا کوش ہوتی ہے اور اُس

لے ORGIES

میں رحم وکرم کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔قحبہ خانوں میں جو عورتیں کوڑے مارنے اور دوسرے عذاب دینے کی ماہر ہوتی تھیں اُنہیں گورنس کہتے تھے۔ ایک ایذا کوش عورت نے کہا "میرا جی چاہتا ہے کہ ایک خوبصورت شائستہ مرد میرے قدموں میں لوٹ رہا ہو، میری ہر بات مانے، میں اُسے جی بھر کر گالیاں دوں اور اُسے خوب پیٹوں۔" اِس نظریے کی رُو سے مرد پر حکومت کرنے کی خواہش ہر عورت میں ہوتی ہے۔ اس ضمن میں چاسر کی ایک حکایت بیان کی جاتی ہے۔ ایک ملکہ نے اپنے ایک سردار سے کہا مجھے یہ بتاؤ کہ عورت کی عزیز ترین خواہش کیا ہے۔ دس دن تک تم کوئی شافی جواب نہ دے سکے تو تمہارا سر قلم کر دیا جائے گا۔ سردار پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر ایک بڑھیا نے اُسے کہا، ملکہ سے جا کر کہو کہ عورت کی عزیز ترین خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے شوہر یا عاشق پر حکومت کرے۔

وانڈا نے اپنے شوہر ساخر میزوخ سے ـــــ اِس کا ذکر آگے آئے گا ـــــ نکاح کا یہ معاہدہ کیا تھا۔

"ـــــ میرے غلام! وہ شرائط جن کی بنا پر میں تمہیں بطور ایک غلام کے قبول کرتی ہوں، درج ذیل ہیں۔

تم اپنے آپ کو کامل طور پر میرے سپرد کرتے ہو۔ تمہاری اپنی کوئی مرضی نہیں ہے، میری مرضی ہی تمہاری مرضی ہوگی۔

تم میرے ہاتھوں میں ایک بے جان آلۂ کار ہو اور میرے تمام احکام کی بے چوں و چرا تعمیل کرو گے۔ اگر تم بھول جاؤ کہ تم میرے غلام ہو اور میری کامل اطاعت میں کوتاہی کرو گے تو میں تمہیں سزا دینے کی مجاز ہوں گی اور جیسے چاہوں گی سزا دوں گی۔ میں تمہیں کوئی حظ یا مسرت بخشوں تو یہ میرا کرم ہو گا اور تمہیں یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ یہ میرا احسان ہے۔ مجھ پر تمہارا اِس قسم کا کوئی حق نہ ہو گا۔ میں تم پر سخت ترین تشدد کرنے کی مجاز ہوں جو تمہیں بغیر شکایت کے برداشت کرنا ہو گا۔ اگر میرے پاس دولت ہو اور اس کے باوجود تمہیں بھوکا رکھوں اور تمہیں اپنے پیروں تلے کچل دوں تو بھی تمہیں بغیر پس و پیش کے میرے پیروں کو چومنا ہو گا۔ میں تمہیں کسی وقت بھی گھر سے نکال سکتی ہوں لیکن تمہیں میری رضامندی کے بغیر باہر جانے کی اجازت نہیں ہو گی اور تم نے بھاگ نکلنے کی کوشش کی تو مجھے اِس بات کا اختیار ہو گا کہ تمہیں ہر طریقے سے عذاب دے کر جان سے

ماڈرون ۔

میرے سوا تمہارا کچھ بھی نہیں ہے۔ میں ہی تمہاری سب کچھ ہوں، تمہاری زندگی ہوں، تمہارا مستقبل ہوں، تمہاری خوشی ہوں، تمہاری شامت ہوں۔ تمہاری مسرت ہوں، تمہارا غم ہوں، تمہیں میرے احکام کی تعمیل کرنا ہوگی۔ اس کا نتیجہ اچھا نکلے یا برا۔ اگر میں تمہیں کہوں کہ کسی جرم کا ارتکاب کرو تو تمہیں میری رضامندی کے لیے جرم کرنا ہوگا۔ تمہاری عزت میری ملک ہے۔ تمہارا خون، تمہاری روح، تمہاری توانائی سب کچھ میرا ہی ہے، میں تمہاری زندگی اور موت پر پوری طرح متصرف ہوں۔ اگر تمہیں کبھی اس امر کا احساس ہو کہ تم میری حکومت کو برداشت نہیں کر سکتے اور یہ زنجیریں تمہارے لئے بہت زیادہ بوجھل ہو گئی ہیں تب تمہیں خودکشی کرنے کا اختیار ہوگا۔ میں تمہیں کبھی بھی رہا نہیں کروں گی‘‘

دستخط وانڈا فان دوناجیو

اس معاہدے پر دستخط کرتے ہوئے ساخر میزوخ نے لکھا

’’میں اپنی عزت و وقار کے نام پر عہد کرتا ہوں کہ میں مادام وانڈا فان دوناجیو کا غلام ہوں بالکل اُس مفہوم میں جو کہ مندرجہ بالا سطور سے مستفاد ہوتا ہے اور میں برضا و رغبت اُس کی ہر خواہش کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔

دستخط ڈاکٹر لیوپولڈ بیرن خان ساخر میزوخ

روما کی ایک ملکہ تھیوڈورا نے ایذا کوشی کا ایک عجیب طریقہ وضع کیا تھا۔ وہ ایک شخص پر فریفتہ تھی لیکن اُسے اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیتی تھی اور اپنے محبوب کے سامنے دوسرے مردوں سے اختلاط کرتی تھی۔ کالی گولا قیصر روم جب کسی عورت سے ہم کنار ہوتا تو ملاعبت کرتے ہوئے کہا کرتا ’’میں منہ سے ایک کلمہ نکالوں تو یہ مرمریں گردن اپنی تن سے جدا ہو جائے۔‘‘ جیمز دوم شاہ انگلستان ایذا کوش تھا اور اپنی ملکہ میری آف موڈینہ کو تخلئے میں بید مارا کرتا تھا۔ ہنگری کے کونٹ نداسدی کی بیگم خونی باتھوری نے چھ سو جوان لڑکیوں کو قتل کرایا تھا۔ وہ اپنے شباب کو بحال رکھنے کے لئے اُن کے خون میں نہایا کرتی تھی۔

۱۸ ویں صدی میں انگلستان کے اُمراء کی زندگیاں فسق و فجور اور ایذا کوشی کے بدترین نمونے

تھیں۔ بید زنی اور ازالۂ بکارت کا شوق جنون کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اور یہ عادت انگریزوں کی قومی خصوصیات میں شمار ہوتی تھیں۔ باکرہ لڑکیوں کے حصول پر بے دریغ روپیہ صرف کیا جاتا تھا اور بید کھانے کے لئے قحبہ خانے کی گورنس کو خطیر رقوم معاوضے میں دی جاتی تھیں۔ آج کل بھی یورپ میں قحبہ خانوں میں عذاب خانے موجود ہیں جن میں سرپرستوں کو ننگے بدن پر بید مارے جاتے ہیں یا مختلف طریقوں سے اذیت دی جاتی ہے۔ اِن میں قبرستان کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے کسبیاں کفن پہن کر قبر میں لیٹ جاتی ہیں جہاں ایذا کوش اُن سے تمتع کرتے ہیں۔

ایک عالم نفسیات برڈاخ نے کہا ہے کہ ایذا کوشی طبعی طور پر جنسی ملاپ میں مشمول ہے اور حظِ نفسانی اور اذیت کے امتزاج ہی سے جنسی جبلت ترکیب پاتی ہے۔ کلیوپٹرا کہتی ہے [1]

"موت کی ضرب عاشق کی چٹکی کی طرح ہے کہ تکلیف بھی دیتی ہے اور مرغوب بھی ہوتی ہے۔"

ایسے واقعات بھی مشاہدے میں آئے ہیں کہ مرد نے اختلاط کے عالم میں حظِ نفسانی کے نقطۂ عروج کو پہنچ کر فریق ثانی کا گلا گھونٹ کر اُسے ہلاک کر دیا۔ [2] ڈاکٹر فارستھ نے جنس اور مذہب کے تعلق اور جذبۂ مذہبیت میں ایذا کوشی اور ایذا طلبی سے بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ مختلف مذاہب کے پیروؤں اور ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں نے معمولی اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے پر بے پناہ ظلم توڑے ہیں۔ یورپ کی مذہبی لڑائیوں اور یہودیوں اور جادوگرنیوں کے قتل عام میں درندگی کے مظاہرے کئے گئے۔ احتساب کلیسا والوں نے عقائد کے اختلاف پر اپنے ہم مذہبوں کو روح فرسا عذاب دیئے۔ اُنہیں شکنجوں میں کس کر اُن کی ہڈیاں چور چور کی گئیں، زبانیں گدی سے کھینچ لی گئیں، آگ میں جلایا گیا، لوہے کی آگ میں تپائی ہوئی کنگھیوں سے اُن کا گوشت پوست ہڈیوں سے جُدا کیا گیا۔ ہندوؤں نے بودھوں پر خوفناک مظالم ڈھائے اور شودروں کو طرح طرح کے عذاب دیئے۔ مختلف مذاہب کے دوزخوں میں بھی ایذا کوشی کا عنصر موجود ہے مثلاً زبان کو کھینچ کر گردن کے پیچھے سے نکالنا، ناخنوں کو چھریوں سے چھیل کر گوشت سے الگ کرنا، درندوں سے پھڑوانا، سانپوں سے ڈسوانا، آدمی کو لکڑی کے آرے سے چیرنا، بدن کے سوراخوں میں

[1] ANTONY CLEOPATRA [2] NECROSADISM

انگارے بھرنا، آنکھوں میں سوئیاں چبھونا، پیپ اور خون کے سمندر میں غوطے دینا وغیرہ۔ شکار اور خونی کھیل تماشوں میں بھی ایذا کوشی کا میلان پایا جاتا ہے۔ روما میں قیاصرہ اور اُمراء کو محظوظ کرنے کے لئے سُورما اکھاڑے میں اُترتے تھے اور ایک دوسرے کو بے دریغ تہ تیغ کرتے تھے، عیسائیوں کو درندوں سے پھڑوایا جاتا تھا، ٹکٹکی سے باندھ کر اور کپڑوں پر تیل چھڑک کر مشعل کی طرح جلایا جاتا تھا۔ ان اکھاڑوں کے قریب ہی قحبہ خانے ہوتے تھے۔ تماشائی خونریزی کے یہ مناظر دیکھ کر ان قحبہ خانوں کا رُخ کرتے تھے کیوں کہ بہتا ہوا خون دیکھ کر اُن کی نفسانی خواہش کو اشتعال ہوتی تھی۔ آج کل بھی فلموں میں جنس اور خونریزی کے امتزاج سے موضوع لئے جاتے ہیں جس سے تماشائیوں کی ایذا کوشی کی تسکین کی جاتی ہے۔ دُنیائے ادب میں ایڈگر ایلن پو، بادلیئر، دانتزیو، جارج ساں وغیرہ کے قصوں میں ایذا کوشی کے مناظر ملتے ہیں۔ ان میں حسین نوخیز لڑکیوں کے قتل کے واردات مزے لے لے کر بیان کئے جاتے ہیں۔

ایذا طلبی [1]

جنسی نفسیات کی اصطلاح میں ایذا طلب اُس شخص کو کہتے ہیں جو جسمانی اذیت اُٹھا کر نفسانی حظ محسوس کرتا ہے۔ میزوخیت کی ترکیب پروفیسر کرافٹ ایبنگ نے آسٹریا کے ایک ممتاز قانون دان اور ناول نگار لیوپولڈ فان ساخر میزوخ کے نام پر وضع کی تھی۔ ساخر میزوخ ۲۷ جنوری ۱۸۳۶ء کو لیمبرگ میں پیدا ہوا۔ وہ نہایت ذہین و فطین تھا۔ اُس نے قانون میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ جس کسی عورت سے اُس کا معاشقہ ہوتا، وہ اُس سے فرمائش کیا کرتا کہ وہ اُس کے ننگے بدن پر چابک مارے اور ہر طرح سے اُس کی توہین و تذلیل کرے۔ اُس نے تلاش کر کے ایک ایذا کوش عورت وانڈا سے نکاح کیا۔ وانڈا اُس کے ننگے بدن پر کیل جڑی ہوئی قمچیاں مارا کرتی تھی جس سے وہ لہولہان ہو جاتا تھا۔ وہ اپنا خون بہتا دیکھ کر بڑا محظوظ ہوتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اس جسمانی عذاب سے اُس کی نفسانی خواہش کی تشفی بھی ہو جاتی ہے اور تخلیق ادب کی تحریک بھی ہوتی ہے۔ ایک دن میزوخ نے اپنی بیوی وانڈا سے کہا کہ وہ اُس کے ایک دوست کے پاس خلوت میں جائے۔ وانڈا نے اُسے لعنت ملامت کی لیکن وہ بار بار التجا کرتا رہا۔ آخر وانڈا رضامند ہو گئی تو میزوخ نے اُسے اپنے دوست کے پاس بھیجنے سے پہلے وانڈا کے ہار سنگھار میں اُس کا ہاتھ بٹایا اور جب وہ چلی گئی تو وہ خوشی سے بے اختیار ناچنے اور

[1] MASOCHISM

تالیاں پیٹنے لگا۔ میزوخ کے مشہور ناول "سمور پوش زہرہ" میں ظالم اور سنگ دل ہیروئین اپنے عاشق کو دھوکا دے کر پھانس لیتی ہے اور اُس کی مُشکیں کسوا کر چابک مار مار کر اُس کی کھال اُدھیڑ دیتی ہے۔ اس ناول کی اشاعت کے بعد سمور اور چابک ایذا طلبی کے تمام قصوّں میں بار پا گئے۔ میزوخ کے معاشقے شہزادی لوگڈ ے نوف اور بیگم ریزن شتائن سے بھی ہوئے۔ وہ اُن سے بھی کوڑے کھایا کرتا تھا۔

برنہاڈ برلینر جنسی اور اخلاقی ایذا طلبی کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"میزوفیت (ایذا طلبی) کا مطلب ہے ایسے شخص سے پیار کرنا جو پیار کرنے والے سے نفرت اور بدسلوکی کرتا ہو۔ جنسی ایذا طلبی بھی عام طور سے ایک ایسی عورت میں موجود ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں چابک ہو جسے وہ جنسی خواہش کی تسکین کے لئے استعمال کرتی ہو یا اِس نوع کا تصوّر موجود ہو۔ بعض اوقات اِس مقصد کے لئے کسی کسبی کی خدمات مستعار لی جاتی ہیں تاکہ وہ عاشق کے تخیلات کو عملی جامہ پہنا سکے۔ اُس کے ہاتھ سے چابک کھا کر آدمی اپنے آپ کو ایک شریر بچہ یا غُلام تصوّر کر لیتا ہے جس سے اُس کی جنسی تسکین ہو جاتی ہے۔ اخلاقی ایذا طلبی میں جنسی عنصر نہیں ہوتا۔ اِس میں بقول فرائڈ اذیت سے غرض ہوتی ہے خواہ اذیت دینے والا کوئی بھی ہو۔ فرائڈ کہتا ہے کہ ممکن ہے یہ اذیتّ غیر شخصی قوتوں یا حالات سے پہنچے لیکن ایک سچا ایذا طلب ہمیشہ اپنا گال آگے کر دیتا ہے جب کوئی ہاتھ اُسے مارنے کے لئے اُٹھتا ہے۔"

عیسائیت کو ایذا طلبی کا مذہب کہا گیا ہے۔ ڈاکٹر فارستھ کے بقول ایذا طلبی کا ثبوت اُن ریاضتوں سے ملتا ہے جو راہب، لوگی اور صوفی کیا کرتے ہیں۔ کیلوں کے بستر پر لیٹنا، کھوپڑی سے پانی پینا، ایک جگہ کھڑے رہنا حتیٰ کہ ہاتھ پاؤں سوکھ کر ٹھنڈے ہو جائیں، غسل نہ کرنا، دریا کے پانی میں ساری ساری رات کھڑے ہو کر منتر جپنا، اپنے آپ کو کوڑے مارنا، اپنے آپ کو آختہ کر لینا، غلاظت میں لتھڑے رہنا، بالوں کا لباس پہننا ایذا طلبی ہی کی مختلف صُورتیں ہیں۔ فرائڈ کا ایذا طلبی کا نظریہ یہ ہے کہ اِنسان کے بُطون میں دو لاشعوری قوتیں برسرِ پیکار ہیں، زندگی کی جبلتّ اور موت کی جبلتّ۔ موت کی جبلتّ فنا پر آمادہ کرتی ہے جب

اس میں جنسی خواہش مشمول ہو تو جنسی ایذا طلبی کی نمود ہوتی ہے۔ ہرش فیلڈ نے ایذا طلبی کے چار پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ (۱) اپنی توہین و تذلیل کی خواہش (۲) محبوبہ سے پٹتے وقت اپنے آپ کو بچہ محسوس کرنے کی آرزو، بید مارنے والی عورت کو اپنی ماں کا بدل سمجھ لینا۔ (۳) محبوبہ کے ہاتھوں حیوان بننے کی تمنا۔ پیرس، لندن، نیویارک کے قحبہ خانوں میں پیشہ ور نائکہ کے پاس لگامیں، کُتّے کے پٹے، چابک، بید، قمچیاں، زنجیریں موجود رہتی ہیں۔ کوئی شخص کتا یا گھوڑا بننا چاہے تو اُس پر زین کَس دی جاتی ہے یا گلے میں پٹہ ڈال دیا جاتا ہے۔ (۴) محبوبہ کے ہاتھوں میں ایک بے جان شے بننے کی خواہش مثلاً سٹول بن جانا جس پر محبوبہ بیٹھ سکے، صوفہ بن کر لیٹ جانا تاکہ وہ اُس پر آرام کر سکے۔ ہرش فیلڈ حسد کو ایذا طلبی ہی کی ایک صورت قرار دیتا ہے اور طویل بحث کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ایذا طلبی حسد کا مرکزی نقطہ ہے۔ ایذا طلب دو قسم کے ہوتے ہیں۔

(۱) جو ایک خوبصورت عورت کے ہاتھوں سے بید کھاتے ہیں۔ اُنہیں آج کل کے مغربی قحبہ خانوں میں آہنی حلقوں میں جکڑ دیا جاتا ہے اور اُن کے ہاتھ پاؤں باندھ دیتے ہیں۔ پھر کسبیاں اُن کے ننگے بدن پر زور زور سے بید مارتی ہیں۔ بعض ایذا طلب چاہتے ہیں کہ اُنہیں چھت سے لٹکی ہوئی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے، پھر اُن کے بدن پر خار دار کوڑے برسائے جائیں۔ ۱۹ ویں صدی میں مسز بارکلے نے لندن میں ایک عذاب خانہ کھول رکھا تھا جہاں ایذا طلب نوجوان کسبیوں سے بید کھا کھا کر حظ اندوز ہوتے تھے۔ اُس کے یہاں ایک کَل موجود تھی جسے بارکلے کا گھوڑا کہا جاتا تھا۔ اس میں ایذا طلبوں کو جکڑ کر اُنہیں کوڑے مارتے تھے۔ یاد رہے کہ اِس نوع کے قحبہ خانوں کے سرپرست ہمیشہ اُمراء و روساء ہوتے ہیں۔ عیاشی کی زندگی ان کے اعضاء کو مضمحل اور اعصاب کو ماؤف کر دیتی ہے اور وہ اپنی کوتاہ ہمتی کا مداوا اِس قسم کے قحبہ خانوں میں تلاش کرتے ہیں۔ مولانا رومؒ نے کہا تھا ؏ در مخنّث حرص سُوئے پس رود۔ اِن لوگوں کی نفسانی خواہش سرینوں اور رانوں میں چلی جاتی ہے جن پر بے تحاشا کوڑے کھا کر وہ حظِ نفسانی محسوس کرتے ہیں۔ اس شوق پر وہ ہزاروں روپے خرچ کرتے ہیں۔ ایک فوجی افسر نے جو ایذا طلب تھا اپنی محبوبہ کو خط میں لکھا "میری کرم فرما! غلام دو زانو ہو کر نہایت عاجزی سے اُس چابک کو بوسہ دیتا ہے جو

آپ نے نہایت بے رحمی سے میرے ننگے بدن پر برسایا تھا۔ جانِ من! اب آپ جسمانی اور اخلاقی پہلوؤں سے اپنے اِس غلام کو انتہائی ذلیل کیجیے۔ مجھے اپنے غیظ و غضب کا نشانہ بنائیے۔ میں بالکل بے بس ہو چکا ہوں، مجھے قطعی بے بس بنا دیجیے، میں آپ کی مرضی پوری کروں گا۔ میری ملکہ! اپنے غلام پر ظلم ڈھاؤ، اُسے جسمانی و ذہنی عذاب دو، اُسے شدید اذیت پہنچاؤ تاکہ اِس سے آپ کو دلی خوشی محسوس ہو۔ مجھے زنجیروں میں جکڑ دیجیے تاکہ آپ کا غلام ہل نہ سکے اور پھر بے رحمی سے اُسے چابک ماریئے۔ میری کراہیں آپ کو محظوظ کریں گی۔ اِس بے رحمی سے آپ محظوظ ہوں گی۔ مجھے اپنی لونڈی کی طرح ذلیل کیجیے، مجھے ظاہری طور سے بھی مردانگی سے محروم کر دیجیے، مجھے زنانہ لباس پہنائیے، مجھے اپنے زیر جامے میں جکڑ دیجیے، مجھے میرے گناہوں کی سزا دیجیے، مجھے اپنی محبوبہ کے نرم ریشمیں کپڑوں میں ملبوس گرم گرم بدن کا تصوّر لرزا دیتا ہے۔ میں عورت میں مردانگی کو دیکھ کر خوشی سے دیوانہ ہو جاتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اپنی محبوبہ کو چُست ریشمیں جُرابوں میں دیکھوں جو مرد پہنتے ہیں۔ میں یقیناً آؤں گا اور اپنی محبوبہ کے قدم چُوموں گا۔" آپ کا غُلام

ایک ایذا طلب عذاب خانے کی نائکہ کو لکھتا ہے "۱۔ مجھے گھوڑے (عذاب دینے کا چوبی آلہ) کے ساتھ زنجیروں میں جکڑ دیا جائے، زنجیریں میں خود لاؤں گا۔ ۲۔ اپنے خون کے پہلے قطرے کے لئے جو تم بہاؤ گی میں تمہیں ایک پونڈ دوں گا۔ ۳۔ تین پونڈ اگر میرا خُون بہہ کر میرے ٹخنوں تک پہنچ جائے۔ ۴۔ چار پونڈ اگر میرے پاؤں کی ایڑیاں خُون سے تر بتر ہو جائیں۔ ۵۔ پانچ پونڈ اگر میرا خُون فرش پر بہہ نکلے۔ ۶۔ چھ پاونڈ اگر تم مجھے مار مار کر بیہوش کر دو۔"

عشقیہ شاعری میں ایذا طلبی کا موضوع کثرت و تواتر سے ملتا ہے۔ عُشّاق اپنے آپ کو اپنی محبوبہ کے سامنے حقیر و صغیر محسوس کرتے ہیں اور اُس کے ہاتھوں طرح طرح سے ذلیل ہو کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ میر تقی میر کے دیوان اِس نوع کے اشعار سے بھرے پڑے ہیں ؎

کیا کیا عجز کریں ہیں لیکن پیش نہیں کچھ جاتا میر
سر گڑیں ہیں آنکھیں ملے ہیں اُس کے خاکِ پا ہم

جب دیکھتے ہیں پاؤں ہی ڈالو ہو اُس کے میر
کیوں ہوتے ہو ذلیل تم اتنا تو مت دبو

کیا بد بلا ہے لاگ بھی دل کی کہ میر جی
دامن سوار لڑکوں کے ہو کر لفر رہے

نرگسیت[1]

یہ اصطلاح پی نیک نے یونان قدیم کے ایک صنمیاتی کردار نرسی سس (لغوی معنیٰ ہے نرگس کا پھول) کے نام پر وضع کی تھی۔ نرسی سس دریا کے دیوتا سیفی سس کا بیٹا تھا اور نہایت حسین و جمیل تھا۔ ایک دن ایک جنگل میں سے گذرتے ہوئے وہاں کی ایک پری ایکو اُس پر فریفتہ ہو گئی اور والہانہ انداز میں اُس سے اظہارِ محبت کیا لیکن نرسی سس جو اپنے حُسن کے غرور میں مست تھا ملتفت نہ ہوا۔ اتنے میں اُسے پیاس لگی۔ وہ ایک چشمے کے کنارے جُھک کر پانی پینے لگا تو پانی میں اپنے ہی عکس پر فریفتہ ہو گیا۔ وہ عرصے تک اپنے حُسن کے نظارے میں محو و بے خود چشمے کے کنارے لیٹا رہا حتّٰی کہ دیوتاؤں نے اُسے نرگس کے پھول میں تبدیل کر دیا۔ چنانچہ نرگس کا پھول یونانی اور ایرانی شاعری میں چشمِ حیراں کی علامت بن گیا۔ جنسیات کی اصطلاح میں جو شخص اپنے ہی حُسن و جمال پر عاشق ہو اُسے نرگسیت کا مریض سمجھا جاتا ہے۔ وہ اپنی ہی ذات سے جنسی حظ اخذ کرتا ہے۔ نرگسیت انا ہی کی صورت ہے جس میں جنسی جبلّت مشمول ہے۔ ہیولاک ایلس نے لکھا ہے[2]

"سیجر کے خیال میں نرگسیت نارمل ہے۔ صرف اس کی انتہائی صورت نفسیاتی علالت کی نشاندہی کرتی ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی حد تک اپنے آپ کو حسین سمجھتا ہے اور اپنی ذات سے پیار کرتا ہے البتّہ انانیت اور نرگسیت میں فرق کرنا ضروری ہے۔ موخر الذکر کا ماخذ اپنے ہی حُسن کا مبالغہ آمیز احساس ہے۔ نرگسیت میں بچگانہ عنصر موجود ہوتا ہے۔"[3]

جو شخص نرگسیت میں مبتلا ہو وہ نفسیاتی اور ذہنی لحاظ سے بالغ نہیں ہوتا۔ وہ ایک لاڈلے بچے کی طرح

---

[1] NARCISSISM
[2] AUTOMENO SEXUAL
[3] PSYCHOLOGY OF SEX. VOL. 3.

ہر بات کو ذاتی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ اُس شخص کو پسند کرتا ہے جو ہر بات میں اُس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہے اور ہمہ وقت اُس کی تعریف پر کمربستہ رہے اکثر فنکار نرگسیت میں مبتلا ہوتے ہیں اور اپنی تعریف سُننے سے کبھی سیر نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات خود اپنی مدح و ستائش کرنے لگتے ہیں۔ رومتہ الکبریٰ کا ایک تمثیل نگار پلاٹس اپنے ایک ناٹک مائلو گلوریوسس میں ایک رئیس زادے کا ذکر کرتا ہے۔ جسے اپنے حسن پر بڑا ناز ہے اور جسے اُس کا ملازم بے وقوف بناتا رہتا ہے۔

"ملازم: کیا آپ نے اُن لڑکیوں کو دیکھا تھا جنھوں نے کل مجھے راستے میں روک لیا تھا'

آقا: کیا کہتی تھی وہ؟

ملازم: جب آپ گذرے تو وہ مجھ سے پوچھنے لگیں کیا یہ ایکلیس ہے جس نے دوبارہ جنم لیا ہے؟ میں نے جواب دیا نہیں یہ اُس کے بھائی ہیں۔ پھر کہنے لگیں کیسا خوبصورت جوان ہے، کتنا بارعب، کتنا شاندار! اِس کے بال کیسے حسین ہیں۔ پھر مجھ سے کہا کہ آج بھی آپ کو اُسی راستے سے چلوں تاکہ وہ آپ کو ایک نظر دیکھ سکیں'

آقا: اُف خوبصورت ہونا بھی کیا مصیبت ہے'

واجد علی شاہ اپنی محبوبہ اکلیل محل سے فرمائش کرتے ہیں کہ اپنی داستانِ عشق کسی شاعر سے کہے اور پھر مثنوی کی صورت میں لکھوا کر انہیں بھیجے۔[1]

"دیکھو تمہیں خدا کی قسم میری اِس فرمائش کو بھول نہ جانا، حسب الایما میرے عمل میں لانا کس واسطے کہ یہ شاعر نایاب ہے، دُرِّ خوش آب ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تمہارے عشق کا مزا اُس کی زبانی سنوں، وجد میں آ آ کر مزا اُٹھاؤں، سر دھنوں، کچھ بات نہیں کچھ ایسی بڑی کرامات نہیں، ہماری خوشی اُس کا کام ہوگا تمہارے عشق اور حسن کا تا قیامت نام ہوگا۔"

عورتوں کی نرگسیت میں آئینے کو اہم مقام حاصل ہے۔ سیمون دبوا نے نوجوان لڑکیوں کی نفسیات سے

---

[1] تاریخ ممتاز

بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ خوبصورت لڑکیاں آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے حُسن و جمال کے نظارے سے لُطف اندوز ہوتی ہیں اور پہلو بدل بدل کر اپنے مُتناسب برہنہ جسم کو مختلف زاویوں سے دیکھ دیکھ کر پھُولی نہیں سماتیں۔ آندرے تریدون لکھتا ہے[1]

"جو عورت نرگسیت میں مُبتلا ہو اُس کا بہترین رفیق آئینہ ہوتا ہے۔ وہ قدِآدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر مختلف زاویوں سے اپنے جسم کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی ہیں اور اپنے عکس کو چُومتی ہیں۔ کئی عورتیں اپنا عکس دیکھ کر باآوازِ بلند کہتی ہیں " اُف میں میں کس قدر حسین ہوں!" مادام متردسکی کہا کرتی تھیں۔ میں خود اپنی دیوی ہوں، اپنے آپ کو پوجتی ہوں، اپنے آپ سے عشق کرتی ہوں۔ اس قسم کی عورتوں کو ایکٹرس بننے کا شوق ہوتا ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بن سکیں۔"

ایک عرب شاعر الشنفری کہتا ہے ؎

فَدَقَّتْ وَجَلَّتْ وَاسْبَكَرَّتْ وَاُكْمِلَتْ ۔۔۔ فَلَوْ جُنَّ اِنْسَانٌ مِنَ الْحُسْنِ جُنَّتِ

(اُس کے ابرو، کمر اور ناک پتلی ہے، اُس کی دونوں پنڈلیاں اور کولہے بڑے ہیں اور بال سیاہ ہیں۔ اگر کوئی انسان اپنے ہی حسن کی وجہ سے دیوانہ ہوا ہوتا تو یہ ہوتی)

نرگسیت کا مریض کسی دوسرے شخص سے محبت کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ وہ اپنے آپ سے عشق کرتا ہے۔

؎ سودائے عشقِ غیر کہاں ہے بہ رنگِ گُل ۔۔۔ اپنے ہی حُسن پر میں گریباں دریدہ ہوں

اس کے باوجود وہ ہر شخص سے توقع کرتا ہے کہ وہ اُس سے عشق کرے گا۔ اُسے دوسروں کی بے اعتنائی پر بڑا دکھ ہوتا ہے۔ واجد علی شاہ لکھتے ہیں۔

"ان عورتوں کو اگر حضرت یوسف بھی مل جائیں تو اپنی بے وفائی کو نہ چھوڑیں، اس لئے ان سے دُور رہنا ہی مناسب ہے۔ مجھ جیسے بادشاہ صُورت سیرت میں یکتا جس کی تعریف میں کتابیں لکھی گئیں ہیں باوجود ناز برداریوں کے کچھ خوف نہ کریں تو

---

[1] PSYCHOANALYSIS & LOVE

دوسروں کے ساتھ کیا نہ کریں گی۔"

صائب تبریزی نے نرگسیت کے موضوع پر بے نظیر شعر کہا ہے ؎

تو لعبد آئینہ از دیدنِ خود سیر نہ ای   من بہ دو چشم ز دیدارِ تو چوں سیر شوم

نمائشیت[1] خود نمائی انسان کی معروف کمزوری ہے۔ سبھی لوگ اپنے جوہر اور خوبی کی نمائش کر کے خوش ہوتے ہیں اور اپنے کو دوسرے لوگوں سے مختلف اور ممتاز ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ جنسیات کی اصطلاح میں نمائشیت صنفِ مخالف کے سامنے ستر کھول کر جنسی حظ اٹھانے کا نام ہے یعنی ایسے مرد یا عورت کے سامنے ستر کھولنا جس کی طرف جنسی کشش محسوس ہو۔ عورتیں برہنہ سُرین دکھاتی ہیں اور مرد ستر کھول دیتے ہیں۔ اس کی مشہور مثال رُوسو کے اعترافات میں ملتی ہے۔ رُوسو لکھتا ہے کہ اوائل شباب میں ایک دن وہ ایک کوچے سے گذر رہا تھا جس میں ایک کنواں تھا۔ نوجوان لڑکیاں پانی بھرنے کنویں پر آرہی تھیں۔ رُوسو نے ایک طرف کھڑے ہو کر اُن کے سامنے ستر کھول دیا۔ اُن میں سے بعض نے شرما کر مُنہ پھیر لیا، بعض مسکرانے لگیں اور چند ایک بلند آواز میں اُسے گالیاں دینے لگیں۔ اُن کا شور و غل سن کر ایک راہگیر اُدھر متوجہ ہوا اور رُوسو کی جانب لپکا۔ رُوسو بھاگ نکلا مگر زبردست کا ٹھینگا سر پر پکڑا گیا۔ رُوسو نے مکر کیا اور پاگل بن گیا جس پر راہگیر نے معذور سمجھ کر اُسے چھوڑ دیا۔ نمائشیت کی ایک صورت یہ ہے کہ بعض پڑھے لکھے لوگ اپنے خود نوشت سوانحِ حیات میں صاف گوئی کے نام پر اپنے حقیقی یا فرضی معاشقوں اور معاصی کا کھلے بندوں اعتراف کرتے ہیں اور اِس پر فخر بھی کرتے ہیں کہ ؎

بازی پوشند و ما بر آفتاب افگندہ ایم

فرنیک ہیرس کی خودنوشت سوانح عُمری اِس کی مشہور مثال ہے۔

ہوسِ دید[2] یہ ایک خاص مردانہ انحراف ہے، عورتیں اِس سے مُبرّا ہوتی ہیں۔ اِس نوع کے مرد از کار رفتہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو جنسی ملاپ کرتے دیکھ دیکھ کر محظوظ

---

[1] EXHIBITIONISM   [2] VOYEURISM

ہوا کرتے ہیں عام طور سے یہ لوگ کسبیوں سے معاملہ طے کر لیتے ہیں اور کسی آدمی کو معاوضہ دے کر کسبی کے پاس لے جاتے ہیں۔ اس انحراف کے نام مدارج کے لحاظ سے مختلف رکھے گئے ہیں چھپ چھپ کر عورتوں کو کپڑے اتارتے ہوئے دیکھنا[1]، دوسروں کو جنسی ملاپ کرتے ہوئے دیکھنا[2]۔ ایسے لوگوں کو "جھانکنے والے ٹام" کہتے ہیں۔ نیلی فلمیں جن میں جنسی ملاپ کے مناظر دکھائے جاتے ہیں، ہوس دید کی تشفی کرنے کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ ابتدائی صورت میں یہ شوق ہر مرد میں ہوتا ہے لیکن جب ہوس دید ایک کوتاہ ہمت کے لئے جنسی ملاپ کا بدل بن جائے تو مریضانہ صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ لوگ بے ضرر ہوتے ہیں۔

جنسی عفریت[3] یونان قدیم کی دیومالا میں پہاڑوں، جنگلوں اور دریاؤں کے کناروں پر بسنے والی ایک عجیب و غریب مخلوق کو ساٹر کہتے تھے۔ ان کا بالائی دھڑ انسان کا اور نچلا دھڑ بکرے کا ہوتا تھا۔ یہ نہایت مغلوب الشہوت تھے اور ہر وقت جنگل کی دیبیوں کے پیچھے مارے مارے پھرتے تھے چنانچہ جو شخص غیر معمولی قوت کا مالک اور حد درجے مغلوب الشہوت ہو اُسے جنسی نفسیات کی زبان میں ساٹر کہتے ہیں جس کا ترجمہ ہم نے جنسی عفریت کیا ہے۔ جنسی عفریت مقاربت سے کبھی سیر نہیں ہوتا۔ انزال کے بعد بھی اُس کی توانائی بحال رہتی ہے[4]۔ محرور المزاج عصمت باختہ عورتیں ایسے مرد پہ جان چھڑکتی ہیں۔ جنسی عفریت کی علامتیں ہیں گٹھا ہوا جسم، گردن بہت موٹی کندھوں میں دھنسی ہوئی، پیشانی تنگ، قد کوتاہ، جسم پر بکثرت بال، کان نکیلے، آواز گہری ہوتی ہے۔ یہ شخص عورت کی طرف گھور کر دیکھتا ہے جس سے وہ بے چین ہو جاتی ہے۔ جنسی جرائم کرنے والے اشخاص اکثر و بیشتر جنسی عفریت ہوتے ہیں۔ ایسے مجرموں کو بعض مغربی ممالک میں آختہ کر دیا جاتا ہے۔ جنسی عفریت اپنی بیویوں کے لئے عذاب بن جاتے ہیں۔ شیخ نفزاوی نے 'زہرہ کی کہانی' میں ایک جنسی عفریت میمون کا ذکر

---

[1] SCOPOPHILIA

[2] MIXOSCOPY

[3] SATYR, SATYR BYRONIC

[4] اِس کیفیت مزاج کو SATYRIASIS کہتے ہیں۔ پروسٹیٹ گلینڈ بڑھ جانے سے سخت خزش ہو تو اسے PRIAPISM کہا جاتا ہے۔

آیا ہے جو صرف شہد، پیاز اور انڈا کھایا کرتا تھا۔ عرب غیر معمولی قوتِ رجولیت پر فخر کیا کرتے تھے۔
فرزدق کہتا ہے۔

دفنا التمیمی الذی قام ایرہ ثلاثین یوماً ثم زاد ھم عشرا

فلسفی برونو جسے احتساب کلیسا والوں نے آگ میں جھونک دیا تھا جنسی عفریت تھا۔ وہ خود کہتا ہے
"میرے اندر جنسی خواہش کی جو آگ بھڑکتی رہتی ہے اُسے کوہ قاف کی ساری برف بھی سرد نہیں کر سکتی۔"

فلسفی ابن سینا اسی زمرے سے تعلق رکھتا ہے۔ اُس کا شاگرد ابو عبیدہ جوزجانی کلیم کے سوانح میں لکھتا ہے کہ وہ ساری عمر کثرت مقاربت کا عادی رہا حتیٰ کہ آخری علالت میں جب اُسے مرض الموت نے گھیر لیا تھا وہ بلاناغہ لونڈیوں سے مقاربت کرتا رہا۔ لوئی پانزدہم شاہ فرانس کی یہی حالت تھی۔ اُس کی حسین داشتہ مادام پمپے دور اُس کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کی تاب نہ لا سکی۔ لوئی نے اپنے غلام لاداں کو جو عورتیں فراہم کرنے پر مامور تھا کہہ رکھا تھا "عورت کوئی بھی ہو کیسی بھی ہو لے آیا کرو۔ ہاں البتہ میرے پاس لانے سے پہلے اُسے حمام کرا لیا کرو اور دندان ساز کے پاس لے جایا کرو۔" اسی خبط میں آتشک میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ مشہور افسانہ نویس موپاساں ایک جنسی عفریت تھا۔ ایک دفعہ فلابیر نے اُس کے دعوے ماننے سے انکار کر دیا تو موپاساں شواہد ساتھ لے کر قحبہ خانے گیا اور ایک گھنٹے میں چھ بار مقاربت کر کے اپنا دعویٰ سچا کر دکھایا[1]۔ وہ بھی آتشک کی موت مرا۔ مادہ منویہ کے بکثرت اخراج سے اُس کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔ آج کل مغربی ممالک میں جنسی عفریتوں کو اصلاح خانوں میں پابند کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ جنسی جرائم کے ارتکاب سے باز رہیں۔

جنسی چڑیل

کہا جاتا ہے کہ ابوالہول ــــ چہرہ عورت کا بدن شیر کا ــــ اسی عورت کی علامت ہے۔ یونانی دیو مالا میں چشموں، باغوں اور درختوں کی دیبیوں کو نمف کہتے تھے جو دیوتاؤں اور انسانوں سے بے محابا اختلاط کیا کرتی تھیں۔ یولیسیز اپنے سفروں

---

[1] HARRIS, FRANK. : MY LIFE AND LOVES

کے دوران میں جزیرہ اوگیا جا پہنچا جہاں ایک نمف کیلپسو نامی رہتی تھی۔ اس کی یولیسیز سے مڈبھیڑ ہوئی تو وہ بولی "ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں آؤ تعارف کے لئے خلوت میں چلیں" وہ کئی برس اُس کے چنگل سے چھٹکارا نہ پا سکا۔ ہندو دیو مالا میں انہیں اپسرا کہتے ہیں جو اندرلوک میں رہتی ہیں اور دیوتاؤں اور گندھروں کا جی بہلاتی ہیں۔ کبھی کبھار انہیں خطرناک تپسویوں کو بہکانے کے لئے زمین پر بھیج دیا جاتا ہے۔ ایک جنسی چڑیل کی علامتیں ہیں رانیں اور سُرین غیر معمولی فربہ، سینہ اُبھرا ہوا، کمر موٹی، بازو نسبتاً دُبلے، قد چھوٹا، پیشانی تنگ، کنپٹیوں پر گھنے بال، آنکھوں میں سرخ ڈورے، رخساروں کی ہڈیاں قدرے اُبھری ہوئی، گردن کوتاہ، ایک جگہ چین سے نہیں بیٹھ سکتی، ہر وقت پہلو بدلتی رہتی ہے، مردوں کے سامنے اُس کا رنگ بدلتا رہتا ہے اور اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور گھور کر دیکھتی ہے، مقاربت سے کبھی سیر نہیں ہوتی۔ ایک عرب نے ایک عورت ہند بنت الحسن سے کہا

جمّت بين فخذيك لا تمل حفرها ولا يدري ك تعرها

جنسی چڑیل اور ہرجائی عورت میں فرق کرنا ضروری ہے۔ ہرجائی عورت کئی مردوں کی مطلوبہ ہوتی ہے لیکن اپنے آپ کو کسی کے سپرد نہیں کرتی اور اپنے عشاق کو آپس میں لڑا کر خوش ہوتی ہے۔ جنسی چڑیلوں کو غلبۂ شہوت کا جنوں پرور دورہ پڑتا ہے تو وہ بے قابو ہو جاتی ہیں کیسانوا[1] نے لکھا ہے کہ ولا ڈوریاس کی نمف تھی جب اُسے دورہ پڑ جاتا تو وہ اپنے آپ کو ہر اُس مرد کے سپرد کرنے پر اصرار کرتی تھی جو اُس کے سامنے آ جاتا تھا۔ اس حرکت کے باعث وہ رسوائے دہر تھی۔ شیخ نفزادی[2] نے فضیحہ نامی ایک جنسی چڑیل کا ذکر کیا ہے جس کے بڑھتے ہوئے مطالبات سے گھبرا کر اُس کا عاشق بھاگ گیا تھا۔ آگسٹس سیزر کی ایک بیٹی اور نواسی ـــ دونوں کا نام جولیا تھا ـــ جنسی چڑیلیں تھیں۔ مردوں کا انبوہ ہمیشہ اُن کے جلو میں رہتا تھا۔ اُن کی راتیں ہنگامہ آرائی اور فسق و فجور میں گذرتی تھی۔ ملکہ میسالینا جنسی چڑیل تھی۔ وہ راتوں کو بھیس بدل کر قحبہ خانوں میں جاتی اور جہاز رانوں سے تمتع کرتی تھی۔ یہی حال

---

[1] MEMOIRS.
[2] روضتہ العاطر

کلیو پیٹرا ملکہ مصر اور نیرو کی ماں اگرپینا کا تھا۔ روس کی ملکہ کیتھرین اعظم جسے ایک مورخ کے بقول عشاق کی تعداد کے باعث 'اعظم' کہا گیا ہے ایک بدنام جنسی چڑیل تھی۔ اُس کے ۸۲ عشاق کا ذکر کتب تواریخ میں محفوظ ہے۔ اُس نے اِن سب کو بیش بہا تحائف اور سیر حاصل جاگیریں عطا کی تھیں۔ اِن میں اورلوف بھائی اُس کے خاص چہیتے تھے۔ اُس کا آخری محبوب ایک نوخیز زوبوف تھا۔ اِس وقت ملکہ ساٹھ برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ بقول لارنس رانی جنداں 'پنجاب کی میسالینا' تھی۔ اِس کی جنسی مہمات نے سکھوں کی تباہی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

جنسی چڑیلیں شادی کے قابل نہیں ہوتیں۔ مغربی ممالک میں اُنہیں نفسیاتی شفاخانوں میں رکھا جاتا ہے۔

ایونیت

یہ ترکیب ہیولاک ایلس نے لوئی پانزدہم کے ایک سفیر اور جاسوس شویلر دایون کے نام پر وضع کی تھی۔ لوئی پانزدہم کے سوا کسی کو اِس بات کا علم نہیں تھا کہ شویلر دایون دراصل ایک عورت ہے جو ہمیشہ مردانہ لباس پہنتی ہے۔ دایون نے میدان جنگ میں دادِ شجاعت دے کر اپنی 'مردانگی' کا لوہا منوایا تھا۔ جنسیات کی اصطلاح میں ایونیت کا مطلب ہے عورت کا مردانہ لباس پہن کر اور مرد کا زنانہ لباس پہن کر جنسی حظ محسوس کرنا۔ اِس نوع کے لوگ ہم جنسی اور سادی بھی نہیں ہوتے۔ پی لوٹ نے اِن کی تین قسمیں گنائی ہیں۔ (۱) مرد جو زنانہ لباس پہنتے ہیں (۲) عورتیں جو مردانہ لباس پہنتی ہیں۔ (۳) بالغ جو بچوں کا لباس پہنتے ہیں۔ ایونی بسا اوقات غیر معمولی ذہنی اور تخلیقی قوتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ ناول نویس جارج ساں، جارج ایلیٹ، موسیقار واگنر اور کارل میریا فان ویبر ایونی تھے۔ قیاصرۂ روم کموڈس اور ہیلیوگابولس برسرِ عام زنانہ لباس پہنتے تھے۔ یہی حال فلپ آرلینز، ایبل گسیٹ اور ڈیوک آو سسکس کا تھا۔ التمش کی بیٹی مردانہ لباس پہن کر دربار میں آتی تھی۔ مہدی عباس کی بیٹی بانوقہ مردانہ لباس پہن کر اور ہتھیار سج کر گھوڑے پر سوار نکلتی تھی۔ سویڈن کی ملکہ کرسٹینا ساری عمر مردانہ لباس پہنتی رہی۔ ہنری سوم شاہ فرانس زنانہ لباس پہننے کا شوقین تھا۔ بعض اوقات وہ بیش بہا زنانہ جوڑا پہنے، کانوں میں ہیروں کے آویزے، گلے میں موتیوں کا ہار، طلائی بازو بند پہنے ناچ کی مجالس میں آیا کرتا تھا۔ اِس کے جلو میں بارہ خوبصورت جوان ہوتے تھے۔ ریختی گو شاعر

عصمت لکھنوی زنانہ لباس پہن کر مجالس مشاعرہ میں شرکت کرتا تھا۔ ریختی کو لکھنؤ کے زوال پذیر معاشرے کے زنانہ پن کی فنّی علامت سمجھا جا سکتا ہے۔

ڈان یوآن

یہ اصطلاح ہسپانیہ کے ایک رئیس کے نام سے یادگار ہے جو عمر بھر عورتوں کے تعاقب میں سرگرداں رہا۔ فرنیک ایس کاپریو ڈان یوآن کی نفسیات سے بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے [1]

"خوبصورت لڑکے پر لڑکیوں کی نگاہیں اُس کے لڑکپن ہی میں پڑنے لگتی ہیں، اُس کے حُسن کی تعریف کی جاتی ہے جس سے اُس کے ذہن میں یہ عقیدہ راسخ ہو جاتا ہے کہ اُس کی ذات عورتوں کے لئے بڑی پُرکشش ہے۔ اِس خیال کی تہ میں محض خُود نُمائی ہی نہیں ہوتی بلکہ اِس کا تعلق نفسیاتی عقیدے سے بھی ہے۔ وہ نوجوان جو ظاہری حسانت کے ساتھ قابلیت اور شُہرت بھی رکھتا ہو ہر وقت عورتوں میں گھرا رہتا ہے جو اُس پر صدقے قربان ہوتی رہتی ہیں۔ اِن میں کنواریاں بھی ہوتی ہیں اور بیاہتا بھی۔ وہ اپنی بیوی کا وفادار ہو تو بھی اُسے اپنی مداحوں کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ وہ شروع ہی سے اس بات کا عادی ہو چکا ہوتا ہے اِس لئے شادی کے بعد بھی اُسے یہ ریت نبھانا پڑتی ہے۔ ڈان یوآن کا بنیادی تصوّر یہی ہے۔ اُس کی ظاہری کشش اور اعتمادِ نفس میں ایک گہرا نُقطہ مخفی ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنی ذات سے اُس کی محبت اِس درجے راسخ ہو چکی ہوتی ہے کہ جب وہ خلوت میں کسی عورت کے پاس بیٹھا ہو تو بھی اپنی ذات کو بھُلا نہیں سکتا۔ کسنوا کی قسم کے لوگوں کے سوانح سے پتہ چلتا ہے کہ اِن لوگوں نے کئی معاشقے کئے، کئی شادیاں کیں کیوں کہ وہ ہر اُس عورت سے دُور بھاگتے ہیں جس پر اُن کی جنسی کوتاہ ہمتی مُنکشف ہو جاتی ہے۔ ڈان یوآن ایک ایسا آدمی ہے جو کئی معاشقے کرنے کے بعد بھی بھرپور قوتِ رجولیت سے عاری ہوتا ہے۔"

ڈان یوآن کی نفسیات کا مرکزی نقطہ یہی ہے کہ وہ فریقِ ثانی کی تسکین نہیں کر سکتا نہ خود بھرپور جنسی تشفّی

---

[1] VARIATIONS IN SEXUAL BEHAVIOUR

سے بہرہ مند ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نت نئی عورت کے پیچھے بھاگتا پھرتا ہے۔ ویانا کے ادیب الفرڈ مالگر کے الفاظ میں "اُس کے لئے ایک عورت بہت زیادہ اور بہت سی عورتیں بہت کم ہوتی ہیں۔" وہ عورتوں کو یوں اکٹھا کرتا رہتا ہے جیسے کسی کو ٹکٹ جمع کرنے کا شوق ہو۔ مولیئر کی تمثیل ڈان یوآن کا ہیرو کہتا ہے۔

"میرا دل دُنیا بھر کی عورتوں کی اِملاک ہے سب باری باری اِسے اپنے پاس رکھ سکتی ہیں۔"

'میری مخفی زندگی' کا مصنف حیرت سے کہتا ہے

"آخر کیا وجہ ہے کہ ایک ہزار عورتوں کے ساتھ خلوت میں جا کر بھی جب کبھی میں کسی اجنبی عورت کو دیکھتا ہوں تو مجھے اُس میں بے پناہ کشش محسوس ہوتی ہے۔ میں بے اختیار اور بے بس ہو جاتا ہوں اور اُسے حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگتا ہوں حالاں کہ میں جانتا ہوں کہ اُس سے تمتع کرنے سے مجھے کوئی نیا تجربہ نہیں ہوگا۔"

جنسی نفسیات کی رُو سے اِس کی توجیہہ یوں کی جائے گی کہ ایک تو اُسے اپنی قوتِ رجولیت پر اعتماد نہیں ہے لہٰذا اپنے احساسِ کہتری کی تلافی کرنے کے لئے وہ عورتوں کا تعاقب کرتا ہے دوسرے وہ ہر اجنبی عورت کو اپنے لئے ایک چلتا پھرتا چیلنج سمجھتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ میں اِس پر قابو نہ پا سکا تو میری ہیٹی ہوگی تیسرے وہ ایک ہی عورت سے دوبارہ رُجوع نہیں لاتا کیوں کہ اُس عورت پر اُس کی کم ہمتی کا راز مُنکشف ہو چکا ہے اور اُسے شُبہ ہے کہ وہ اُسے حقارت کی نظر سے دیکھے گی چوتھے وہ لاشعوری جبر کا شکار ہے اور نت نئے معاشقے سے اپنی نرگسیت کا مداوا کرنا چاہتا ہے۔

ڈان یوآن عُمر بھر اِس فریب میں مُبتلا رہتا ہے کہ ایک عورت دوسری عورت سے مختلف ہے وہ اپنی جوانمردی کی دھاک بٹھانے کے لئے عورتوں کے پیچھے پیچھے منڈلاتا رہتا ہے حالاں کہ جو شخص ساری عُمر عورتوں کے تعاقب میں تباہ کرے وہ جوانمرد نہیں ہوتا بلکہ ایک قابلِ رحم احمق ہوتا ہے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوگا کہ ڈان یوآن کوتاہ ہمت ہوتا ہے تو عورتیں پروانوں کی طرح کیوں اُس پر گرتی ہیں۔ اِس کا جواب

یہ ہے کہ عورت مرد کی شہرت پر مرتی ہے۔ ڈان یوآن کی شہرت میں عورتوں کے لئے بے پناہ کشش ہوتی ہے۔ ہر عورت یہ چاہتی ہے کہ اُسے اپنی جانب مائل کرکے دوسری عورتوں پر اپنے حُسن و جمال کی برتری کو ثابت کر دکھائے۔ تھیوڈور رانک لکھتا ہے۔[1]

"ایک نوخیز دوشیزہ ڈان یوآن سے سخت متاثر ہوتی ہے۔ وہ روز خوابی میں دیکھتی ہے کہ اُس نے ایک ایسے ہرجائی، ہری جگ کو جو کسی دوسری عورت کے قابو میں نہ آسکا رام کرلیا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ میں اِس کی اصلاح کروں گی اور اُسے راہ راست پر لے آؤں گی۔"

ڈان یوآن کی کشش کا راز اِسی بات میں ہے کہ ہر عورت چاہتی ہے کہ میں اُس کی محبت کو جیت کر دوسری عورتوں پر اپنے حُسن کی برتری کا سکہ جما سکوں۔ کسی نے کہا ہے کہ عورت اور نپولین میں ایک بات مُشترک ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ جہاں سب عورتیں ناکام ہو چکی ہیں وہاں میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ لارڈ بائرن اپنے عہد کا معروف ڈان یوآن تھا۔ وہ تنکا تیاً کہتا ہے کہ "ہیلن آف ٹرائے کے بعد جس شخص کو سب سے زیادہ RAPE کیا گیا ہے وہ مَیں ہُوں۔" بعض مرد مثالی عورت کی تلاش میں رہتے ہیں حالاں کہ اِس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ موپاساں نے اِس جستجو کی ترجمانی بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے۔ فرینک ہیرس لکھتا ہے[2]

"موپاساں نے مجھے بتایا کہ عورت کے تعاقب سے زیادہ دلچسپ اور کوئی تفریح نہیں ہے۔ میں صرف 'نامعلوم' عورت سے پیار کرتا ہوں جو میرے اپنے تخیل کی مخلوق ہے۔ وہ سراپا کشش ہے، اُس میں وہ تمام خوبیاں اور رعنائیاں موجود ہیں جو آج تک کسی بھی عورت میں دکھائی نہیں دیں۔ اُسے پالینے کی کوشش ——— یہی میری زندگی کی سب سے بڑی مہم ہے۔"

اِس مقصد کے لئے ڈان یوآن عورتوں کے تعاقب میں سرگرداں رہتے ہیں، اگرچہ اِس جستجو میں وہ ہمیشہ

---

1. PSYCHOLOGY OF SEXUAL RELATIONS.

ناکام رہتے ہیں۔ تنوّع کی یہ خواہش بالآخر میکانکی اور بے کیف بن کر رہ جاتی ہے اور لاشعوری جبر کی صورت اختیار کر جاتی ہے جس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔

عشقِ محرّمات[1] غاروں کا انسان وحوش کی طرح اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو اپنے تصرف میں لاتا تھا۔ فرائڈ نے کہا ہے کہ اس زمانے میں بیٹوں نے اتحاد کر کے اپنے باپ کو قتل کر دیا اور احساسِ جرم کے تحت انہوں نے طوطم جانور (باپ کی علامت) کو جان سے مارنا اور ماؤں بہنوں سے جنسی ملاپ کرنا ممنوع قرار دیا۔ اُس کے خیال میں اس ممانعت یا طبو نے اخلاق، معاشرتی تنظیم اور مذہب کو جنم دیا تھا[2]۔ تمدّن کے ارتقاء کے باوصف محرّمات سے اختلاط کی روایت کہیں نہ کہیں باقی رہی۔ مصرِ قدیم اور ایرانِ قدیم میں سلاطین اور اُمراء اپنی بہنوں اور بیٹیوں سے نکاح کر لیتے تھے آتشیاں کے ہاں محرمات یعنی ماں، بیٹی اور بہن کے ساتھ اختلاط جائز تھا۔ ہندوستان میں شکتی پوجا کے دوران میں محرّمات مباح ہو جاتی تھیں۔ نپولین نے اپنی بہن پالین سے معاشقہ کیا تھا۔ بائرن اپنی بہن آگسٹا سے عشق کرتا رہا۔ محرّمات سے اختلاط کی روایت بلقان کی ریاستوں، جرمنی اور فرانس کے دیہات میں آج بھی کسی حد تک باقی ہے۔ اس نوع کے واقعات عام طور سے پردۂ خفا میں رہتے ہیں اور جرائم کی صورت ہی میں سامنے آتے ہیں۔

جنس زدگی[3] بعض لوگ ہوا و ہوس کی رَو میں بہہ کر جنسی خواہش کی تسکین ہی کو زندگی کا مقصدِ واحد سمجھ لیتے ہیں اور دن رات اسی فکر میں غلطاں رہتے ہیں۔ "میری مخفی زندگی" کا مصنف لکھتا ہے۔

> "پندرہ ماہ تک میں نے اپنی بیوی پر قناعت کی۔ مجھے اُس سے بڑی محبت ہے، اُس کی خوشنودی کی خاطر جان بھی دے سکتا ہوں لیکن میرا مزاج ایسا ہوس پرست ہے کہ میں کتنی ہی کوشش کروں میں اپنی بیوی کا وفادار ہو کر نہیں رہ سکتا۔ میری تمام کوششیں رائگاں جاتی ہیں اور میں تنوّع کی خواہش پر قابو نہیں پا سکتا۔"

---

[1] INCEST [2] TOTEM AND TABOO [3] EROTOMANIA

اموی دور کا شاعر عمر بن ابی ربیعہ ہوا و ہوس کا پتلا تھا اور پردہ نشیں لڑکیوں کو اپنے شعروں میں رسوا کیا کرتا تھا۔ وہ حج کرنے والی مستورات کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ جاتا اور انہیں پریشان کیا کرتا تھا۔ ایک عورت کے بارے میں کہتا ہے ؎

اَلَا لَیْتَ اُمَّ الْفَضْلِ کَانَتْ قَرِیْنَتِیْ ۔۔۔ ھُنَا اَوْ ھُنَا فِیْ جَنَّۃٍ اَوْ جَھَنَّمِ

(کاش کہ ام فضل ہی صورت میں میری رفیقہ بن جائے، یہاں، وہاں، جنت میں یا جہنم میں)

ایک اور عرب شاعر مسلم بن ولید انصاری اپنے آپ کو فخریہ صریع الغوانی (حسیناؤں کا دیوانہ) کہا کرتا تھا۔ مجرد مردوں اور کنواریوں کی جنسی فاقہ زدگی بھی مریضانہ صورت اختیار کر جاتی ہے۔ ایسی عورت جب کسی مرد سے بات کرتی ہے خواہ وہ بوڑھا ہو یا جوان ہو تو سوچنے لگتی ہے کہ یہ تو میرے درپے ہے۔ اس نوع کی ایک عورت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ رات کو سونے سے پہلے ہمیشہ اپنے پلنگ کے نیچے جھانک کر دیکھ لیتی تھی کہ کہیں کوئی مرد تو نیچے نہیں چھپا بیٹھا۔ اس تجسس کی تہ میں فی الحقیقت یہ لاشعوری تمنا کارفرما ہوتی تھی کہ کاش کوئی مرد میرے پلنگ کے نیچے چھپا ہوتا۔

جنسی علامت پرستی[1] جنسی علامت پرستی میں نفسانی خواہش اعضائے مخصوصہ سے منحرف ہو کر عورتوں کے لباس یا اعضا پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ یہ خاص مردانہ انحراف ہے جو عورتوں میں شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ اس نوع کے خبطی عورتوں کی زلفوں، زیر جاموں، چولیوں، جوتوں وغیرہ کو چرا کر انہیں سینت سینت کر رکھتے ہیں اور انہیں دیکھ دیکھ کر یا سونگھ سونگھ کر محظوظ ہوتے ہیں۔ انہیں جنسی ملاپ سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ ان کا خبط زلف، زیر جامے، سرین، چھاتیوں کے ابھار، پاؤں، ٹخنوں یا کلائی سے مستقلاً وابستہ ہو جاتا ہے۔ وہ چولی زیر جامے وغیرہ کو سینے سے لگاتے ہیں، چومتے ہیں اور اس طرح لبسا اوقات منزل بھی ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کا ایک خبطی زنانہ جوتوں کا پجاری تھا۔ وہ قحبہ خانے جا کر کسی خوبصورت کسبی سے فرمائش کرتا کہ وہ اسے اپنے جوتے چاٹنے دے۔ اس کا وہ بھاری معاوضہ دیتا تھا اور جوتے چاٹ کر چپ چاپ چلا جاتا تھا۔ بعض لوگ عورت کے پاؤں چاٹ کر حظ

---

[1] FETICHISM

اندوز ہوتے ہیں۔ یہ انحراف اجتماعی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے مثلاً اضلاع متحدہ امریکہ میں عورت کی غیر معمولی اُبھری ہوئی چھاتیوں کی پرستش کی جاتی ہے۔ جین مینسفیلڈ، انیتا ایکبرگ، صوفیہ لورین وغیرہ کی مقبولیت کا یہی راز ہے۔ عرب، ہندو، اطالوی، جرمن اور حبشی اُبھرے ہوئے بھاری بھرکم سُرینوں پر جان چھڑکتے ہیں۔ قدیم چینی پاؤں کے خبطی تھے۔ لڑکیوں کے پاؤں بچپن ہی میں کس کر باندھ دیئے جاتے تھے۔ جوان ہونے پر اُن کے پاؤں ننھے منّے رہ جاتے۔ چینی اس قسم کے پیروں کو "سنہرا کنول" کہتے تھے اور ان کے نظارے سے از خود رفتہ ہو جاتے تھے۔ چینی عورتیں غیر مردوں کے سامنے پاؤں کھولنے میں اتنا ہی حجاب محسوس کرتی تھیں جتنا کہ دوسری اقوام کی عورتیں اپنی چھاتیاں دکھانے میں کرتی ہیں۔

مردانہ عورت[1]

مرد میں زنانہ پن اور عورت میں مردانگی کا انکشاف پہلے پہل فلیس نے کیا تھا۔ اُس نے کہا کہ تمام عورتیں مرد دو جنسی ہوتے ہیں۔ یعنی ہر مرد میں نسوانی اور ہر عورت میں مردانہ خصوصیت کسی نہ کسی حد تک موجود ہوتی ہے۔ شائی نارخ نے ثابت کیا کہ جنسی غدود ہارمون پیدا کرتے ہیں جو مردانگی یا نسوانیت کے ذمے دار ہیں۔ ہر مرد میں تھوڑی بہت مقدار میں زنانہ ہارمون اور ہر عورت میں کچھ نہ کچھ مردانہ ہارمون ہوتے ہیں۔ ان کے توازن و تناسب میں گڑبڑ ہو جائے تو مرد میں زنانہ پن اور عورت میں مردانگی کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ایک مردانہ عورت کسی زنخے کو شادی کے لئے منتخب کرتی ہے جس پر وہ پوری طرح حکومت کر سکے۔ مردانہ عورتیں تمام عورتوں سے متعلق وہی احساس رکھتی ہیں جو مرد عورت سے متعلق محسوس کرتا ہے۔ لزبائی عورت اسی نوع کی ہوتی ہے۔ مردانہ عورت کا قد کشیدہ، جسم غیر متناسب، ہاتھ پاؤں بڑے بڑے اور کرخت، ٹانگیں اور بازو دُبلے پتلے اور لمبے، کہنیوں اور گھٹنوں کے جوڑوں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی اور چھاتیاں سپاٹ ہوتی ہیں۔ وہ سگار پیتی ہیں، گھوڑے کی سواری اور شکار کی شوقین ہوتی ہیں اور مرد سے نفرت کرتی ہے۔ انگریزی کی ایک ضرب المثل ہے "سیٹی بجانے والی عورت اور بانگ دینے والی مُرغی، ہر دو پر لعنت"۔ شیکسپیئر کی ایک تمثیل ٹرائلس اور کرلسدا

---

[1] VIRAGO

کا ایک کردار پروکلس کہتا ہے "مردانہ عورت زنانے مرد سے زیادہ قابلِ نفرت ہوتی ہے"۔ یہی خیال عورتوں کا زنانے مردوں سے متعلق ہے۔

مردانہ عورت کی معروف مثال ملکہ کرسٹینا والیٔ سویڈن تھی۔ کرسٹینا شاہ گستاوس اڈولفس کی بیٹی تھی۔ باپ کی موت کے بعد تخت نشین ہوئی۔ اُسے زیوروں سے نفرت تھی۔ وہ مردانہ لباس پہن کر مردانہ کھیلوں میں حصہ لیتی تھی اور سرپٹ گھوڑا دوڑاتے ہوئے پہلی گولی سے شکار مار لیتی تھی۔ اُسے شادی سے سخت نفرت تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ جنسی مواصلت عورت کی غلامی کی علامت ہے۔ اُسے جملہ علوم و فنون پر عبور حاصل تھا اور وہ سائنس دانوں اور فلاسفہ سے حریفانہ مناظرے کیا کرتی تھی۔ وہ یونانی، لاطینی، عبرانی، عربی، جرمن، فرانسیسی، اطالوی، ہسپانوی زبانیں بخوبی جانتی تھی۔ اُس نے مشہور فلسفی دے کارت کو اپنے یہاں بلا کر ٹھہرایا تھا۔ دے کارت اُس کا بڑا مداح تھا۔ جب دے کارت نے اُسے بتایا کہ تمام حیوانات کلیں ہیں تو کرسٹینا نے کہا "لیکن میں نے کبھی کسی گھڑی کو تو بچہ جنتے نہیں دیکھا۔" اِس جواب سے دے کارت کھسیانا ہو گیا۔ کرسٹینا کے اقوال اُس کی دانش کے شگفتہ نمونے ہیں مثلاً

"——— کسی شخص کی اصلیت کو جان لینا گویا اُسے ناراض کر لینا ہے۔"

"——— غیر معمولی جوہر یا خوبی ایک ایسا جرم ہے جسے کبھی معاف نہیں کیا جاتا۔"

اُس نے ۱۶۵۴ء میں تخت و تاج کو خیرباد کہا اور ڈنمارک چلی گئی۔

زنانے مرد [1]

اِن مردوں کی آواز باریک، چہرہ گول، قد میانہ، ہاتھ پیر چھوٹے چھوٹے اور گداز، بازو اور رانیں بھری بھری ہوتی ہیں، جسم کے زاویے گول ہوتے ہیں، جسم پر بال نہیں ہوتے، لبوں پر منفعل قسم کی مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے، چہرہ تر و تازہ ہوتا ہے، سگرٹ اور شراب نہیں پی سکتے، سیٹی نہیں بجا سکتے، مردانہ کھیلوں میں دلچسپی نہیں لیتے، کسی کو ڈانٹ نہیں سکتے، کولہے مٹکا مٹکا کر چلتے ہیں، مردانہ وضع کی عورتوں سے شادی کرنا پسند کرتے ہیں جو اُن کے لئے ماں کی بدل بن جائیں، گھر گھسنے ہوتے ہیں، کھانے پکانے میں بیوی کا ہات بٹاتے ہیں، مردوں کی محفلوں میں جانا پسند نہیں

[1] EFFEMINATE

کرتے، اُن کے جذبات غیر متوازن ہوتے ہیں، معمولی سی بات پر خوش ہو کر قہقہے لگاتے ہیں اور خفیف سی رنجش پر آنسو بہانے لگتے ہیں، باتونی، نفیس مزاج اور خوشامد پسند ہوتے ہیں، عمدہ لباس پہنتے ہیں اور بھڑکیلے رنگوں کے شیدائی ہوتے ہیں، فنونِ لطیفہ میں شغف رکھتے ہیں۔ اِن کا ادبی ذوق نکھرا ہوا ہوتا ہے۔ بعض زنانے مرد قحبہ خانوں میں جا کر 'حاملہ' ہونے کا ڈھونگ رچاتے ہیں اور دردِ زہ میں تڑپ تڑپ کر یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ اُن کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ آخر قحبہ خانے والے اُن کی گود میں ایک گڑیا ڈال دیتے ہیں اور وہ مان لیتے ہیں کہ یہ اُن کا بچہ ہے۔ ہنری سوم شاہ فرانس اور نصیر الدین حیدر والئی لکھنؤ اسی نوع کے زنخے تھے اور وضعِ حمل کا ڈھونگ رچایا کرتے تھے۔

جنسی غلامی [1]

یہ ترکیب کرافٹ ایبنگ نے ۱۸۹۲ء میں وضع کی تھی۔ اِس کا اطلاق ایسی عورت یا مرد پر ہوتا ہے جو فریقِ ثانی کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہ جائے کرافٹ ایبنگ اِس کی یہ توجیہہ کرتا ہے کہ جنسی غلام یا جنسی لونڈی کی قوتِ ارادی کمزور ہوتی ہے جب کہ فریقِ ثانی مضبوط قوتِ ارادی کا مالک ہوتا ہے۔ عام طور سے جو مرد کسی عورت کی بھرپور جنسی تشفی کرتا ہے وہ اُس کی کنیز بن جاتی ہے اور اُس کی خاطر ملک و مال، خویش و اقارب، عزت و وقار پر لات مار دیتی ہے۔ مارک انٹنی کلیوپیٹرا کا جنسی غلام تھا۔ اُس نے کلیوپیٹرا کی خاطر اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ ایک ساتھی نے انٹنی کے بارے میں کہا تھا "دُنیا کا تیسرا ستون ایک کسبی کا احمق شیدائی بن کر رہ گیا ہے۔"

جانِ عالم واجد علی شاہ فرماتے ہیں۔ [2]

"میں رات رات بھر سرفراز پری کے پاؤں دابا کرتا، تمام دن اُسی کو تاکا کرتا، اگر وہ کوئی معمولی سی چیز بھی کھاتے کھاتے مجھے دیتی میں بلا پس و پیش کھا لیتا تھا، جس طرف جاتی میں بھی اُسی طرف ہو لیتا، اگر کہیں بیٹھتی تو میں کھڑا رہتا۔"

محمد شاہ رنگیلا ایک بھکاری کی بیٹی کوکی کا غلام بن گیا۔ کوکی ایک بازاری عورت تھی جسے بادشاہ نے کوکی بادشاہ کا خطاب دیا اور اُمراء کو حکم دیا کہ اُس کے سامنے کورنش بجا لایا کریں۔ اِس پر نظام الملک نے استعفیٰ دے دیا۔

---

[1] SEXUAL SLAVERY

[2] پری خانہ

کوکی اور اُس کے فرومایہ رشتہ دار سلطنت کے اعلےٰ عہدوں پر فائز ہوئے جس سے نظم ونسق تباہ ہوگیا۔ کوکی کا ایک آشنا عبدالغفور جولاہا من مانی کرنے لگا۔ وہ پالکیوں میں سے دلہنوں کو بالجبر نکال کر گھر لے جاتا تھا اور کسی کو اُنگلی اُٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ بادشاہ سلامت کوکی کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ اس قسم کے جانِ عالم اور رنگیلے ہر قوم کے دورِ زوال میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ شیخ نفزاوی نے ایک حکایت لکھی ہے جس میں ایک شخص ایک حسین وجمیل عورت سے پوچھتا ہے کہ تم خود تو چندے آفتاب چندے ماہتاب ہو لیکن تمہارا شوہر نہایت بدصورت ہے۔ تم اِس کے ساتھ کیسے بسر کر رہی ہو۔ عورت نے جواب دیا تم نے میرے شوہر کے صرف ظاہر ہی کو دیکھا ہے اگر اُس کی مخفی خوبیاں تم پر آشکار ہو جاتیں تو پھر حیرت کا اظہار نہ کرتے بلکہ میری خوش نصیبی پر رشک کرتے۔ رومۃ الکبریٰ کا عظیم ترین عشقیہ شاعر پروپرٹیس ایک رنڈی سنتھیا پر جان چھڑکتا تھا۔ اُس نے اپنی محبوبہ کے حُسن وجمال کی تعریف میں پُرجوش نظمیں لکھیں اور اُن میں اپنی عاجزی اور غلامی کا اظہار کیا۔ سنتھیا اُسے پیٹتی تھی، دھتکارتی تھی اور بعض اوقات دانتوں سے کاٹتی بھی لیکن وہ اُس کے پاؤں پڑتا۔ ظاہراً وہ اِس رنڈی کا جنسی غُلام بن کر رہ گیا تھا۔

عشقِ بُتاں[1]

یہ ترکیب قبرص کے بادشاہ پگ میلین کے نام سے یادگار ہے۔ وہ ایک ماہر سنگ تراش تھا۔ ایک دفعہ اُس نے بڑے ذوق وشوق سے ایک نسوانی مجسمہ تراشا اور اُس پر عاشق ہوگیا۔ اُس نے حُسن کی دیوی افرودائتی سے دُعا کی کہ وہ اِس مجسّمے کو زندہ کر دے دعا قبول ہوئی اور پگ میلین نے اِس حسینہ سے بیاہ کر لیا۔ یہ انحراف بُت پرست اقوام یونانیوں ہندوؤں اور رومیوں سے خاص ہے چانکیہ[2] نے اِس کا ذکر کیا ہے اور دیویوں کے مجسموں سے عشق کرنے اور انہیں آلودہ کرنے کی سخت سزا تجویز کی ہے۔ ایتھنز[3] کے مشہور سنگتراش پراکسی طلیس نے افرودائتی کا ایک نہایت حسین بُت تراشا جس پر ایک نوجوان فریفتہ ہوگیا۔ یہ نوجوان پہروں اُس کے سامنے بیٹھا آہیں بھرتا، آنسو بہاتا، والہانہ اُسے چومتا اور اُس کے گلے میں پھولوں کے ہار آویزاں کیا کرتا۔ مشہور شاعرہ میراں کرشن کی

---

[1] PYGMALIANISM

[2] ارتھ شاستر

[3] SEXUAL LIFE OF ANCIENT GREECE.

مورتی پر دل وجان سے فدا تھی۔ وہ اُس کے سامنے کھڑی ہو کر پُرجوش بھجنوں میں اُس سے اپنے پریم کا اظہار کیا کرتی اور اُسے رِجھانے کے لیٔے ناچا کرتی تھی۔ ایک روایت ہے کہ ایک دن کرشن کی مورتی شق ہو گئی اور میراں اُس میں سما گئی۔

حیوانیت [1] حیوانات سے جنسی ملاپ کرنا ایک قدیم انحراف ہے جو آج بھی کہیں کہیں پایا جاتا ہے۔ بعض مرد گایوں، گدھیوں، کُتیوں اور بطخوں سے جنسی ملاپ کرتے ہوئے پکڑے گئے ہیں۔ اِسی طرح عورتوں کی گدھوں، کُتوں، ریچھوں اور بندروں سے جنسی ملاپ کی مثالیں موجود ہیں۔ انگریز عورتیں سدھائے ہوئے کُتوں کے ساتھ جنسی ملاپ کرنے کے لیٔے رسوائے زمانہ ہیں قدیم مصری اور ہندو مقدس گھوڑوں، بیلوں اور بکروں کی زوجیت میں حسین عورتیں دیا کرتے تھے۔ دیامند نے لکھا ہے کہ برہمن یگیہ کے مقدس گھوڑے کا جنسی ملاپ رانی سے کرایا کرتے تھے۔ یونانی دیو مالا میں ہے کہ دیوتا زلیس نے راج ہنس کا روپ دھار کر ایک دوشیزہ لیڈا سے جنسی ملاپ کیا تھا۔ ایک نوجوان عورت پاسی فائی ایک بیل پر عاشق ہو گئی اور اُس سے ہم کنار ہوئی جس سے عفریت مانوٹار پیدا ہوا جس کا چہرہ مرد کا اور دھڑ بیل کا تھا۔ اِس انحراف کا ذکر اقوامِ عالم کی داستانوں میں ملتا ہے۔ الف لیلہ ولیلہ میں وردان قصاب کا قصہ ہے جس میں ایک عورت ریچھ سے جنسی ملاپ کرتی ہے۔ مولانا روم نے ایک حکایت کنیزک و خر میں بیان کیا ہے کہ ایک کنیزک نے گدھا سدھا رکھا تھا جس سے وہ جنسی ملاپ کیا کرتی تھی۔ لاطینی میں اپولیس کے سُنہرے گدھے کی مشہور کہانی میں بھی اِس انحراف کا ذکر موجود ہے۔ دیہات میں چرواہوں، گڈریوں اور شتربانوں میں یہ انحراف پایا جاتا ہے۔ ایک عرب شاعر نے فزاریوں کی ہجو کرتے ہوئے کہا تھا۔

لا تامنن فزاریا خلوت بہ　　علی قلوصک واکتبھا باسیا

عہد نامۂ قدیم کے باب خروج میں لکھا ہے "جو کسی جانور سے مباشرت کرے وہ قطعی جان سے مارا جائے" انگلستان کے عدالتی ریکارڈ میں ایسے مقدمات کی مسلیں موجود ہیں جو مردوں عورتوں پر حیوانات سے جنسی

[1] BESTIALITY

ملاپ کرنے کے جرم میں جلائے گئے تھے اور جن میں مجرموں کو حیوانات سمیت موت کی سزا دی گئی تھی۔ حیوانات پہ یہ صریح ظلم تھا۔

ہوس نگاری[1] اس انحراف کا تعلق نفسانی لذت کے بالواسطہ حصول سے ہے اور یہ خالص مردانہ انحراف ہے جس میں عورتیں مطلقاً دلچسپی نہیں لیتیں۔ بعض لوگ آثارِ قدیمہ، بیت الخلا، ٹیلیفون کے کمروں، گاڑیوں کے ڈبوں وغیرہ میں فحش کلمے لکھتے رہتے ہیں اور اعضائے نہانی کی تصاویر بناتے رہتے ہیں۔ انہیں اس خیال سے حظ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی خوبصورت عورت انہیں دیکھے گی تو انہیں یاد کرے گی۔ یہ انحراف جنسی فاقہ زدگی کی دلیل ہے۔

فحش گوئی[2] یہ بھی مردانہ انحراف ہے۔ از کار رفتہ بڈھے اور کوتاہ ہمت عیاش تسکینِ ہوس کے لئے فحش گالیاں بکتے رہتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ اعضائے نہانی کے مختلف ناموں کی تکرار اور نئی نئی گالیوں کی اختراع اُن کا محبوب مشغلہ بن جاتا ہے۔ میں ایک بڈھے کو جانتا ہوں جو صبح سویرے سربازار ایک دکان پر آبیٹھتا۔ سکول جاتے ہوئے لڑکے اُس سے چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ بے تحاشا گالیاں بکنے لگتا۔ چھٹی کے وقت وہ پھر اُسی جگہ آکر بیٹھ جاتا۔ گھروں کو لوٹتے ہوئے لڑکے اُس پر آوازے کستے اور وہ گالیاں بک بک کر دل کی بھڑاس نکال لیتا تھا۔ اتوار کے دن چھٹی ہوتی تو وہ سخت بدمزہ ہو جاتا اور اُستادوں کو گالیوں کی باڑھ پر رکھ لیتا کہ چھٹی کیوں کر دی۔ اُس کی زندگی کی یہ واحد تفریح تھی۔

لذتِ سرقہ[3] یہ انحراف عورتوں سے خاص ہے جو دکانوں سے چھوٹی موٹی چیزیں چُرا کر نفسانی حظ محسوس کرتی ہیں۔ اس نوع کے سرقے اور چوری میں فرق ہے۔ چوری محض مالی منفعت کی خاطر کی جاتی ہے جب کہ اس انحراف میں جنسی حظ بھی وابستہ ہوتا ہے۔ اوائلِ شباب میں لڑکیاں اس میں خاص دلچسپی لیتی ہیں۔ امیر گھرانوں کی عورتیں جو قیمتی سے قیمتی اشیا خرید سکتی ہیں دو چار روپے کی چیز چُرانے میں باک محسوس نہیں کرتیں۔ وہ دکانوں سے چوری کرتے ہوئے

---

[1] EROTOGRAPHOMANIA [2] COPROLALIA [3] KLEPTOMANIA

پکڑی جاتی میں تو لوگ حیران رہ جاتے ہیں کہ اِس امیر عورت کو ایک معمولی چیز چُرانے کی کیا ضرورت تھی لیکن وہ نہیں جانتے کہ یہ محض چوری نہیں ہے بلکہ لاشعوری طور پر نفسانی لذّت کے حصول کی کوشش بھی ہے۔

عورت دشمنی[1]

اکثر انحرافات کے مانند اِس کی دو صورتیں ہیں ایک نارمل دوسری مریضانہ نارمل صورت یہ ہے کہ کوئی عورت کسی مرد کی محبت کو ٹھکرا دے تو وہ عورت ذات ہی کا دشمن بن جائے اور اُس کی بے وفائی کا چرچا کرنے لگے۔ شوپنہائر، نطشے اور ہاپٹ مان جیسے عورت دشمن اِسی زمرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مریضانہ صورت یہ ہے کہ بعض نوجوان اپنی ماں سے اتنی شدید جذباتی وابستگی رکھتے ہیں اور اُس کا ایسا مثالیاتی تصوّر اپنے ذہن میں راسخ کر لیتے ہیں کہ کوئی بھی عورت اُس پر پوری نہیں اُتر سکتی اور وہ عورت ہی سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اکثر مجرّد اِسی زمرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اِن کے علاوہ جو مرد خلقی طور پر ہم جنسی ہوتے ہیں اُنہیں بھی عورت میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی۔ بعض تارک الدنیا راہب اور صوفی عورت سے نفرت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عورت شیطان کا آلۂ کار ہے، غولِ بیابانی ہے جو طالبانِ حقیقت کو راہِ راست سے بھٹکا دیتی ہے۔ اِس کی تہ میں جنسی فاقہ زدگی ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنی تند و تیز جنسی خواہش کو دبا کر جو اذیت محسوس کرتے ہیں اُس کا انتقام عورت کی بُرائی کر کے لیتے ہیں۔

جنسی پاجی[2]

یہ لوگ شائستہ انداز میں محبت کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ ان میں ایذا طلبی کا عنصر موجود ہوتا ہے اور وہ ذلیل قسم کی عورتوں سے مقاربت کے آرزو مند ہوتے ہیں مثلاً بادلیئر بدصورت حبشنوں اور گندی کسبیوں سے جنسی ملاپ کر کے محظوظ ہوا کرتا تھا۔ جب وہ مادام سباتئے پر عاشق ہوا اور ایک مدّت کی تگ و دَو کے بعد حصولِ وصال میں کامیاب ہوا تو گھبرا کر بھاگ گیا کیوں کہ وہ طبعاً صرف گندی کسبیوں ہی سے جنسی ملاپ کر سکتا تھا۔ مبارک شاہ خلجی جنسی پاجی تھا اور رذیل آبرو باختہ رنڈیوں کا شیدائی تھا۔ وہ زنانہ لباس پہن کر مجمعِ عام میں آتا اور رنڈیوں کو محلِ ہزار ستون کے بالاخانے میں طلب کرتا۔ وہ اُس کے اشارے پر معزز اُمراء کے سامنے مادر زاد

---

[1] MISOGYNY

[2] SEXUAL DEGENRATES

برہنہ آتیں اور اُن پر پیشاب کرتی تھیں ۔ یہ دیکھ دیکھ کر مبارک شاہ خوش ہوتا تھا ۔ جہاندار شاہ بھی جنسی پاپی تھا ۔ وہ ایک کسبی لعل کنور پر فریفتہ تھا ۔ دونوں شراب کے نشے میں دست راتوں کو باہر نکل جاتے اور مادر زاد برہنہ باؤلیوں میں چھلانگیں لگایا کرتے تھے ۔ رُوسو کا معاشقہ مادام دوارنی سے ہوا جو عمر میں اُس سے کہیں بڑی تھی اور رُوسو اُسے امّی کہا کرتا تھا ۔ بعد میں رُوسو کو معلوم ہوا کہ مادام اپنے ایک نوکر کو بھی اپنی خلوت میں بُلاتی تھی ۔ اس پر رُوسو تاؤ کھا گیا لیکن مادام نے یہ کہہ کر رُوسو کو مطمئن کر دیا کہ تم دونوں مجھ سے پیار کرتے ہو آخر اِس میں حرج ہی کیا ہے ۔ قیاصرۂ روم کلاڈیس، کالی گولا اور نیرو بدترین قسم کے جنسی پاپی تھے ۔ داغ دہلوی کی یہی حالت تھی ۔ اُس کی ساری عمر کسبیوں اور ڈیرہ دار ٹکیوں کی صحبت میں کٹی ۔ وہ بڑھاپے میں بھی کسبیوں سے معاشقے کرتا رہا چنانچہ اُس کی غزل کی محبوبہ کسبی ہی ہے ۔

دہن کاری[1]

یہ انحراف آریائی اقوام سے خاص ہے ۔ سامیوں، مغلوں اور حبشیوں میں اس کا کوئی کھوج نہیں ملتا ۔ دہن کاری کا ثبوت یونان، روما اور ہندوستان کے قدیم زمانے کے نقوش سے ملتا ہے ۔ پنڈت واتسایان اِسے اپارشتک کہتا ہے اور لکھتا ہے کہ راجاؤں کے محلوں میں لونڈیاں اور ہیجڑے دہن کاری کرتے تھے ۔ واتسایان کے بقول شاستروں میں اس کی اجازت دی گئی ہے ۔ البتہ برہمنوں اور منتریوں کو اِس سے اجتناب مناسب ہے ۔ عرب دہن کاری سے نفرت کرتے تھے ۔ اُن کی گالی تھی امصص بیظر الات ۔ آج کل دہن کاری فرانسیسیوں کا قومی انحراف بن گئی ہے ۔ فرانس کے قحبہ خانوں ہی میں نہیں بلکہ گھروں میں بھی اِس کا رواج ہے ۔

اعادۂ شباب[2]

جن لوگوں کی زندگی کا واحد مقصد جنسی لذّات کا حصول ہوتا ہے وہ شباب کو عمر کا بہترین دَور سمجھتے ہیں اور اُنہیں بڑھاپے میں بھی دوبارہ جوان بننے کی آرزو ستاتی رہتی ہے ۔ قدیم زمانے میں اعادہ شباب کے لئے لوگ جوان آدمیوں کا خون پیتے تھے اور عورتیں جوان لڑکیوں کے خون میں غسل کرتی تھیں ۔ اِس مقصد کے لئے عورتوں کا دودھ بھی پیا کرتے تھے ۔ کایا کلپ، رسائن اور اکسیر کے نسخے اِسی زمانے سے یادگار ہیں ۔ نسخۂ داؤدی[3] کا ذکر جنسیات کی کتابوں میں اکثر آتا ہے ۔

---

[1] CUNNILINGUS, FELLATIO [2] SHUNAMATISM
[3] DAVIDS RECIPE

عہد نامۂ قدیم میں لکھا ہے کہ جناب داؤد بڈھے ہوئے تو جاڑے میں اُنہیں ٹھر محسوس ہوتی تھی اور نیند نہیں آتی تھی چنانچہ اُن کا نکاح ایک پُر شباب لڑکی شونمت ابی شاگ سے کیا گیا کہ اُن کی توانائی بحال ہو جائے۔ اِسے نسخۂ داؤدی کہا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ گلیڈسٹون نے اعادۂ شباب کے لئے بہتر ۷۲ برس کی عمر میں ایک نوجوان کسبی کیتھرین والٹرز سے معاشقہ کیا تھا۔ اِعادۂ شباب کے لئے مقوّی باہ ادویہ کا ذکر تمام قوموں کی طبّی کتب میں ملتا ہے۔ ہمارے ہاں اطباء "معجون فلک سیر" اور "شہید ہروش" جیسے مرکبات استعمال کراتے ہیں۔ اِن میں عموماً چرس کی آمیزش ہوتی ہے اور جو صحت ضرر رساں ہوتی ہے۔ مغرب میں بڑھاپے کے دفیعے کے طریقوں کی تحقیق شدّومد سے جاری ہے۔

بعض انحرافات شخصی قسم کے ہوتے ہیں جن کی تسکین کے سامان قحبہ خانوں میں بہم پہنچائے جاتے ہیں مثلاً ایک جرمن افسر تھا جو ایک کسبی سے کہا کرتا تھا کہ وہ برہنگی کے عالم میں اپنے بازوؤں میں پھولوں کے گلدستے لے کر کمرے کے چکر لگائے۔ وہ خود پرندہ بن کر اور ہوا میں اپنے بازوں لہرا لہرا کر ان پھولوں پر منڈلایا کرتا تھا۔ پیرس، لنڈن، برلن وغیرہ کے قحبہ خانوں میں لوگ عجیب وغریب فرمائشیں لے کر آتے ہیں مثلاً کسبیوں سے کہتے ہیں کہ وہ راہبہ کا لباس پہنے یا نرس کے کپڑے زیب تن کریں، اِس کے بغیر وہ اُن سے تمتّع نہیں کر سکتے۔ قحبہ خانوں کے مالک ہر قسم کے ملبوسات اور ساز و سامان تیار رکھتے ہیں تاکہ اپنے سرپرستوں کے عجیب وغریب مطالبات کی تسکین کر سکیں۔

انحرافات کے بارے میں جدید ترین نظریّہ یہ ہے کہ ہر مرد وعورت میں جنسی انحراف کا میلان پایا جاتا ہے جو اُن کی شیر خوارگی کے دوَر سے یادگار ہوتا ہے۔ نامساعد حالات اور نفسیاتی اُلجھنوں کے باعث بعض لوگوں میں یہ میلان نمایاں ہو کر مریضانہ صُورت اختیار کر جاتا ہے۔

نئے جنسی زاویے

اُنیسویں صدی کے اوائل میں صنعتی انقلاب برپا ہوا جو انگلستان سے شروع ہو کر دوسرے مغربی ممالک میں پھیل گیا۔ سائنس کی ایجادات اور کلوں کے استعمال نے صنعتی پیداوار کے طریقے بدل دیئے۔ شہروں میں بڑے بڑے کارخانے قائم کیے گئے اور دیہاتیوں نے تلاش معاش میں جوق در جوق اُن کا رُخ کیا۔ کارخانوں میں عورتیں مردوں کے دوش بدوش کام کرنے لگیں جس سے اُن کے درمیان صنفی مغائرت ختم ہو ہوگئی۔ اس آزادانہ میل ملاپ نے قدرتاً اُن کے جنسی طرزِ عمل کو بھی متاثر کیا۔ رہا سہا حجاب دو عالمگیر جنگوں نے ختم کر دیا اور لاکھوں مردوں عورتوں نے صدیوں کی روایتی اخلاقی بندشوں کو خیرباد کہا جو اُن کے آزادانہ اختلاط کی راہ میں حائل تھیں۔ صنعتی انقلاب کی اشاعت پر زرعی معاشرے کی سیاسی، معاشی اور تہذیبی قدریں بھی بدل گئیں۔ محنت کشوں نے سرمایہ داروں کے خلاف جدوجہد شروع کی۔ عورت کی آزادی کی تحریک شروع ہوئی اور وہ وکٹوریہ کے عہد کی پابندیوں کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس طرح صنعتی انقلاب کے ساتھ ساتھ جنسی انقلاب بھی پروان چڑھنے لگا۔ علم الحیات، علم الانسان اور جنسی نفسیات کے انکشافات نے جنسی علائق پر گہرے اثرات ثبت کیے۔ جنسیات کو ایک مستقل شعبۂ علم کا درجہ مل گیا۔ کرافٹ ایبنگ، ہرش فیلڈ، رچرڈ برٹن، الرخس، ہیولاک ایلس وغیرہ کی تحقیقات نے انسانی زندگی کے چھپے ہوئے گوشے بے نقاب کیے۔ یونانیوں، رومیوں، چینیوں، ہندیوں اور عربوں کے جنسیاتی ادب کو مغربی زبانوں میں منتقل کیا گیا۔ جنسی عوارض کے علاج کے لئے شفاخانے کھولے گئے اور جنسی کجرویوں کی تحقیق کے لیے مستقل ادارے وجود میں آئے۔ بچوں کی جنسی تعلیم کے لئے نصاب مرتب کیے گئے اور جنسی مسائل پر کھلم کھلا بحث ہونے لگی۔ شادی، طلاق، عصمت فروشی، ہم جنسیت اور خود لذتی وغیرہ موضوعات پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ اربابِ اصلاح لڑکوں اور لڑکیوں کی جنسی راہنمائی پر کمربستہ ہوئے۔ اس مقصد کے لئے

فلموں سے بھی کام لیا گیا۔ ناول اور شاعری میں جنسی وصف نگاری نے بار پایا اور ربڑ کی دکانوں، پس جنسی نوع کے مصنوعی آلات اور ممسک و مہیجی دوائیں برسرِعام فروخت ہونے لگیں، ضبطِ تولید کی نئی نئی تدبیریں اختیار کی گئیں۔ غیر شادی شدہ ماؤں اور اُن کے بچوں کے تحفظ کے لیے تحریک شروع ہوئی۔ جنسی آزادی کے حق میں مستقل فلسفے مرتب کیے گئے اور جنسیات کے بارے میں اہلِ مغرب کے نئے خیالات اور افکار مشرقی ممالک میں بھی نفوذ کرنے لگے۔ جنسی انقلاب کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے سے پہلے ہم چند اہلِ نظر کے خیالات اور اُن کے اثرات کا مختصراً ذکر کریں گے۔

کرافٹ ایبنگ نے جنسی کجرویوں کا مطالعہ جدید سائنس کی روشنی میں کیا اور کہا کہ جو اشخاص جنسی کجروی میں مبتلا ہوتے ہیں وہ لعن طعن کے مستوجب نہیں ہوتے بلکہ ہمدردی کے مستحق ہوتے ہیں۔ اُس کے خیال کے مطابق بعض اوقات جنین میں ایسی عضویاتی تبدیلیاں رُونما ہوتی ہیں جن کے باعث بچہ خلقی طور پر کجرو ہو جاتا ہے مثلاً جنسی نظام میں گڑبڑ ہو جانے کے باعث بعض عورتوں میں مردانہ عنصر نمایاں ہو جاتا ہے اور بعض مردوں میں زنانہ پن آجاتا ہے چنانچہ اُن کی طبائع فطری وضع کے جنسی ملاپ سے اِبا کرتی ہیں اور جنسی تشفی کے لیے دوسری راہیں تلاش کرتی ہیں۔ الرخس نے ہم جنسیت کو خصوصی تحقیق کا موضوع بنایا اور یہ ثابت کیا کہ جو عورتیں مرد صنفِ مخالف کی بجائے اپنے ہی ہم جنسوں سے رجوع لاتے ہیں۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہوتا کیوں کہ عضویاتی نشو و نما میں خلل آجانے کے باعث وہ طبعی جنسی ملاپ میں کوئی رغبت محسوس نہیں کرتے۔ ہرش فیلڈ نے جنسی کجروی پر تحقیق کرتے ہوئے کہا کہ جو لوگ خلقی طور پر جنسی وظیفہ ادا کرنے سے معذور ہوں اُن سے نفرت کرنے کا حق ہمیں نہیں پہنچتا۔ بہتر ہو گا کہ معاشرہ اُن سے تعرض نہ کرے اور اُنہیں اپنے حال پر چھوڑ دے۔ اِن خیالات کی اشاعت کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اطالیہ اور انگلستان کے ضابطۂ فوجداری میں ترمیم کر لی گئی چنانچہ اِن ممالک میں سدومیت کو جرم نہیں سمجھا جاتا بشرطیکہ فریقین کی رضامندی مشمول ہو۔ آج کل امریکہ اور یورپ کے ممالک میں سدومیو اور امردوں کے اپنے کلب ہیں، اپنی رقص گاہیں ہیں، اپنی فنی و ادبی مجالس ہیں جن میں کوئی دوسرا شخص بار نہیں پا سکتا۔ عورتوں کو بھی لزبائی تعلق کی آزادی ہے۔ مردانہ طبع عورتیں اپنی دوگانہ سے برملا کر

رہتی ہیں۔ اُن کے معاشقوں میں اُسی جوشِ عشق، سوزِ فراق اور ذوقِ وصال کا اظہار کیا جاتا ہے جو عُشاق سے خاص ہے۔ ہجڑوں مرد عورتوں کے لیے نئے نئے آلات بنائے گئے ہیں جو ڈنمارک، سویڈن، مغربی جرمنی اور فرانس کے بازاروں میں برسرِعام فروخت ہوتے ہیں۔ ہجڑوں کی تسکینِ ہوس کے لئے خاص قسم کی فلمیں بنائی جاتی ہیں جن کی نمائش پر کوئی قدغن نہیں ہے کیوں کہ مغربی معاشرے میں عام آدمی کی طرح ہجڑوں کی جنسی تسکین کا حق بھی تسلیم کر لیا گیا ہے۔

فرائڈ جنسی آزادی کا مشہور نقیب ہے جس کے نظریۂ تحلیلِ نفسی کو ہمہ جنسی کہا جاتا ہے۔ ابتداء میں اُس نے شہوانی آرزو کو لبانڈو[1] کا نام دیا تھا لیکن اواخرِ عمر میں اُسے ایراس کہنے لگا جسے وہ مسرت طلبی کی ایسی حیات بخش تمنا قرار دیتا ہے جو انسانی زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہے۔ اُس کے خیال میں حظ اندوزی ہی اعمالِ انسانی کا بُنیادی محرک ہے۔ ہسٹریا[2] کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے فرائڈ کے اُستاد ڈاکٹر شارکو نے کہا تھا کہ ہسٹریا کی تہ میں جنسی جذبے کی ناآسودگی کارفرما ہوتی ہے۔ فرائڈ نے تحقیق کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ شیرخوار بچہ بھی شہوانی خواہش رکھتا ہے اور خودلذتی سے اس کی تسکین کرتا کرلیتا ہے۔ ماں باپ اُس کی خودلذتی میں مانع ہوں تو وہ اپنی شہوانی خواہش کو دبا دیتا ہے۔ یہ دباؤ مریضانہ صورت اختیار کر جائے تو وہ مراق، مالیخولیا، تشویش اور عصبی المزاجی کے عوارض میں مُبتلا ہو جاتا ہے۔ اس سے فرائڈ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ فرد شہوانی جذبے کی آزادانہ بھرپور تسکین کر کے ہی ذہنی صحت مندی اور قلبی مُسرت سے بہرہ یاب ہوتا ہے۔ اہلِ مغرب نے فرائڈ کے اِس نظریے کا نہایت گرم جوشی سے خیر مقدم کیا اور پورے اِنہماک سے اُس کی ہدایات پر عمل کرنے لگے چنانچہ آج کل امریکہ اور یورپی ممالک میں نوجوان لڑکے لڑکیاں بلاتکلف ایک دوسرے سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ جنسی جبلت کے اظہار کے

---

[1] یہ لفظ لاطینی زبان کا ہے LIBIDO سنسکرت میں لُبھاتی، جرمن میں LIEB، انگریزی میں LOVE، ہندی میں لوبھ۔

[2] لفظ ہسٹریا کا مادہ یونانی زبان کا لفظ ہسٹر ہے جس کا معنیٰ ہے فمِ رحم۔ بُقراط نے کہا تھا کہ جس عورت کا فمِ رحم قضیب کے لمس سے محروم رہے اُس کے ذہن اور جسم میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔

ساتھ جُرم اور گناہ کے جو احساسات وابستہ تھے اُن کا تقدّس ٹوٹ چکا ہے۔ اب بکارت اخلاقی مسئلہ نہیں رہی محض شخصی اور جسمانی مسئلہ بن کر رہ گئی ہے۔ لڑکیاں اِزالۂ بکارت کو بلوغت کی اوّلین شرط سمجھنے لگی ہیں اور پہلے موقع پر اِس سے چھٹکارا پا لیتی ہیں۔ جاپان میں کسی آزاد مشرب لڑکی کی شادی قدامت پسند نوجوان سے طے پا جائے تو وہ بیس پونڈ دے کر ڈاکٹر سے پلاسٹک کا پردہ بکارت لگوا لیتی ہے۔ مغرب میں دُولہا باکرہ دلہن کی بہ نسبت مستعملہ کو زیادہ قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھتا ہے کیوں کہ وہ تجربہ کار ہوتی ہے۔ دوشیزگی کی اہمیّت کے ختم ہو جانے سے شبِ عروسی میں کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ پنجابی دیہات کا ایک لطیفہ ہے کہ ایک مُغلّن کا بیاہ ہوا۔ شبِ عروسی کی صبح کو اُس کی سہیلیاں اُس کے پاس آئیں اور شبِ رفتہ کا حال پوچھا۔ دُلہن بولی "ایہہ ہوندے ویاہ! ایہو جیہے ویاہ تے میں کئی واری جٹاں دیاں کُھرلیاں وِچ کیتے ہوئے نیں" یہی حال آج کل کی مغربی لڑکی کا ہے۔

امریکہ اور یورپ کی نئی نسل کا عقیدہ یہ ہے کہ بھوک پیاس اور شہوانی خواہش میں کچھ بھی فرق نہیں ہے۔ بھوک پیاس لگنے پر آدمی کھانے پینے میں کچھ باک محسوس نہیں کرتا اسی طرح جنسی خواہش کی فوری تسکین میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہیے۔ ایک لڑکی نے کہا "جنسی ملاپ ایسا ہی ہونا ہے جیسا کہ "اچھا کھانا" ضبطِ تولید کے جدید ترین طریقوں نے حمل کا وہ خوف ختم کر دیا ہے جو ۱۹ ویں صدی کی دوشیزہ کو لاحق رہتا تھا۔ مغربی لڑکیاں اپنے ہینڈ بیگ میں مانع حمل گولیاں، کونڈم[1] اور پیسریاں رکھتی ہیں تاکہ ضرورت پیش آنے پر تردّد نہ کرنا پڑے۔ ہپّی، ٹرپّی لڑکے لڑکیاں برملا بغیر نکاح کے مِل کر رہتے ہیں۔ ایک ہپّی لڑکی کو ایک سے زیادہ لڑکوں کی داشتہ بن کر رہنے میں کوئی باک محسوس نہیں ہوتا۔ مغرب کے تنزّل پذیر معاشرے کی بدرو کے یہ کیڑے ایشیا اور افریقہ کے ممالک میں بھی گندگی پھیلا رہے ہیں۔ نفسانی خواہش کی تسکین کے لئے اب خلوتِ صحیحہ یا خانۂ بے تشویش کی بھی چنداں ضرورت نہیں رہی۔ نوجوان ایک دوسرے کے سامنے اختلاط کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ آج کل شرم و حیا کو روایتِ پارینہ

1ـ کونڈم کی ایجاد چارلس دوم کے عہد میں کرنل کونڈم نے آتشک سے بچنے کے لئے کی تھی۔

سمجھا جاتا ہے۔ تھیوڈور رائک لکھتا ہے کہ ایک دفعہ ایک مرد نے ایک عورت سے اظہار محبت کیا۔ عورت نے اُسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ جب وہ اُس کے کمرے میں داخل ہوا تو عورت بولی "وقت ضائع نہ کرو آؤ خواب گاہ میں چلیں۔" یہ سن کر مرد بھونچکا رہ گیا اور گھبرا کر بھاگ گیا۔ یورپ میں ساحلِ سمندر کی تفریح گاہیں جنسی بے راہ روی کے اڈے بن گئی ہیں جہاں عورتیں مرد بے محابا SUN, SAND, SEX سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

جنسی آزادی نے روائتی قسم کے رومانی عشق کا خاتمہ کر دیا ہے۔ عشق کو ایک فرسودہ روایت سمجھا جاتا ہے۔ فرائڈ کہتا ہے کہ عشق نفسانی خواہش کی منحرف مریضانہ صورت ہے یعنی ع کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔ اِس خلل دماغ سے بچنے کے لئے نوجوان عشق و محبت کا روگ نہیں پالتے اور میکانکی انداز میں اپنی ہوس کی تسکین کر لیتے ہیں۔ مغرب کے شہروں میں اباحت نسواں کا چرچا ہے، محرمات کی تمیز اُٹھتی جا رہی ہے۔ ایسے شخص سے تعرّض کرنا جو برملا کسی کی بیوی سے اظہار عشق کرے بدمذاقی خیال کیا جاتا ہے۔ شوہر اپنی بیوی کے عاشق سے نہایت خوش اخلاقی سے پیش آتا ہے۔ نئے سال کے تہوار پر عورتیں مرد ساری رات شراب کے نشے میں دھت دیوانہ وار ناچتے ہیں اور اس کے دوران میں بے محابا ایک دوسرے سے متمتع ہوتے ہیں۔ باغوں کے کنجوں میں ہفتے کی رات خاص طور سے دادِ عیش دی جاتی ہے۔ اگلی صبح کو ہر طرف کونڈم اور پیپرباں بکھری دکھائی دیتی ہیں۔ عیسائی مذہب کے زوال کے ساتھ یونان اور روما کی قدیم جنسی بے راہ روی عود کر آئی ہے[1]

ایک جرمن عالم ولہلم رائخ نے جنسی آزادی کا طبی جواز پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ جملہ ذہنی و جسمانی عوارض اور معاشرتی اُلجھنیں جنسی جذبے کی ناآسودگی کے نتائج ہیں۔ اُس کے خیال میں مردوں اور عورتوں کو نفسانی خواہش کے اظہارِ بے محابا اور بھرپور حظ اندوزی کے مواقع دیئے جائیں تو نہ صرف وہ سچی خوشی سے ہمکنار ہوں گے بلکہ جملہ معاشرتی عقدے بھی از خود حل ہو جائیں گے۔ سویڈن کے

---

[1] اِسے جدید PAGANISM کہا جاتا ہے۔ PSYCHOLOGY OF HUMAN RELATIONS

[2] THE FUNCTION OF THE ORGASM

ایک عالم ڈاکٹر لارس اکرسٹم نے بھی نفسانی خواہش کی آزادانہ تشفی کو نفسیاتی الجھنوں اور شخصی پریشانیوں کا موثر علاج بتایا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قحبہ خانوں کا انتظام خود مملکت کے ہاتھوں میں ہونا چاہیے تاکہ بغیر کسی معاوضے کے ہر شخص اپنی جنسی تسکین کر سکے۔ اُس کے خیال میں اندھوں، لولے لنگڑوں، کُبڑے، بونوں، قیدیوں اور مریضوں کی جنسی تشفی کا سامان کرنا مملکت کی ذمے داری ہے۔ آزادانہ معاشقے کے مخالفوں کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے سی، ای، ایم جوڈ لکھتا ہے کہ[1]

"جنسی خواہش کو پرہیزگار لوگ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں اور ضبطِ تولید کی مخالفت بھی کرتے رہے ہیں۔ عمر رسیدہ مرد، بیوہ عورتیں، بوڑھی کنواریاں، از کار رفتہ بدصورت، بدوضع لوگ جو خود جنسی حظ سے بہرہ ور نہیں ہو سکتے اِسے بدکاری اور حیاسوزی کہہ کر اس کے خلاف شور و غل مچا رہے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ خوبصورت نوجوان لڑکے لڑکیاں اُس جنسی حظ سے فیض یاب ہوں جس سے وہ خود محروم ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو رائے عامہ تشکیل کرتے ہیں۔"

۱۹ ویں صدی کے اواخر تک عورت سیاسی اور معاشرتی مساوات کا مطالبہ کرتی رہی۔ اب وہ جنسی آزادی میں مرد کے مساوی حقوق طلب کرتی ہے۔ برٹرنڈرسل نے جنسی رجحانات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں[2]

"ماضی میں عورتوں کے باعصمت ہونے کے دو اسباب تھے، نارِ جہنم کا خوف اور حمل کا ڈر۔ پہلا خوف مذہب کے ساتھ ختم ہو گیا ہے، دوسرے خوف کا ضبطِ تولید نے ازالہ کر دیا ہے۔ بعض عورتیں رسم و روایت یا ذہنی تساہل کے باعث عصمت و عفت کے تحفظ میں کوشاں رہی ہیں لیکن جنگِ عظیم کے اثرات نے سب رکاوٹوں کو زمین بوس کر دیا ہے۔ عورتوں کی راہنما خواتین آج سے تیس برس پہلے کی راہنماؤں کی طرح مردوں کو نیک بنانے کا تردد نہیں کرتیں۔ اُن کا ادعا یہ ہے کہ جس بات کی اجازت مردوں کو حاصل ہے عورتیں بھی اُس کی حقدار ہیں۔ اُن کی پیش رو خواتین اخلاق

---

[1] THE FUTURE OF THE MORALS [2] MARRIAGE AND MORALS

بندش میں مساوات کا مطالبہ کرتی تھیں آج کل کی عورتیں اخلاقی آزادی میں برابری کا مطالبہ کرتی ہیں۔"

اضلاع متحدہ امریکہ میں کنسے اور لنڈسے کی " نوجوانوں کی بغاوت " اور " رفاقت کی شادی " میں آج سے کم وبیش تیس برس قبل کے جنسی مسائل کا تجزیہ کیا گیا تھا اور اعداد و شمار فراہم کئے گئے تھے۔ لنڈسے نے کہا کہ نئی نسل کے جوانوں میں ہمارے توہمات، غلو، ریاکاری اور عدم رواداری کے خلاف بغاوت کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ بقول اُس کے ایک ہائی سکول کی ۹۵م طالبات جو جنسی ملاپ کا تجربہ کر چکی تھیں مشورے کے لئے اُس کے پاس آئیں، ان میں ۲۵ حاملہ تھیں۔ اُس کے مشاہدے کی رُو سے ہائی سکول کی نوے فی صد لڑکیاں لڑکے جنسی ملاپ سے آشنا ہوتے ہیں اور اُن کی باتوں سے نئے جنسی اخلاق کا علم ہوتا ہے۔ ایک نوجوان لڑکی ہیلن نے دوران گفتگو میں لنڈسے سے کہا کہ وہ میاں بیوی جو ایک دوسرے سے سچا پیار نہیں کرتے اُن مردوں اور عورتوں کی نسبت زیادہ بداخلاقی کی زندگی گذارتے ہیں جو بغیر نکاح کے مل کر رہتے ہیں لیکن ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ اُس نے کہا کہ محبت کے بغیر شادی شدہ زندگی ایک قسم کی عصمت فروشی ہے۔ اِس میں بیوی قحبہ بن کر رہ جاتی ہے جو مالی مفاد کی خاطر ایسے شوہر کے پاس خلوت میں جاتی ہے جس سے وہ نفرت کر رہی ہوتی ہے۔ ہیلن اور اُس کی ہم نوا لڑکیوں کا کہنا ہے کہ مرد عورت کا باہم محبت سے مل کر رہنا ہی شادی ہے خواہ اُن کا نکاح ہُوا ہو یا نہ ہُوا ہو۔ جب اُن کی محبت سرد مہری میں بدل جائے تو اُنہیں فی الفور جُدا ہو جانا چاہیے۔ اِس تعلق کے دوران میں ضبط تولید سے کام لینا ضروری ہے تاکہ بچے پیدا ہو کر اُلجھنوں کا باعث نہ ہوں۔ کنسے اور لنڈسے کے بقول نئے زمانے کا نوجوان جنس کو ایک حیاتیاتی ضرورت سمجھتا ہے جیسا کہ مثلاً بھوک یا پیاس نہ قانون کے مطابق ہوتی ہے اور نہ قانون کے منافی ہوتی ہے، نہ اِسے اخلاقی کہا جا سکتا ہے اور نہ غیر اخلاقی۔ اسی طرح شہوانی خواہش بھی قانون اور اخلاق کی پابند نہیں ہے۔ اِن علمائے جنسیات کا کہنا ہے کہ امریکہ کے نوجوان مردوں اور عورتوں میں شادی سے گریز کرنے کا رجحان روز افزوں ہے۔ صرف نیویارک میں پچاس ہزار لڑکیاں اپنے

عشاق کے ساتھ بغیر نکاح کے رہتی ہیں کیوں کہ وہ شادی اور بچوں کی پرورش کی ذمے داری کو قبول نہیں کرتیں۔ امریکہ میں ہر سال کئی لاکھ بچے اسقاطِ حمل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سکولوں اور کالجوں کی لڑکیاں بڑے ذوق و شوق سے گردن آویزی اور ہتھ پھیری[1] میں حصہ لیتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی جنسی ملاپ سے بھی گریز نہیں کرتیں۔ موٹر کاروں کی کثرت نے جنسی تعلق کو سہل بنا دیا ہے۔ جس لڑکی کو لڑکوں کی جانب سے سیر و تفریح کی دعوت نہ ملے اُس کے والدین اپنی بیٹی کے بارے میں مشوّش ہو جاتے ہیں کہ شاید اس کی ذات میں کوئی عیب ہے۔ امریکہ کے امیر گھرانوں میں ایک کمرہ بطور 'خلوت گاہ' کے الگ سجایا جاتا ہے تاکہ گھر کی لڑکی اپنے کسی دوست لڑکے کے ساتھ خلوت میں جانا چاہے تو اُنہیں تردّد نہ کرنا پڑے۔ جج لنڈسے کہتا ہے کہ امریکی عورتیں جنسی معاملات میں زیادہ جارحیت کا ثبوت دینے لگی ہیں۔ ایک سکول کی پرنسپل نے اُسے بتایا کہ لڑکیاں دیوانہ وار لڑکوں کا پیچھا کرتی ہیں۔ اِس ضمن میں وِل ڈیوراں سے ایک اقتباس دلچسپی کا باعث ہوگا جو اُس نے ایک مجلّے "مرکری" کے حوالے سے دیا ہے:

"ایک نامعلوم شخص کو نازک حالت میں یہاں کے ہسپتال میں لایا گیا۔ اُس کے بدن پر زخموں کے متعدّد نشانات تھے۔ معلوم ہوا کہ تین لڑکیاں ہرلاک کے نواحی جنگل میں موٹر میں سوار جا رہی تھیں کہ انہوں نے ایک آدمی کو وہاں کام کرتے دیکھا۔ لڑکیوں نے اُسے دعوت دی کہ آؤ تمہیں سیر کرائیں۔ وہ اجل گرفتہ موٹر میں بیٹھ گیا۔ کچھ دور جا کر بقول اُس کے لڑکیوں نے گاڑی کھڑی کی اور اُس سے جنسی ملاپ کی خواہش کی۔ ایک لڑکی اُس شخص کی کوتاہ ہمتی پر غضبناک ہو گئی اور اُس کے گریباں گیر ہوئی۔ اُس کی سہیلیاں بھی اُس مرد پر ٹوٹ پڑیں اور اُسے دلبوچ لیا۔ ایک لڑکی نے اپنی ٹوپی کی سوئی سے اُسے بُری طرح گھائل کر دیا۔ اس کے بعد اُسے اِس حالتِ زبوں میں چھوڑ کر بھاگ گئیں۔"

لنڈسے کے خیال میں آزادانہ جنسی ملاپ نزاج کی طرح ناقابلِ عمل ہے کیوں کہ معاشرے کی بقا کے

---

[1] NECKING [2] PETTING [3] MANSIONS OF PHILOSOPHY

لیے کچھ نہ کچھ قوانین وضع کرنا ہی پڑتے ہیں۔ اس ضمن میں لنڈسے نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ نوجوان لڑکے لڑکیوں کو "آزمائشی شادی" کر لینا چاہیے یعنی وہ سال دو سال بغیر نکاح کے میاں بیوی کی طرح مل کر رہیں بشرطیکہ وہ ضبطِ تولید سے کام لیں گے۔ سال دو سال کے بعد اگر وہ محسوس کریں کہ وہ ایک دوسرے سے مستقلاً نبھا سکیں گے اور ان میں کامل جسمانی اور ذہنی موافقت پیدا ہو گئی ہے تو وہ نکاح کر لیں۔ کینسے نے "رفاقت کی شادی" کا مشورہ دیا ہے یعنی نوجوان لڑکا اور لڑکی مل کر رہیں اور انہیں ایک دوسرے کا رفیق کہا جائے۔ اس دوران میں اگر انہیں اپنی مرضی کا کوئی دوسرا نوجوان یا لڑکی مل جائے تو وہ جدا ہو کر اس سے نکاح کر سکتے ہیں۔ "رفاقت کی شادی" کا ایک فائدہ بقول کینسے یہ ہوگا کہ لڑکے لڑکی کو جنسی ملاپ کا تجربہ ہو جائے گا جس سے وہ آنے والی زندگی میں فائدہ اٹھا سکیں گے۔ برٹرنڈرسل نے اس نوع کی شادی کی حمایت کرتے ہوئے لکھا ہے [1]

> "میرے خیال میں تمام جنسی تعلقات جن سے بچے پیدا نہ ہوں، مرد عورت کا ذاتی معاملہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ بغیر نفسیاتی تجربہ حاصل کیے کسی مرد عورت کو شادی نہیں کرنا چاہیے۔ اس بات کی شہادت موجود ہے کہ پہلا جنسی تجربہ ایسے فریق کے ساتھ ہونا انسب ہے جو جنسی ملاپ کا تجربہ رکھتا ہو۔"

بعض عورتیں جو خود کماتی ہیں شادی نہیں کرتیں تاکہ وہ خود مختاری کی زندگی بسر کر سکیں لیکن اس کے ساتھ مامتا کا جذبہ بھی ستاتا رہتا ہے۔ اس مشکل کا حل یہ تجویز کیا گیا ہے کہ نکاح کے بغیر اولاد پیدا کی جائے۔ لنڈسے لکھتا ہے کہ ایک دن ایک لڑکی اس کے پاس آئی اور کہنے لگی "میں شوہر کو پسند نہیں کرتی اور شادی کے بغیر آزادانہ زندگی گذارنا چاہتی ہوں لیکن مجھے بچے کی خواہش دامن گیر رہتی ہے۔" کچھ مدت کے بعد وہ پھر لنڈسے کے یہاں آئی اور کہنے لگی "میں نے بڑی سوچ بچار کے بعد اپنے بچے کے باپ کا انتخاب کیا، وہ ایک نوجوان طالب علم ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں تم سے پیار نہیں کرتی نہ کسی مرد سے مجھے پیار ہو سکتا ہے لیکن میں بہر صورت ایک عورت ہوں اور مجھے بچہ پیدا کرنے کا

---

[1] MARRIAGE AND MORALS

حق حاصل ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اگر تم پسند کرو وہ بچہ تمہارا ہی ہو۔ اس پر ہم نے تبادلۂ خیالات کیا اور وہ میری بات مان گیا۔ میرے بچے کا باپ جانتا ہے کہ اب اُس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں رہا نہ میرا ہی اُس پر کوئی داعیہ ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ جو بچہ میری کوکھ میں ہے وہ میری رسوائی کے بغیر پیدا ہو جائے۔ آپ میری مدد کریں۔" جج لنڈسے نے اُس کی درخواست مان لی اور وہ 'رسوائی' کے بغیر ماں بن گئی۔ امریکہ کا ایک عالم نفسیات البرٹ ایلس کہتا ہے۔[1]

"عشق کے بغیر مقاربت کرنا کوئی سنگین جرم نہیں ہے بلکہ نہایت حظ بخش ہوتا ہے اور لاکھوں انسانوں کے لئے مسرت کا باعث ثابت ہو رہا ہے۔"

البرٹ ایلس نے نیویارک میں ایک ادارہ[2] قائم کر رکھا ہے۔ اُس کا نظریہ یہ ہے کہ "صحت مند بدکاری" شادی کے ادارے کی معاون ہوتی ہے۔ جو لوگ خاص قسم کی جنسی قدروں کو دوسری جنسی قدروں پر فوقیت دیتے ہیں وہ جنسی فاشسٹ ہیں۔ لنڈسے کہتا ہے کہ اب 'حرامی بچے' کا تصور بھی بدل گیا ہے۔ اُس کے خیال میں حرامی بچہ وہ ہے جو ایسے ماں باپ کے گھر میں پیدا ہو جو پوری طرح صحت مند نہیں ہیں جبکہ مغرب میں آج کل بے نکاحی ماؤں کو نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا اور 'ایک ماں ایک بچہ'، یا 'ایک باپ ایک بچہ'، کے کنبے کو ہر کہیں تسلیم کر لیا گیا ہے۔

امریکہ اور یورپ کے ممالک میں جابجا جنسی مشورہ خانے کھولے جا رہے ہیں جہاں نوجوان، لڑکوں، لڑکیوں، شوہروں اور بیویوں کو جنسی مشورے دیئے جاتے ہیں۔ اس نوع کا سب سے مشہور ادارہ امریکہ میں ڈاکٹر ولیم ماسٹرز اور مسز ورجینیا جانسن نے قائم کیا ہے۔[3] اس میں نوجوان لڑکے لڑکیوں، شوہروں اور بیویوں کو مقاربت کی تکنیک سکھائی جاتی ہے اور اُن کی راہنمائی کے لئے ادارے کی جانب سے لڑکے اور لڑکیاں بطور 'بدل'[4] کے پیش کئے جاتے ہیں۔ کنوارے، عشاق اور

---

[1] SEX WITHOUT GUILT

[2] INSTITUTE FOR RATIONAL LIVING

[3] TIME, MAY, 25, 1970.

[4] SURROGATES

شادی شدہ لوگ جوق در جوق مشورے کے لیے اِدھر کا رُخ کرتے ہیں۔ ماسٹرز اور ورجینیا کے خیال میں شادی شدہ زندگی اور تجرد کی تلخیاں اس لیے رُونما ہوتی ہیں کہ فریقین مقاربت کی تکنیک سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اِس ضمن میں ڈیوڈ ریوبن کی کتاب " جنس کے متعلق سب کچھ جو تم جاننا چاہتے ہو لیکن پوچھتے ہوئے ڈرتے ہو " اور مس جون گیریٹی کی تصنیف " گرم مزاج عورت " قابلِ ذکر ہیں۔ ڈیوڈ ریوبن کہتا ہے کہ سائنس کے اِس دوَر میں رہتے ہوئے بھی جنسی ملاپ سے متعلق ہمارا طرزِ عمل وہی ہے جو غاروں کے انسان کا تھا۔ اُس کے خیال میں جنسی ملاپ کی تکنیک میں سائنس کے جدید انکشافات کی روشنی میں ردّ و بدل کرنا ضروری ہے۔ مِس جون گیریٹی کی کتاب عورتوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ اُس نے عورتوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ مقاربت میں بھرپور حصّہ لیں کہ اُنہیں بھی اِس سے بوجہٗ احسن حظ اندوز ہونے کا حق حاصل ہے۔ یاد رہے کہ اِس سے بہت پہلے ڈاکٹر میری سٹوپس نے جنسی حظ اندوزی کو عورت کا پیدائشی حق قرار دیا تھا جس سے بقول اُن کے مرد نے اُسے صدیوں سے محروم کر رکھا ہے اور عورت اِس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی ہے کہ اُس کا کام تو صرف مرد کو محظوظ کرنا ہے۔

فرانسیسی عالمِ جنسیات رینے گویاں نے نئے جنسی میلانات کا تجزیہ کیا ہے اور حیاتیات اور تحلیلِ نفسی کی روشنی میں جنسی اخلاق کو ازِسرِنو مُرتّب کرنے کی دعوت دی ہے۔ وہ جنسی امُور میں نارمل اور ابنارمل کے فرق کا قائل نہیں ہے اور کہتا ہے کہ کوئی شخص کسی بھی طریقے سے جنسی خواہش کی تسکین کرے۔ وہ طریقہ نارمل ہو گا۔ اُس کے خیال میں نارمل کا تصوّر مختلف زمانوں میں بدلتا رہا ہے مثلاً آج کل کوئی بالغ مغربی عورت کسی غیر مرد سے خلوت میں جا کر یہ کہے کہ اُس نے گناہ کیا ہے اور اِس سے پشیمان ہو تو اُسے ابنارمل سمجھا جائے گا جب کہ آج سے پچاس برس پہلے کی عورت کا یہ احساس نارمل تھا۔ جن اعمال کو علمائے جنسیات نے کجرویاں کہا ہے، رینے گویاں اُنہیں بھی عین فطرتی مانتا ہے۔ وہ خود لذتی، سدومیت، اباحتِ نسواں، ایذا کوشی، ایذا طلبی وغیرہ کو عین طبعی سمجھتا ہے۔ اُس کا نظریّہ یہ ہے کہ جنسی ملاپ کے ساتھ یا اِس کے بغیر جنسی حظ کا حصول فطرتی ہے۔ یہ کہہ کر اُس نے قدمائے یونان کے مسلک حظ اندوزی کا احیاء کیا ہے۔ اُس کے خیال

کے مطابق حواسِ خمسہ کے علاوہ بھی ایک حس ہوتی ہے جسے وہ جنسی حس کہتا ہے۔ یہ حس خود مکتفی ہے اور اس کی تشفی لازم ہے۔ اُس کے بقول جنسی لذت کا حصول ہی مقصود بالذات ہے جب کہ بچوں کی پیدائش محض ضمنی اور فروعی ہوتی ہے۔ بچے پیدا کرنے کی نیت کے بغیر محض نفسانی حظ کے لیے مقاربت کرنا انسان کا فطری حق ہے۔ وہ اس بات میں فرائڈ سے اتفاق کرتا ہے کہ انسان نے تہذیب و تمدن کے نام پر جنسی حظ کو قربان کر دیا ہے اور نفسانی خواہش کے اظہار پر قدغن لگا کر مردوں اور عورتوں کو سچی مسرت سے محروم کر دیا ہے۔ اُس کے خیال میں فرد کا جنسی حظ پانا اصل چیز ہے خواہ فریقِ ثانی حظ اندوز ہو یا نہ ہو۔ اس طرح وہ فریقِ ثانی کو محض ایک 'شے' مانتا ہے۔ جنسی حس اپنی تسکین چاہتی ہے۔ اُسے 'شے' میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ فرائڈ نے قدماء کی جنسی زندگی اور معاصرین کی جنسی زندگی میں فرق کرتے ہوئے لکھا ہے[1]

> "قدماء کی جنسی زندگی اور ہماری جنسی زندگی میں سب سے نمایاں فرق یہ ہے کہ قدماء جبلت کو اہم سمجھتے تھے جب کہ ہم فریقِ ثانی کو اہمیت دیتے ہیں۔ قدما جنسی جبلت کے گن گاتے تھے اور اسی کے طفیل وہ ایک ادنٰے فریقِ ثانی کی بھی عزت کرتے تھے جب کہ ہم جنسی ملاپ کو فی نفسہٖ قابلِ نفرت سمجھتے ہیں اور اس کی عذر خواہی فریقِ ثانی کی خوبیوں میں تلاش کرتے ہیں۔"

ریئنے گویاں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور فریقِ ثانی کی شخصیت اور احساس سے بھی انکار کر دیا۔ وہ عشق و محبت کا بھی منکر ہے اور کہتا ہے کہ عشق ہمیشہ نفسانی خواہش کی آسودگی ہی ہوتی ہے اس کا ثبوت وہ یہ دیتا ہے کہ کسی عورت سے وصال ہو جانے کے بعد اُس کے ساتھ عشق بھی ختم ہو جاتا ہے۔ ریئنے گویاں جس نئے جنسی اخلاق کا داعی ہے اُس میں اگر کوئی گناہ ہے تو یہی ہے کہ کسی مرد یا کسی عورت کے جنسی حظ کے حصول پر کسی قسم کی کوئی پابندی لگا دی جائے۔ وہ کہتا ہے کہ مسیحی آباء نے جنسی ملاپ کے ساتھ گناہ کا احساس وابستہ کر کے انسانی مسرت کا سرچشمہ مسموم کر دیا ہے۔

---

[1] THREE ESSAYS ON THEORY OF SEXUALITY

اُس کے خیال میں جنسی ملاپ کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ جائز قسم کی تفریح ہے۔ ریئنے گویا ایک ایسے مثالی معاشرے کے قیام کا خواہاں ہے جس میں شہوانی خواہش کی ورزش و تکمیل پر کوئی قدغن نہیں ہوگی۔ اُس کے خیال میں اِس معاشرے کے افراد سچی خوشی سے بہرہ ور ہوں گے۔ وہ کہتا ہے کہ جب تک جنسی اخلاق کو مذہب اور مذہبی اخلاق سے الگ کرکے نئے سِرے سے علمی بُنیادوں پر مُرتب نہیں کیا جائے گا ہمیں شخصی اور اجتماعی اُلجھنوں سے نجات نہیں مِل سکے گی۔

جنسی آزادی نے نسوانی لباس کو بھی متاثر کیا ہے۔ عورتیں نیم عُریاں لباس پہننے لگی ہیں۔ وکٹوریہ کے عہد میں ٹخنوں کا دکھانا بھی معیوب تھا۔ اب سکرٹ گھٹتے گھٹتے برگِ انجیر بن کر رہ گئی ہے اور چھاتیوں کو برہنہ رکھنے کا رواج بھی چل نکلا ہے جیسا کہ قدیم ہندوستان، کریٹ اور نشاۃ الثانیہ کے عہد کے فرانس اور اطالیہ میں تھا جب عورتیں رخساروں کے ساتھ برہنہ چھاتیوں پر بھی غازہ لگاتی تھیں کبھی زمانے میں لباس کی تراش خراش سے بدن کے نقائص چھپائے جاتے تھے اب ایسا لباس پہنا جاتا ہے جس سے گدرائے ہوئے بدن کی لطافتیں نکھر کر سامنے آجائیں اور جسم کے دلآویز زاویوں کی زیادہ سے زیادہ نمائش کی جاسکے۔ لباس کے یہ فیشن ایشیا اور افریقہ میں بھی رواج پا رہے ہیں۔ جاپان، تھائی لینڈ، فلپائن، مصر، لبنان وغیرہ میں عورتیں آزادانہ مغربی وضع کا نیم عُریاں لباس پہنتی ہیں جن اقوام میں قدامت پسندی کے اثرات باقی ہیں اُن میں بھی عورتیں ایسا تنگ لباس پہننے لگی ہیں کہ جوبن کا جھکڑا پوری طرح نمایاں ہو جاتا ہے۔ اِشتہار باز اور فلم ساز عورت کے جسم کی عُریانی کا استحصال کر رہے ہیں۔ اِشتہار سگرٹ کا ہو یا سکوٹر کا، صابن کا ہو یا چاکولیٹ کا، اِس میں جاذبیت پیدا کرنے کے لئے نیم عُریاں نسوانی جسم کا سہارا لیا جاتا ہے۔ نازک اندام، سیم تن لڑکیوں کو فلموں میں عُریاں حالت میں دکھایا جاتا ہے۔ لوگ ہوسِ دید کی تسکین کے لئے ایسی فلموں پر ٹوٹ پڑتے ہیں جین مینسفیلڈ، برجِت باردو، جینا لولو برجائیڈ، راکوئل ویلش کے پروانوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہے۔ امریکہ اور یورپ میں ایسی فلمیں بھی بننے لگی ہیں جن میں برگِ انجیر کو بھی اُتار پھینکا گیا ہے۔ اِن میں عورتیں مرد بھی لباس میں دکھائی دیتے ہیں۔ امریکی تمثیل 'اوہ کلکوتا' میں مادر زاد برہنہ عورتوں مردوں کو رقص کرتے

ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اِس نوع کی تمثیلوں اور فلموں پر پابندی لگانا بدذوقی خیال کیا جاتا ہے۔ اِس عُریانی نے عورت کی جنسی کشش کو مجروح کیا ہے کہ اِس کا راز ترغیب نامعلوم میں ہوتا ہے۔ اِناطول فرانس[1] کے بقول لباس نے عورت میں بے پناہ کشش پیدا کی تھی۔ ایک ناول میں اُس نے دکھایا ہے کہ عورتوں کے پہلی مرتبہ لباس پہن کر نمودار ہونے کے نتائج کیسے انقلاب آور ہوئے تھے۔

جنسی آزادی نے قحبگی کو بھی متاثر کیا ہے۔ اب کسبیوں کو نئے نئے[2] نام دیئے گئے ہیں۔ تجارتی اداروں میں کاروبار کو فروغ دینے کے لئے اِن سے کام لیا جاتا ہے۔ جب کسی گاہک سے کوئی بڑا معاملہ کرنا ہو تو حسین لڑکیاں تمام مشکلات کو حل کر دیتی ہیں۔ یہ خوش جمال، پری مثال لڑکیاں اپنے آقاؤں کی تسکین ہوس بھی کرتی ہیں اور گاہکوں کے ذوق کی آسودگی کا فرض بھی انجام دیتی ہیں۔ بعض ممالک میں قحبہ خانوں کا انتظام مملکت نے سنبھال لیا ہے۔ مثال کے بطور جرمن کے شہر ہامبرگ میں کسبیوں کو صاف ستھرے ماحول میں رکھا جاتا ہے[3]۔ اِن کا باقاعدگی سے طبّی معائنہ کرایا جاتا ہے۔ سب کسبیاں ایک ہی جگہ مل بیٹھ کر کھانا کھاتی ہیں، اُن کے کپڑوں کی دُھلائی، کھانے وغیرہ کا خرچ آٹھ شلنگ روزانہ وصول کیا جاتا ہے۔ اِس طرح لوگ بیمار، آتشک زدہ کوچہ گرد کسبیوں سے بچ گئے ہیں اور کسبیاں غنڈوں اور بھڑووں کے چنگل سے آزاد ہو گئی ہیں۔

آخر میں ہم دو کتابوں کا ذکر کریں گے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہیں اور جن سے مغربی معاشرے کے جدید ترین رُجحانات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ پہلی کتاب ونس پیکارڈ[4] کی ہے۔ اِس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ آج کل مرد عورت کے تعلق میں جو تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں وہ معاشی، سیاسی، تعلیمی اور تہذیبی تبدیلیوں ہی کا ایک حصّہ سمجھی جا سکتی ہیں۔ اُس کے خیال میں عصرِ جدید کے جنسی انقلاب کو جنسی خلفشار کہنا زیادہ موزوں ہوگا کیوں کہ انقلاب کی ایک خاص جہت مُعیّن ہوتی ہے جب کہ جنسی

---

[1] PANGUIN ISLAND

[2] CALL GIRL RECEPTIONST MODEL GIRL

[3] اِن کی گلی کو REPERBAHN کہتے ہیں۔ [4] SEXUAL WILDERNESS

آزادی بغیر کسی جہت کے ہر طرف پھیل رہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تاریخِ عالم میں پہلی بار مانعِ حمل ادویات اور وسائل نے جنسی ملاپ کو تولید و تناسل سے علاحدہ کر دیا ہے اور عورتیں حمل کے خوف سے آزاد ہو کر جنسی ملاپ سے پوری طرح حظ اندوز ہونے لگی ہیں۔ جراحی کے عمل سے بھی ضبطِ تولید کا رواج عام ہو گیا ہے۔ بعض عورتیں فمِ رحم کا اپریشن کرا دیتی ہیں جس سے استقرارِ نطفہ کا خدشہ ہمیشہ کے لئے دور ہو جاتا ہے۔ طلبہ اور طالبات درس گاہوں میں مطالبہ کر رہے ہیں کہ انہیں مانعِ حمل حبوب مہیّا کی جائیں تاکہ وہ شادی سے قبل جنسی تعلقات کے تجربے کر سکیں۔ 'پلے بوائے' جیسے رسائل میں نوجوانوں کو جنسی آزادہ روی کی تلقین کی جا رہی ہے۔ واعظین سے کہا جا رہا ہے کہ وہ اتوار کے مذہبی خطبات میں گناہ کا لفظ مُنہ سے نہ نکالا کریں کہ اِس سے نوجوانوں میں گناہ کی اُلجھن پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے اور اُن کے فتورِ ذہن میں مبتلا ہو جانے کا امکان ہے۔ نوجوانوں کو عبادات میں شامل ہونے کی ترغیب دلانے کے لئے گرجا گھروں میں راک اینڈ رول ناچوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ وینس پیکارڈ کہتی ہے کہ منکوحہ عورتوں کے ملازمت کرنے سے مرد عورت کے تعلقات میں دُور رس تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں اور عورت مرد کی معاشی غُلامی سے آزاد ہوتی جا رہی ہے۔ عورتوں نے ایسے کام بھی سنبھال لئے ہیں جو مردوں سے خاص سمجھے جاتے تھے مثلاً فِن لینڈ میں دندان ساز اور قصاب اکثر و بیشتر عورتیں ہی ہیں۔ نئی عورت مرد سے جنسی ملاپ میں زیادہ توانائی اور قوّتِ رجولیت کا مطالبہ کرنے لگی ہے اور بھرپور جنسی توانائی کی متمنّی ہوتی ہے۔ وہ کوتاہ ہمت مرد پر برملا تعریض کرتی ہے۔ نتیجتہً مرد عورتوں سے خوف کھانے لگے ہیں اور اُن کے بڑھتے ہوئے جنسی مطالبات سے خائف ہو کر ہم جنسیت کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ اضلاعِ متحدہ امریکہ میں عورتیں مردوں پر حاوی ہوتی جا رہی ہیں اور مردوں میں زنانہ پن آ رہا ہے چنانچہ وہاں کے مرد بھی عورتوں کی طرح عطریات کا استعمال کرتے ہیں، سر کے بال بڑھا کر زلفیں بناتے ہیں، غازے، کریم اور لپ سٹک کا استعمال کرتے ہیں، سر کے بالوں کا رنگ بدلواتے ہیں اور شوخ رنگ کے لال پیلے کپڑے پہنتے ہیں۔ ناروے، سویڈن اور ڈنمارک میں نئے جنسی میلانات زیادہ واضح شکل و صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ سویڈن میں جنسی ملاپ کی

عام آزادی ہے اور شادی کی روایتی صورت بہت کچھ بدل گئی ہے۔ 'ایک بچہ ایک ماں' یا 'ایک بچہ ایک باپ' کے کنبوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے کیوں کہ میاں بیوی شادی کے بعد جلدی ہی ایک دوسرے سے اُکتا کر الگ ہو جاتے ہیں۔ سٹاک ہوم یونیورسٹی کے ایک عالم عمرانیات گنار بولٹ کہتے ہیں کہ حیاتیاتی پہلو سے عورتوں کو بچے پیدا کرنے کی ضرورت شوہر رکھنے کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہے۔ فلموں میں جنسی ملاپ، خود لذتی اور لزبائی اختلاط کے مناظر دکھائے جاتے ہیں۔ سویڈن کی ایک فلم "میں متجسس ہوں" میں کرداروں کو اعلانیہ جنسی ملاپ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اوسلو کے باغ میں چھپن فٹ اونچا دیو قامت لنگ نصب کیا گیا ہے جس کے چاروں طرف برہنہ عورتوں کے نقوش کندہ کیے گئے ہیں۔ سٹاک ہوم میں نوجوان لڑکے لڑکیاں[1] شام کے وقت کنگز گارڈن پارک میں اکٹھے ہوتے ہیں اور قریب کے جنگل میں جا کر ایک دوسرے سے تمتع کرتے ہیں۔ ونیس پیکارڈ کہتی ہے کہ اس جنسی آزادی کے تین نتائج برآمد ہوئے ہیں ـــــ (۱) ملک بھر کے بچوں کی ½ تعداد صرف ماں یا صرف باپ کے پاس رہتی ہے۔ ـــــ (۲) سوزاک اور آتشک کے امراض ہر کہیں پھیل گئے ہیں۔ ـــــ (۳) طلاقوں کی تعداد دنیا بھر کے ممالک میں سب سے زیادہ ہے۔

دوسری کتاب[2] امریکہ میں تحریکِ آزادیٔ نسواں کی راہنما خواتین کے مقالات پر مشتمل ہے جسے ووین گارنک اور باربرا موران نے مرتب کیا ہے۔ ان مقالات میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ ان خواتین کے خیال میں تحریکِ آزادیٔ نسواں کو سب سے زیادہ نقصان جنسیت[3] نے پہنچایا ہے۔ اُن کے ہاں اس ترکیب سے مراد محض یہ نہیں ہے کہ معاشرے میں ایک جنس کو دوسری جنس پر برتری حاصل ہے بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ مرد کے ذاتی حظِ نفس ہی کو مقصود بالذات سمجھ لیا گیا ہے اور جنسی ملاپ کو مرد کی حظ اندوزی اور بچے پیدا کرنے کے لیے وقف کر دیا گیا ہے۔ اس نوع کے معاشرے میں مرد اس حقیقت کو فراموش کر دیتا ہے کہ اس کی لذت طلبی یا بچوں کی پیدائش کے ساتھ عورت کو

---

[1] انہیں RAGGARE کہتے ہیں [2] WOMAN IN SEXIST SOCIETY

[3] SEXISM

بھی جنسی ملاپ کے ساتھ یا اِس کے بغیر حظ اندوزی کا حق حاصل ہے ۔ وہ کہتی ہے کہ خواتین کی حصولِ آزادی کی کشمکش اُس ہمہ گیر جدّ و جُہد کا ایک حصہ ہے جو استحصال کرنے والے چند مقتدر گروہوں کے خلاف محنت کش اور سیاہ فام امریکی کر رہے ہیں ۔ انہیں شکایت ہے کہ عورت کو بار بار یاد دلایا جاتا ہے کہ اُس میں قوتِ ارادی اور پیش رفت کا فقدان ہے اِس لئے وہ عقلیت پسند نہیں ہوتی نہ غیر معمولی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہوتی ہے چنانچہ اُسے مرد سے مختلف قِسم کی کوئی مخلوق سمجھا جاتا ہے جو بُنیادی طور پہ طفلانہ طبع اور خفیف الحرکات ہے ۔ اُن کا استدلال یہ ہے کہ جنسیت[1] زدہ معاشرہ پدری نظام پر مبنی ہے جس میں عورت کو مہم جُوئی، مشکل پسندی اور حوصلہ مندی سے عاری سمجھا جاتا ہے ۔ اس معاشرے میں جو قوانین مُروّج ہیں وہ مردوں کے بنائے ہوئے ہیں، موجودہ اخلاقی قدریں مردوں کی عائد کی ہوئی ہیں مثلاً مرد نے عورت کو غچہ دینے کے لئے عورت کے حُسن و جمال کا ڈھونگ رچا رکھا ہے ۔ اُونا سٹینارڈ کہتی ہیں کہ مرد عورت کے حُسن و جمال کا جو راگ الاپتا رہا ہے وہ محض اُس کی اپنی ہوس پرستی کی تخلیق ہے ۔ عورت کو حسین و جمیل اس لئے کہا جاتا ہے تاکہ وہ ہمیشہ اپنی آرائش و زیبائش میں جُتی رہے اور اپنے حقوق سے غافل ہو جائے ۔ عورتیں مرد کے اِس دامِ فریب میں پھنس گئی ہیں اور انہوں نے اپنے اصل مقام کو فراموش کر دیا ہے ۔ اونا سٹینارڈ کہتی ہیں کہ تمام پرندوں اور چوپایوں میں نر مادہ سے زیادہ خوبصورت ہوتا ہے اور زیادہ خوش آواز بھی ہوتا ہے اِس کلیئے کی رُو سے مرد عورت سے زیادہ خوبصورت ہے لیکن عورت کو اپنی ہوس کا کھلونا بنا کر رکھنے کے لئے مرد نے اُسے حُسن و جمال کا پیکر قرار دے دیا ہے اور عورت بھی اِس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی ہے کہ میں مرد سے زیادہ خوبصورت ہوں چنانچہ عورتوں کو زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اشتہاروں، فلموں، نگار خانوں اور شبانہ مجالس میں اپنے جسم کی نمائش کرنا پڑتی ہے ۔ خواہ کوئی لڑکی کتنی ہی ذہین و دراکّ ہو اُسے اپنے آپ کو حسین اور پُرکشش ثابت کرنے کے لئے کاوش کرنا پڑتی ہے کیوں کہ مرد یہی کچھ چاہتا ہے ۔ چنانچہ عورتوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت کو بھی زیبائش اور ہار سنگھار پر قربان کر دیا

---

[1] SEXIST SOCIETY

ہے اور وہ کوئی اعلیٰ کارنامہ انجام نہیں دے سکیں۔ مرد ذہین اور سنجیدہ لڑکیوں سے دُور بھاگتے ہیں کہ اِس سے اُن کے احساسِ برتری کو ٹھیس لگتی ہے۔ فہمیدہ لڑکیاں ڈر کے مارے اپنی ذہانت کا برملا اظہار نہیں کرتیں اور جان بوجھ کر احمقانہ حرکتیں کرتی ہیں تاکہ مردوں کو اپنی جانب متوجہ کر سکیں۔ اگر کسی لڑکی کو راکویل ویلش اور میریا گوپرٹ میئر (اِس خاتون نے ۱۹۶۳ء میں طبیعیات میں نوبل انعام جیتا تھا) میں انتخاب کرنا ہو تو وہ راکویل ویلش بننا پسند کرے گی۔ یہ نتیجہ ہے اُن غلط قدروں کا جو مردوں نے پدری معاشرے میں قائم کر رکھی ہیں۔ عورت کو نزاکت اور لطافت کا مجسّمہ کہہ کر اُسے فریب دیا جا رہا ہے۔ فرائڈ اور اُس کے متبعین کہتے ہیں کہ عورت فطرتاً ایذا طلب ہے۔ یہ کہہ کر وہ اُن مظالم کا جواز پیش کرتے ہیں جو مرد صدیوں سے عورت پر کر رہا ہے۔ بعض علمائے تحلیلِ نفسی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ عورت مرد کے ہاتھوں پٹ کر خوشی محسوس کرتی ہے۔ جس عورت کو اُس کا شوہر کبھی کبھار دھول دھپا نہ کرے وہ سمجھنے لگتی ہے کہ اب وہ اُس سے پیار نہیں کرتا۔ مرد کے بزعمِ غلط احساسِ برتری کا ایک کرشمہ یہ ہے کہ وہ عورت کو فلسفیانہ تعمق اور فن کارانہ تخلیق کے نااہل سمجھتا ہے مرد کہتا ہے کہ عورت رحم ہی سے تخلیق کر سکتی ہے، دماغ سے تخلیق کرنے سے قاصر ہے۔ عورت کی تخلیقی صلاحیتیں تمام تر بچوں کی پیدائش پر صرف ہو جاتی ہیں چنانچہ جارج ایلیٹ، جارج سانڈ وغیرہ خواتین جو ادبیات میں نامور ہوئی ہیں اُن سے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مردانہ قسم کی عورتیں تھیں اُن کے جنسی نظام میں گڑبڑ تھی[1] اور وہ کج رو تھیں۔ تخلیق ادب و فن پر صرف مرد ہی قدرت رکھتا ہے

ایلکس شلمان لکھتی ہیں کہ علمائے جنسیات و تحلیلِ نفسی کا یہ ادعا سراسر غلط ہے کہ نفسانی حظ کا اصل مرکز فرج ہے۔ اُن کے خیال میں بظر عورت کے لئے جنسی حظ اندوزی کا اہم مرکز ہے۔ وہ فرائڈ کے اِس خیال کو بھی رد کر دیتی ہیں کہ اوائلِ شباب میں بظر حظِ نفسانی کا مرکز ہوتا ہے لیکن جنسی ملاپ کے بعد حظِ نفس فرج میں منتقل ہو جاتا ہے لہٰذا جو عورت بدستور بظر سے محظوظ ہونے پر اصرار کرتی ہے وہ نفسیاتی لحاظ سے کج رو ہے۔ ایلکس شلمان کہتی ہیں کہ مردوں کی اِس نوع کی موشگافیاں

---

[1] اِسے OVARIAN THEORY OF LITERATURE کہتے ہیں۔

مغالطہ آفریں ہیں۔ عورت بجا طور پر جانتی ہے کہ جنسی حظ کا نقطۂ عروج[1] ایک ہی ہوتا ہے، اُسے تین مراحل میں تقسیم کرنا محض سفسطہ ہے۔ وہ ماسٹرز جانسن سے حوالہ دے کر کہتی ہیں کہ ان کی تحقیق سے صاف عیاں ہے کہ اکثر عورتوں کے لئے جنسی حظ کا حصول بظر ہی سے ہوتا ہے۔ سیمون دبوا نے کہا ہے۔

" عورت کامل آزادی حاصل کر کے ہی مرد کی غلامی سے نجات پا سکتی ہے۔"

یہ کامل آزادی بقول ایلکس شلمان ہم جنسی عورتوں[2] ہی کو میسّر آ سکتی ہے چنانچہ یہ دیکھ کر تعجب نہیں ہوتا کہ امریکہ اور یورپ میں تحریک آزادیٔ نسواں کی سرخیل اکثر و بیشتر ہم جنسی خواتین ہی ہیں ایلکس شلمان اور اُن کی ہم نوا خواتین کے اِس استدلال کے خلاف مردوں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ تحریک آزادیٔ نسواں مردوں کے خلاف لزبائی سازش ہے جو کامیاب ہو گئی تو معاشرۂ انسانی کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔ اِن خیالات کی اشاعت کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اضلاع متحدہ امریکہ اور اکثر مغربی ممالک میں نازک اندام، دھان پان، شرمیلی، بودی سے بس دوشیزہ غائب ہو گئی ہے اور اُس کی جگہ جارحیت پسند، دلیر اور با اعتماد لڑکی نے لے لی ہے۔

محوّلہ بالا نئے جنسی رجحانات اضلاع متحدہ امریکہ اور یورپ کے ممالک میں صورت پذیر ہوئے ہیں۔ اشتراکی ممالک میں لوگ زیادہ صاف ستھری اور صحت مند جنسی زندگی گذار رہے ہیں بے شک اُن کے ہاں بھی جنس روایتی اخلاق کی بندشوں سے آزاد ہو گئی ہے لیکن اُن میں شادی اور کُنبے کا تقدّس برقرار ہے۔ شادی رجسٹر میں نام لکھوانے سے ہو جاتی ہے اور طلاق کے لئے بھی رجسٹرار کو اطلاع دینا کافی ہوتا ہے۔ اِس کے باوجود امریکہ اور یورپ کے ممالک کی بہ نسبت اشتراکی ممالک میں طلاقوں کی تعداد کم ہے۔ اشتراکی ممالک میں عورت کو محض ایک شے نہیں سمجھا جاتا جس کا واحد مصرف جنسی حظ کا سامان بہم پہنچانا ہے بلکہ اُسے مرد کے مساوی ذی شعور ذی احساس

---

[1] ORGASM

[2] LESBIAN

فرد تسلیم کر لیا گیا ہے۔ کارل مارکس نے کہا ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشرے میں ہوس زر کے باعث عورت مرد کے لئے جنس فروختنی بن کر رہ جاتی ہے جسے مرد دوسری اجناس کی طرح کسی نہ کسی قیمت پر خرید لیتا ہے چنانچہ عورت کی شخصیت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ مارکس نے اسے "انسانی علائق کی معروضیت"[1] کا نام دیا ہے۔ روس اور چین میں مرد عورت کے مرتبے کی تفریق مٹادی گئی ہے، قانوناً عورت کو مرد کا ہمسر تسلیم کر لیا گیا ہے اور اس پر ہر قسم کی ملازمت کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں۔ سوویٹ روس کے ایک دانش ور ڈاکٹر سیمی نوف نے لکھا ہے[2]

"اب جب کہ نیا انسان اُبھر رہا ہے اس بات کی ضرورت ہے کہ عورت سے متعلق قدیم نظریہ ترک کر دیا جائے اور اُسے پرولتاری مملکت کا پورا رکن اور ساتھی تسلیم کر لیا جائے۔"

جیسا کہ ہم تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں، آزادی کا مفہوم مغربی عورت نے یہ لیا ہے کہ وہ جنسی ملاپ کرنے میں آزاد ہے۔ اشتراکی ممالک میں عورت کو آزاد کر کے اُسے معاشرتی ذمے داریاں سونپ دی گئی ہیں۔ وہ مردوں کے دوش بدوش کارخانوں، کھیتوں، سائنس کی تجربہ گاہوں اور کارخانوں میں محنت کرتی ہے۔ روس اور چین میں پچھتر سے اسّی فیصد ڈاکٹر اور چالیس سے پچاس فیصد انجینئر عورتیں ہیں۔ اشتراکی عورت کام میں اس قدر مصروف رہتی ہے کہ وہ مغربی عورت کی طرح بیزاری اور اُکتاہٹ کی شکار نہیں ہوتی نہ اِن کا مداوا کرنے کے لئے اُسے عیش کوشی کا دامن تھامنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مغربی عورت نے مساوات کا مطلب یہ لیا ہے کہ وہ مرد ہی کی طرح ہر قسم کی جنسی بے راہ روی کا حق رکھتی ہے۔ اشتراکی اقوام میں مساوات نے عورت کو مرد ہی کی طرح کے علمی اور عملی کارنامے انجام دینے کی تحریک و تشویق کی ہے۔

---

[1] OBJECTIFICATION OF HUMAN RELATIONS

[2] BIOLOGICAL TRAGEDY OF WOMAN

اِصطلاحات

ADOLESCENCE	نوخیزی
ADOLESCENT	نوخیز
AMBIVALENT	دورُخہ
APHRODISIAC	مُبہی
AUTO-EROTICISM	خودلذّتی
BAWD	چھنّال
BESTIALITY	حیوانیت
BI-SEXUAL	دوجنسی
BOHEMIAN	قلندر
BROTHEL	قحبہ خانہ
CASTRATION COMPLEX	ختنے کی اُلجھن
CASTRATO	ہیجڑے
CHASTE LOVE	عشقِ عذری
CHASTITY GIRDLE	عصمت کی پیٹی
CHIVALRY	فتوّت ، فروسیت
CLIMACTERIUM	کہولت (مردانہ)
CLITRODECTOMY	قطعِ بظر
CLITORIS	بظر ، زنبور
COCOTTE	قحبہ
CONCUBINE	کنیزِ مدخولہ
COPROLALIA	فحش گوئی
CUNNILINCTUS	دہن کاری
DAVID`S RECIPE	نسخۂ داؤدی
DEFLOWERING	ازالۂ بکارت
DEMI-MONDE	عصمت باختہ
EFFEMINATE	زنانہ مرد
EJACULATION	اِنزال
EONISM	الوانیّت
EROGENOUS ZONES	نفس پرور اعضاء
EROTIC	شہوانی
EROTOMANIA	جنس زدگی
EROTOGRAPHOMANIA	ہوس نگاری
EXHIBITION	نمائشیت
EXOTIC	غرابت آمیز

FANCY-MAN	خانہ آشنا	LIBIDO	کام ، لوبھ
FELLATIO	اُپارشتک ، لقمہ خوری	MAIDENHOOD	بکارت
FETICHISM	جنسی علامت پرستی	MOTIF	علامتی محرّک
FLAGELLATION	بید زنی	MASTURBATION	جلق
FOREPLAY	ملاعبت	MASTURBATORY PHANTASY	جلقی خیال آرائی
FRIGIDITY	سرد مہری	MASOCHISM	ایذا طلبی
GIGOLETTE	نوخیز داشتہ	MALE PROSTITUTE	کاسب
GIGOLO	نوجوان کاسب	MENOFAUSE	کہولت (نسوانی)
GOVERNESS	کٹنی ، نائکہ	MISOGYNY	عورت دشمنی
GRISETTE	نوچی	NARCISSISM	نرگسیّت
GUILT-FEELING	اِحساسِ جرم	NECKING	گردن آویزی
HARLOT	بیسوا	NOCTURNAL EMISSION	اِحتلام
HERMAPHRODITE	عورت مرد	NYMPHOMANIAC	جنسی چڑیل
HEDONE	مسلکِ حظ اندوزی	OLISBOS; BANBON	اپا دروپا
HOMOSEXUALITY	ہم جنسیّت	ORGASAM	غایتِ حظِ نفسانی
HYMEN	پردۂ بکارت	OVER-SEXED	مغلوب الشہوت
INCEST	اِباحت	PAGANS	بُت پرست قدماء
INITIATION CEREMONIES	رسومِ بلوغت	PERIODS	ایام
KLEPTOMANIA	لذّتِ سرقہ	PETTING	ہتھ پھیری
KNIGHT	فتی ، جواں مرد	PHALLUS	لِنگ
LESBIAN	لزبائی	PIMP	دلال

PLATONIC LOVE	عشقِ ہم جنسی	SEXUAL DEGENERATE	جنسی پاپی
PONCE	غنڈۂ آشنا	SEXUAL DEVIATION	جنسی انحراف
PORNOGRAPHY	فحش نگاری	SEXUAL PERVERSION	جنسی کجروی
PORNOTOPIA	عالمِ شہوات	SEXUAL SLAVERY	جنسی غلامی
POSTURE	آسن	SINGING GIRL	کنچنی
PREMATURE EJACULATION	سُرعتِ انزال	SLUT	کسبی
PROCURER	بھڑوا	SODOMY	سدومیت
PROSTITUTE	طوائف	SOUTENEUR	قرمساق
PROSTITUTION	قحبگی	SPIRITUAL LOVE	عشقِ حقیقی
PUBERTY	بلوغت	STREET WALKER	گشتی
PYGMALIANISM	عشقِ بُتاں	STRIP-TEASE	لباس اُتار رقص
QUIESCENT	خُفتہ	TOUT	کُٹنا
RETENTIVE	مُمسک	TOURNAMENT	دوران
SADISM	ایذاکوشی	TRIBADIC UNION	چپٹ بازی
SAPPHIC UNION	مساحقہ	TROBADOUR	طرآب
SATYR	جنسی سعفریت	TROLLOP	رنڈی
SHUNIMATISM	اعادۂ شباب	UNDER-SEXED	کوتاہ ہمت
SELF-MANIPULATION	خودکاری	UTERUS	رحم
SEXOLOGIST	عالمِ جنسیات	VAGINA فرج VIRAGO	مردانہ عورت
SEXOLOGY	جنسیات	VIRGINAL ANXIETY	تشویشِ باکرہ
SEXUAL CONGRESS	مقاربت، مباشرت	VOYEURISM	ہوسِ دید
VULVA یونی WHITE SLAVERY	سفید غلامی	WHORE	ٹکھئی

کتابیات

۱۔ الف لیلہ و لیلہ

۲۔ کتاب الہند ، البیرونی

۳۔ وقائع اسد بیگ

۴۔ تاریخ صحف سماوی ، نواب علی

۵۔ دبستان مذاہب ، محسن فانی

۶۔ تمدن ہند ، لی بان ۔ ترجمہ علی بلگرامی

۷۔ تاریخ اندلس ، ڈوزی ۔ ترجمہ عنایت اللہ دہلوی

۸۔ منتخب التواریخ ، عبدالقادر بدایونی

۹۔ مثنوی مولانا رُوم

۱۰۔ گلستان سعدی

۱۱۔ قابوس نامہ ، کیکاؤس

۱۲۔ مہا بھارت

۱۳۔ میراں کے گیت ، بجے کشن چودھری

۱۴۔ ستیارتھ پرکاش ، دیانند

۱۵۔ گیتا

۱۶۔ چھاندوگیہ ، اُپنشد

۱۷۔ برہادارنیاک ، اُپنشد

۱۸۔ حکایاتِ پنجاب ، آر، سی، ٹیمپل

۱۹۔ نزھۃ المشتاق ، ادریسی

۲۰۔ وفیاۃ الاعیان ، ابن خلکان ۔ ترجمہ ڈی سلین

۲۱۔ قانونِ اسلام ، جعفر شریف

۲۲۔ دربار اکبری ، آزاد

۲۳۔ سفرنامہ ، ابنِ بطوطہ

۲۴۔ بلوغ الارب ، محمود شکری آلوسی ۔ ترجمہ پیر محمد حسن

۲۵۔ البرامکہ ، عبدالرزاق کانپوری

۲۶۔ یاد ایام ، عبدالرزاق کانپوری

۲۷۔ دستور الوزراء ، خوندمیر

۲۸۔ تاریخ الدولتین ، جرجی زیدان

۲۹۔ ہزار بیشہ ، جمال زادہ

۳۰۔ تاریخ ممتاز

۳۰۔ پری خانہ ، واجد علی شاہ

۳۲۔ آرائشِ محفل ، شیر علی افسوس

۳۳۔ اُمراؤ جان ادا ، مرزا ہادی رسوا

۳۴۔ گذشتہ لکھنؤ ، شرر لکھنوی

B I B L I O G R A P H Y

ANDIARD, MICHEL,: PATTERNS OF SEX AND LOVE.

ASHBEE, H.S.: INDEX

BACHOFEN.: THE RIGHT OF THE MOTHER.

BEAUVOIR, DE-SIOMON.: THE SECOND SEX.

BERLINER, BERNARD.: PSYCHODYNAMICS OF MASOCHISM

BOCCACCIO.: DECAMERON.

BOTHONEE, PHYLLIS.: ALFRED ADLER.

BRIFFAULT, ROBERT.: MOTHERS.

BRIFFAULT, ROBERT.: SEX IN CIVILIZATIONS.

BROWN, FRED.: SEX QUESTIONS ANSWERS.

BURTON, RICHARD.: TERMINAL ESSAY.

CAPRICO, FRANK.S: THE SEXUALLY ADEQUATE MALE.

CASANOVA.: MEMOIRS.

CLEVELAND.: FANNY HILL.

DAVIS, MAXIME.: THE SEXUAL RESPOSIBILITY OF WOMEN

DEUTSH, HELEN.: THE PSYCHOLOGY OF WOMEN

DUBOIS, ABBE.: HINDU MANNERS, CUSTOMS AND CEREMONIES.

DURANT, WILL.:LIFE OF GREECE.

DURANT,WILL.:CAESAR AND CHRIST.

DURANT,WILL.:THE REFORMATION.

DURANT,WILL.:THE AGE OF REASON BEGINS.

DUREAUX,CAPTAIN.:VENUS IN INDIA.

ELLIS,HAVELOCK.:PSYCHOLOGY OF SEX.

FRAZER,J.G.:THE GOLDEN BOUGH.

FREUD,SIGMUND.:COLLECTED PAPERS VOL.2,4.

FREUD,SIGMUND.:THREE ESSAYS ON THEORY OF SEXUALITY.

FREUD,SIGMUND.:THE MOST PRAVELENT FORM OF DEGRADATION IN SEXUAL LIFE.

FORSYTH,DR.:PSYCHOLOGY AND RELIGION.

GARNICK,VIVIAN.:WOMAN IN SEXIST SOCIETY.

GARNICK,VIVIAN.:WOMAN IN SEXIST SOCIETY.

GARRITY,JOAN.:THE SENSUOUS WOMEN.

GUPTA DAMODAR.:NATNI MATAM.

HANNAY.:SEX SYMBOLISM IN RELIGION.

HARRIS,FRANK.:MY LIFE AND LOVES.

HENRIQUES,FERNANDO.:SOCIOLOGY OF SEX.

HENRIQUES,FERNANDO.:MODREN SEXUALITY.

HIRSEHFELD,MAGNUS.:SEXUAL ANOMALIES AND PERVERSION

HUXLEY ALDOUS.:FRANCIS AND GREGORY.

JOAD, C.E.M.: THE FUTURE OF MORALS.

JUNG .: TWO ESSAYS ON ANALYTICAL PSYCHOLOGY.

KIEFER, OTTO.: SEXUAL LIFE IN ANCIENT ROME.

KINSEY.: SEXUAL BEHAVIOUR IN THE HUMAN MALE.

KINSEY.: SEXUAL BEHAVIOUR IN THE HUMAN FEMALE.

LEAGUE OF NATIONS.: COMMISSION OF ENQUIRING INTO TRAFFIC IN WOMAN AND CHILDREN IN THE EAST.

LEWINSOHN, RICHARD.: A HISTORY OF SEXUAL CUSTOMS.

LICHT, HANS.: SEXUAL LIFE IN ANCIENT GREECE.

LILARD, SUZANNE.: ASPECTS OF LOVE IN WESTERN SOCIETY.

LINDSAY.: COMPASSIONATE. MARRIAGE.

MACPASTLAND, JAMES.: SEX IN OUR CHANGING WORLD.

MAL, KALYAN.: ANANGA RANGA.

MALRAUX.: MAN'S FATE.

MANTAGAZZA, PAOLO.: THE PERVERSIONS OF LOVE.

MARCUS, STEVENSON.: THE OTHER VICTORIANS.

MAUROIS, ANDRE.: ART OF LIVING.

MAYO, KATHERINE.: MOTHER INDIA.

MAYO, KATHERINE.: SLAVES OF GODS.

NAFZAVI, SHEIKH.: PERFUMED GARDEN.

NAVARRE, DE MARGUERITE.: HEPTAMERON.